الرّفيقُ الفصِيح
لمشکوٰۃ المَصَابِیح
جلد ۲
pasbanehaq
افادات
حضرت علامہ رفیق احمد صاحب قدس سرہٗ
شیخ الحدیث مفتاح العلوم جلال آباد
مرتب
محمد فاروق غفرلہٗ
ڈیزائننگ و کمپوزنگ
مجیب الرحمٰن قاسمی 7895786325

الرفیق الفصیح

لمشکوٰۃ المصابیح

جلد ۲

افادات

حضرت علاّمہ رفیق احمد صاحب قدس سرہٗ

شیخ الحدیث مفتاح العلوم جلال آباد

مرتب

محمد فاروق غفرلہٗ

خادم جامعہ محمودیہ علی پور ہاپوڑ روڈ میرٹھ (یوپی) ۲۴۵۲۰۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تفصیلات

نام کتاب.....الرفیق الفصیح لمشکوٰۃ المصابیح ج:۲

افادات..................... ....حضرت علامہ رفیق احمد صاحب قدس سرہٗ

مرتب.............. ....محمد فاروق غفرلہٗ خادم جامعہ محمودیہ میرٹھ

کمپوزنگ...........................مجیب الرحمٰن لکھیم پوری شعبہ کمپیوٹر جامعہ ہذا

سن اشاعت............. ....۱۴۳۲ھ مطابق ۲۰۱۱ء

صفحات..................... ....۴۶۶

قیمت

ناشر

مکتبہ محمودیہ

جامعہ محمودیہ علی پور ہاپوڑ روڈ میرٹھ (یوپی) ۲۴۵۲۰۶

فهرست

الرفیق الفصیح لمشکوة المصابیح

جلددوم

اجمالی فہرست

الرفیق الفصیح لمشکوۃ المصابیح

جلد دوم

فہرست

الرفیق الفصیح لحل مشکوۃ المصابیح

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
	باب الکبائر وعلامات النفاق	
	(الفصل الاول)	

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۴۰۲	**فائدہ**..	۴۵۳
۴۰۳	حدیث نمبر ﴿۶۸﴾ اچھے برے خیالات اور ان کا حکم..............	۴۵۳
۴۰۴	خیالات مشتبہ ہونے کے اسباب..............................	۴۵۵
۴۰۵	فائدہ: وعدہ اور وعید میں فرق..................................	۴۵۶
۴۰۶	حدیث نمبر ﴿۶۹﴾ مخلوق کے خالق اللہ تعالیٰ ہیں..................	۴۵۶
	(الفصل الثالث)	
۴۰۷	حدیث نمبر ﴿۷۰﴾ اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا؟..................	۴۵۹
۴۰۸	حدیث نمبر ﴿۷۱﴾ نماز کے دوران شیطان شبہ ڈالتا ہے..............	۴۶۱
۴۰۹	حدیث نمبر ﴿۷۲﴾ نماز میں وسوسہ کی فکر نہ کرنا چاہئے............	۴۶۳
۴۱۰	**تنبیہ**..	۴۶۵

تمت وبالفضل عمت

×—××—××—××—×

مکتبہ محمودیہ

جامعہ محمودیہ علی پور ہاپوڑ روڈ میرٹھ (یوپی) ۲۴۵۲۰۶

کتاب الایمان

رقم الحدیث:......۲؍ تا ۴۴؍

کتاب الایمان

تصحیح نیت کی حدیث کے بعد مصنف نے ان حدیثوں کو لانا چاہا جن کا تعلق ایمان سے ہے، چونکہ ایمان ہی ایسی شی ہے جو ازل ہی سے انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے جب انسان کو پیدا کیا تو ایمان بھی ودیعت کر دیا، یہ بنیادی شیء ہے ازلی اور ابدی شیء ہے انسان کے ہر وقت ساتھ رہتا ہے ازل ہی سے ساتھ ساتھ زندگی میں بھی ساتھ مرنے کے بعد بھی ساتھ قبر میں بھی ساتھ تو ایمان کو ایک بنیادی شان حاصل ہے، اور عمل تو معمولی سا زندگی کا حصہ ہے۔

ترتیب کتب پر ایک نظر

امور دینیہ کی پانچ قسمیں ہیں:

(۱)......اعتقادات۔جن کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۲)......عبادات۔

(۳)......معاملات۔

(۴)......مزاجر یعنی عقوبات۔

(۵)......آداب۔

ایمان کی بنیاد اور اس کے اصول یہ ہیں:

(۱)......الایمان باللہ۔ (۲)......الایمان برسلہ

(۳)......الایمان بکتبه. (۴)......الایمان بملائکته.

(۵)......الایمان بالیوم الآخر.

ایسے ہی عبادات بھی پانچ ہیں:

(۱)......نماز۔ (۲)......زکوۃ۔ (۳)......صوم۔

(۴)......الحج۔ (۵)......جہاد۔

معاملات بھی پانچ قسم کے ہیں۔

(۱)......مناکحات. (۲)......المعاوضات المالیة.

(۳)......المخاصمات. (۴)......الامانات. (۵)......الترکات.

مزاجر یعنی اسلامی سزاؤں کے اصول بھی حسب ذیل پانچ ہیں۔

(۱)......مزجرة قتل النفس. یعنی قصاص۔

(۲)......مزجرة اخذ المال. یعنی حد سرقہ۔

(۳)......مزجرة هتک العرض. یعنی حد قذف۔

(۴)......مزجرة هتک الستر. یعنی حد زنا۔

(۵)......مزجرة قطع بیضة الاسلام. یعنی حد ارتداد۔

آداب کے اصول یہ ہیں۔

(۱)......الاخــــــلاق! اس سے مراد اخلاق باطنہ ہیں۔ یعنی اپنے اندر صبر، شکر، قناعت، توکل، تفویض وغیرہ اچھی باتیں پیدا کرنا۔ حسد، کبر، حب دنیا۔ کینہ وغیرہ بری باتوں سے اپنے آپ کو پاک رکھنا۔

(۲)......الشیم الحسنة! یعنی اچھی عادتیں پیدا کرنا۔

(۳)......السیاسیات! یعنی ہر کام کو صحیح نظم اور تدبر سے کرنا۔

(۴)......المعاشرة! یعنی میل جول کے انداز اسلامی طرز کے رکھنا۔(البحر الرائق:۱/۷)

نماز عبادات میں سے سب سے افضل ہے۔اس کو عماد الدین کہا گیا ہے۔ بہت سی نصوص میں ایمان کے بعد نماز کا تذکرہ ہے۔مثلاً "یؤمنون بالغیب" کے بعد ارشاد فرمایا: "وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ" حدیث جبرئیل میں بھی شہادتین کے بعد نماز کا تذکرہ ہے۔حدیث

ذکر کیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ صوم ہر امیر وغریب پر فرض ہے۔حج ہر آدمی پر فرض نہیں ہے۔نیز روزہ ہر سال فرض ہے۔حج عمر میں ایک مرتبہ۔لہٰذا صوم اعم اوراشمل ہے۔بہ نسبت حج کے۔اس لئے اکثر حضرات نے "کتاب الصوم" کومقدم کیا ہے۔بہت سی روایات میں ارکان خمسہ کو بیان کرتے ہوئے صوم کو حج سے پہلے ذکر کیا ہے۔

کتاب کے لغوی اور اصطلاحی معنی

لغوی تعریف: کتاب کے لغوی معنی جمع کرنا۔یہ مادہ جہاں بھی مستعمل ہوگا اس کے اندر جمع کا معنی ضرور ملحوظ ہوگا،مثلاً لکھنے کو کتابت کہتے ہیں لکھنے میں **جمع النقوش** کا معنی پایا جاتا ہے۔لشکر کو عربی میں کتیبہ کہتے ہیں اسلئے کہ اس میں بھی کئی رجال جمع ہوتے ہیں۔

اصطلاحی تعریف: اصطلاح میں کتاب کہتے ہیں مسائل کے ایسے مجموعے کو جن کے مستقل ہونے کا اعتبار کیا جائے۔استقلال سے مراد یہ ہے کہ وہ مجموعہ ماقبل ومابعد پر موقوف نہ ہو۔جن مسائل مستقلہ کے مجموعہ کو کتاب کہتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔کبھی مجموعہ میں ایک ہی نوع کے مسائل ہوتے ہیں اور کبھی مختلف انواع کے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ جس مجموعہ میں جنس واحد کے مسائل ہوں اس کو کتاب کہتے ہیں۔ایک نوع کے مسائل کے مجموعہ کو باب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اور صنف واحد کے مسائل کو فصل سے تعبیر کرتے ہیں۔

ایمان کی تعریف

لغوی معنی: کسی کو ذوامن بنادینا،مطمئن بنادینا۔

تو ایمان لانیوالا اپنے آپ کو بھی نار جہنم سے بچالیتا ہے اور دوسروں کو بھی مطمئن بنا

دیتا ہے تو معلوم ہوا کہ مؤمن وہ ہوتا ہے جس سے سب مطمئن ہوں اسی کو المسلم من سلم المسلمون الخ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔

اصطلاحی معنیٰ: ان تمام باتوں کی تصدیق کرنا جن کو رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے، چاہے وہ اللہ تعالیٰ سے متعلق ہوں چاہے رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے، پہلی کتابوں اور صحیفوں سے متعلق ہوں یا آخرت سے جن کو "بما جاء به الرسول" (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) میں بیان کردیا ہے۔ ایمان مفصل ومجمل میں بیان کردیا ہے۔

پھر اس میں اختلاف ہے۔

اشاعرہ الگ ہیں، ماتریدی الگ ہیں، متکلمین الگ گروہ بنائے بیٹھے ہیں۔ اور پھر حضرت امام شافعیؒ کچھ اور حضرت امام اعظمؒ کچھ، اور معتزلہ اور خوارج کچھ کہتے ہیں، اور مرجیہ کچھ کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

البحث فی المذاهب فی الایمان

جاننا چاہئے کہ ایمان کی دو جہتیں ہیں۔ ایک جہت احکام دنیویہ کے اعتبار سے، دوسری جہت مقبول عند اللہ کے اعتبار سے، تو احکام دنیویہ کے اعتبار سے سب کا اتفاق ہے کہ صرف اقرار باللسان کرے تو اس کو ظاہراً مؤمن قرار دیا جائے گا، نماز جنازہ دفن فی قبور المسلمین میں مسلمان جیسا حکم جاری ہوگا۔

جو ایمان اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر ہے اسکی حقیقت میں اختلاف ہے، تو اس میں کل سات مذاہب ہیں، دو اہل حق کے اور پانچ اہل ہوا و باطل کے، اہل حق کے دو یہ ہیں کہ

(۱)...... جمہور فقہاء و جمہور محدثین امام شافعیؒ، مالکؒ، احمدؒ، سفیان ثوریؒ، حمیدی، اور امام

بخاریؒ کے نزدیک ایمان مرکب ہے اشیاء ثلثہ تصدیق بالجنان، اقرار باللسان، اور عمل بالارکان سے۔

(۲)......اور جمہور متکلمین اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایمان بسیط ہے صرف تصدیق قلبی کا نام ہے۔ اقرار وعمل حقیقت ایمان میں داخل نہیں۔ البتہ اقرار احکام دنیا کے اجرا کے لئے شرط ہے اور عمل کمال ایمان کے لئے شرط ہے۔

اہل ہواء میں پہلا مذہب معتزلہ کا، وہ کہتے ہیں کہ ایمان مرکب ہے اشیاء ثلاثہ سے تصدیق بالجنان، اقرار باللسان اور عمل بالارکان سے، یہ تینوں حقیقت ایمان کے اندر داخل ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو ترک کرنے سے خارج از ایمان ہو جائے گا مگر کفر میں داخل نہیں ہوگا بلکہ منزلة بين المنزلتين میں ہوگا۔

دوسرا مذہب خوارج کا، وہ بھی یہی کہتے ہیں مگر اتنا فرق ہے ایک جزء کو ترک کر دینے سے خارج از ایمان ہو کر کفر میں داخل ہو جائے گا۔ لیکن نتیجہ کے اعتبار سے دونوں فریق متفق ہیں کہ ایسا شخص دوزخ میں داخل ہوگا۔ اور مخلد فی النار رہوگا۔

تیسرا مذہب مرجیہ کا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایمان بسیط ہے صرف تصدیق قلبی کا نام ہے عمل واقرار نہ حقیقت ایمان میں داخل ہے اور نہ کمال ایمان کے لئے ضروری ہے۔ یہاں تک کہ ان کا قول مشہور ہے لاتضر المعصية مع الايمان كما لا تنفع الطاعة مع الكفر. [کوئی معصیت ایمان کے ساتھ نقصان نہیں دیتی۔ جس طرح کوئی طاعت کفر کے ساتھ نفع نہیں دیتی۔]

چوتھا مذہب جہمیہ کا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایمان صرف علم ومعرفت کا نام ہے، اور کسی شئ کی ضرورت نہیں۔

پانچواں مذہب کرامیہ کا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ ایمان صرف اقرار کا نام ہے، تصدیق وعمل کی کوئی ضرورت نہیں، حتی کہ وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ عهد الست کا اقرار ہی کافی ہے۔

بشرطیکہ خلاف اقرار کوئی امر ظہور پذیر نہ ہو۔ یہ ہوئی تنقیح مذاہب۔

خلاصہ: یہ ہوا کہ جمہور فقہاء ومحدثین معتزلہ وخوارج کے نزدیک ایمان مرکب ہے۔

اور جمہور متکلمین، ابوالحسن اشعریؒ اور امام ابوحنیفہؒ ومرجیہ کے نزدیک ایمان بسیط ہے۔ صرف تصدیق قلبی کا نام ایمان ہے مگر ایک بات یاد رکھنا چاہئے کہ اصل اختلاف اہل ہواء کے ساتھ ہے اور اہل حق کا آپس میں اختلاف حقیقی نہیں بلکہ لفظی واعتباری ہے، جسے آئندہ بیان کیا جائیگا۔

امام ابوحنیفہؒ ومتکلمین اعمال کو حقیقت ایمان سے اس طرح خارج نہیں کرتے، جیسے مرجیہ کہتے ہیں کہ ایمان کے لئے اعمال کی بالکل ضرورت نہیں بلکہ فرماتے ہیں کہ عمل کی بہت ضرورت ہے۔ اسی طرح محدثین کرام عمل کو حقیقی جزء قرار نہیں دیتے ہیں۔ بلکہ ضروری قرار دیتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ بھی یہی کہتے ہیں تو پھر اختلاف کہاں؟ بلکہ تعبیر کرنے میں ایک فریق نے شدت اختیار کی اور دوسرے نے سہولت اختیار کی، درحقیقت اس اختلاف کا منشا یہ تھا کہ جمہور کے مقابلہ میں مرجیہ تھے۔ جو اعمال کو ایمان سے بالکل خارج قرار دیتے ہیں تو ان کے جواب دینے کے لئے اپنے مذہب بیان کرنے میں شدت اختیار کی کہ اعمال کا ایمان میں بہت دخل ہے گویا اعمال ایمان کے اجزاء ہیں۔ اور حضرت امام ابوحنیفہ کا مقابلہ معتزلہ وخوارج کے ساتھ تھا لہذا ان کا جواب دینے کے لئے انہوں نے اپنا مذہب بیان کرنے میں بہت سہولت اختیار کی کہ گویا اعمال کی (نفس ایمان کے تحقق کے لئے) ضرورت ہی نہیں۔ تو امام صاحبؒ کے قول سے اصل ایمان کا مسئلہ صاف ہوگیا اور محدثین کے قول سے روح ایمان روشن ہوگئی۔

ایمان اور اسلام میں نسبت

اسلام کا لغوی معنی ہے کسی کے سامنے جھکنا۔ فروتنی اختیار کرنا۔ اس کی بات کو بلا چون وچرا تسلیم کرلینا۔ اصطلاح شریعت میں ایمان واسلام کے درمیان کیا نسبت ہے اس میں علماء

کے اقوال مختلف ہیں۔

(۱)...... ان دونوں میں عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے۔ ایمان خاص ہے۔ اسلام عام ہے۔ اس لئے کہ ایمان کہتے ہیں ''التسلیم بالباطن'' اور اسلام کا معنی ہے۔ تسلیم کر لینا خواہ یہ تسلیم دل سے ہو۔ خواہ زبان سے، خواہ جوارح سے ہو۔ ''کل ایمان اسلام بدون عکس کل''

(۲)...... بعض نے ان دونوں میں نسبت عموم خصوص من وجہ بیان کی ہے۔ اس لئے کہ ایمان نام ہے انقیاد باطنی کا۔ اور اسلام نام ہے انقیاد ظاہری کا جو کبھی کسی شخص میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور کبھی کسی میں انقیاد باطنی ہوتا ہے۔ ظاہری نہیں۔ اور کبھی انقیاد ظاہری ہوتا ہے اور باطنی نہیں ہوتا۔

(۳)...... سید مرتضیٰ زبیدی شارح احیاء العلوم کی رائے یہ ہے کہ ایمان واسلام میں تلازم فی الوجود یا تساوی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسلام کامل معتبر جب پایا جائے گا تو اس کے ساتھ ایمان ضرور ہوگا، جب ایمان کامل پایا جائے گا تو اس کے ساتھ اسلام ضرور ہوگا۔ اس لئے کہ ایمان نام ہے انقیاد باطنی کا لیکن کامل ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ ساتھ انقیاد ظاہری بھی ہو۔ اور اسلام نام ہے انقیاد ظاہری کا لیکن اس کے معتبر عند اللہ ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ انقیاد باطنی بھی ہو۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول بھی اس کے قریب ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ایمان واسلام کے جس طرح لغوی مفہوم جدا جدا ہیں اسی طرح سے ان دونوں کے شرعی مفہوم بھی جدا جدا ہیں۔ ایمان کا مفہوم ہے انقیاد باطنی اور اسلام کا مفہوم ہے۔ انقیاد ظاہری لیکن تغایر مفہوم کے باوجود ہر ایک دوسرے کو مستلزم ہے۔ اس لئے کہ کمال ایمان کیلئے انقیاد ظاہری شرط ہے۔ اسی طرح سے اسلام نام ہے۔ انقیاد

ظاہری کا لیکن معتبر اور صحیح تب سمجھا جائے گا جب کہ اس میں انقیاد باطنی بھی ہو۔

(۴)......اسلام وایمان کے درمیان نسبت قائم کرنے میں حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری نوراللہ مرقدہ کی تعبیر نہایت لطیف ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ ایمان واسلام کی مسافت ایک ہے۔ صرف مبداء اور منتہی کا فرق ہے۔ اسلام ظاہر سے شروع ہوتا ہے اور رچ رچ کر باطن میں پہنچتا ہے۔ اور ایمان کامل باطن سے شروع ہو کر پھوٹ پھوٹ کر ظاہر پر آجاتا ہے۔ اگر کسی کا ایمان کامل ہوگا تو وہ دل ہی میں نہیں رہے گا بلکہ اپنی قوت کی وجہ سے جوارح پر بھی ظاہر ہوگا اور اسلام اگر صحیح ہوگا تو ظاہر سے باطن تک ضرور پہونچے گا۔ البتہ ایمان ناقص اور اسلام غیر معتبر میں انفکاک ہو سکتا ہے۔ اگر تصدیق دل ہی دل میں ہے لیکن پھوٹ کر اعمال کی شکل میں ظاہر نہیں آئی تو یہ ایمان کے ناقص ہونے کی نشانی ہے۔ اور اگر اسلامی اعمال جوارح کے اوپر اوپر ہی تیرتے ہیں۔ لیکن قلبی یقین کے اضافہ کا باعث نہیں بنتے تو یہ اسلام غیر معتبر ہے۔

ایمان کی تعریف پر بعض اشکالات بھی کئے گئے ہیں اور ان کے جوابات بھی دئے گئے ہیں ہم ان کو مطولات کے حوالہ کرتے ہیں۔ البتہ ایمان کے بالمقابل کفر ہے۔ اس لئے کفر کی تعریف اور اس کے اقسام کو مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے بھی مطولات کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

کفر کے معنی اور اس کی اقسام

کفر کا لغوی معنی ہے "الستـــر" یعنی چھپانا۔ اصطلاح شریعت میں کفر ایمان کی ضد اور مقابل ہے۔ ایمان کا شرعی معنی ہے۔ جمیع ضروریات دین میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تصدیق کرنا اس کے مقابلے میں کفر کی حقیقت یہ ہوگی: "تکذیب النبی صلی اللہ

تعالیٰ علیه وسلم فی شیء من ضروریات الدین" [یعنی ضروریات دین میں سے کسی بات میں حضور علیہ السلام کی تکذیب کرنا۔] حصول ایمان کے لئے جمیع ضروریات دین کی تصدیق ضروری ہے۔ اور تحقق کفر کے لئے کسی ایک امر ضروری کا انکار بھی کافی ہے۔ ضروریات دین کی تکذیب کرنے کی صورتیں مختلف ہیں۔ جس صورت سے بھی ماہیت تکذیب پائی جائے گی کفر متحقق ہو جائے گا۔ تکذیب کی مختلف صورتوں کو کفر کی مختلف قسمیں سمجھا جاتا ہے۔ علماء نے کفر کی کئی قسمیں کی ہیں:

(۱)......کفر انکار۔ (۲)......کفر جحود۔ (۳)......کفر عناد

(۴)......کفر نفاق۔ (۵)......کفر زندقہ جس کو الحاد بھی کہا جاتا ہے۔

(۱)...... **کفر انکار**: یہ ہے کہ دل سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق نہ کرے اور زبان سے بھی صداقت کا اقرار نہ کرے، دل اور زبان دونوں سے انکار ہو۔

(۲)...... **کفر جحود**: یہ ہے کہ دل سے دین حق کو سچا سمجھتا ہے، اسکی حقانیت کا قائل ہے؛ لیکن زبان سے صداقت کا اقرار نہیں کرتا، بلکہ انکار کرتا ہے، جیسے کفر ابلیس و کفر یہود وغیرہ۔

(۳)...... **کفر عناد**: یہ ہے کہ دین حق کو دل سے بھی سچا سمجھتا ہے اور زبان سے بھی اس کی صداقت کا اقرار کرتا ہے۔ لیکن دین حق کے علاوہ دوسرے ادیان سے تبری نہیں کرتا اور التزام اطاعت نہیں کرتا۔ جیسے کفر ابو طالب۔

(۴)...... **کفر نفاق**: یہ ہے کہ دل میں تکذیب ہے۔ زبان سے ماننے کا کسی مصلحت کی وجہ سے اقرار ہے۔

(۵)...... **کفر زندقہ**: یہ ہے کہ بظاہر تو تمام ضروریات دین کے ماننے کا اقرار کرتا ہے۔ بظاہر کسی امر ضروری کا انکار نہیں کرتا لیکن ضروریات دین میں سے کسی امر ضروری کا مطلب ایسا بیان کرتا ہے جو صحابہ و تابعین اور تمام ائمہ امت کے اجماع

کے خلاف ہے۔ایسے شخص کو زندیق وملحد کہا جاتا ہے۔مثلاً کتاب وسنت میں جنت ونار کا ذکر ہے۔جنت ونار کا ثبوت ضروریات دین میں سے ہے۔ایک شخص کہتا ہے کہ میں دوزخ وجنت کو مانتا ہوں لیکن جنت سے مراد کوئی خاص نعمتوں والی جگہ نہیں، بلکہ جنت اس سرور اور ابتہاج کو کہتے ہیں جو ملکات محمودہ کے بعد آدمی کو حاصل ہوتا ہے۔اور نار سے مراد وہ ندامت اور گھٹن ہے جو ملکات قبیحہ کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔یہ شخص ملحد وزندیق ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا امام مالک کی شرح مسوی میں زندیق کی تعریف ان لفظوں سے فرمائی ہے:"و ان اعترف به ظاهرا لكنه يفسر بعض ما ثبت من الذين ضرورة بخلاف مافسره الصحابة و التابعون و اجمعت الامة عليه فهو الزنديق" (مسوی:۲/۱۳۰)[اگر ظاہری طور پر تو ان تمام ضروریات دین کا اقرار کرے، لیکن دین میں جو باتیں بطور ضرورت ثابت ہیں ان میں سے بعض کی تفسیر ایسی کرے جو صحابہ وتابعین اور اجماع امت کے خلاف ہو تو یہ شخص زندیق ہے۔]

زندقہ اور الحاد بھی کفر کی ایک نوع ہے۔اسلئے کہ اس میں بھی امر ضروری شرعی کا انکار ہے۔اور کفر کی حقیقت کسی امر ضروری کا انکار کرنا ہی ہے۔خواہ وہ کسی صورت میں ہو۔تبدیلی صورت سے حقیقت نہیں بدلتی، جس طرح سے نار و جنت کا ثبوت ضروری ہے۔ان کا سرے سے انکار امر ضروری کا انکار ہے۔اسی طرح سے نار کا مفہوم مخصوص اور جنت کا مفہوم مخصوص یہ بھی بطور ضرورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔اسلئے ظاہراً جنت ونار کے ماننے کا اقرار کرکے اس مفہوم مخصوص کا انکار کرنا کسی اور معنی پر محمول کرنا یہ بھی امر ضروری کا انکار ہے۔

یا مثلاً جس طرح "اقیمو الصلوۃ" کے الفاظ متواتر اور ضروری ہیں۔اسی طرح "صلوٰۃ" کا معروف معنی بھی شارع علیہ السلام سے ہم تک ضرورۃً ثابت ہے۔جیسے "اقیمو الصلوۃ"

کے الفاظ کا انکار اور کفر ہے۔ یا مثلاً جس طرح سے خاتم النبیین کی آیت کے الفاظ ضرورۃً ثابت ہیں اسی طرح سے ختم نبوت کا مفہوم اور معنی بھی ضرورۃً ثابت ہے، جس طرح سے اس آیت کے الفاظ کا انکار انکارِ امر ضروری ہے، اسی طرح سے ان لفظوں کے ماننے کا اقرار کرتے ہوئے اس کے اجمالی مفہوم اور معنی کو بدل کر کوئی اور معنی بیان کرنا بھی یہ امر ضروری کا انکار ہے۔ اسلئے الحاد و زندقہ کے کفر ہونے میں منصف کو کوئی تردد نہیں ہونا چاہئے۔

زندقہ کے کفر ہونے پر اشکالات کئے گئے ہیں اور ان کے تفصیلی جوابات بھی دئے گئے ہیں اس کی تفصیل کے لئے مطولات کی طرف رجوع کریں۔ فقط

حدیث جبرئیلؑ

یہ حدیث نہایت عظیم الشان ہے، جو دین کے اہم مضامین پر مشتمل ہے، شریعت، طریقت، حقیقت اجمالی طور پر اس میں موجود ہے، اس لئے اس حدیث کو ام الاحادیث اور ام الجوامع بھی کہتے ہیں۔

﴿الفصل الاول﴾

﴿حدیث جبرئیل﴾

﴿٢﴾ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيْدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ شَدِيْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَايُرٰى عَلَيْهِ أَثَرُ السَّفَرِ وَلَايَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ حَتّٰى جَلَسَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلٰى رُكْبَتَيْهِ وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلٰى فَخِذَيْهِ، وَقَالَ يَا مُحَمَّدُ! أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِسْلَامِ، قَالَ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ، وتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ، وَتَصُومَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنْ اِسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيْلاً، قَالَ صَدَقْتَ، فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ، قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيْمَانِ قَالَ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ، وَمَلَائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، ورُسُلِهِ، وَالْيَوْمِ الآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ، قَالَ صَدَقْتَ، قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ، قَالَ أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ، قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ، قَالَ مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ، قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَاتِهَا قَالَ أَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا، وَأَنْ تَرَى الْحُفَاةَ، الْعُرَاةَ، الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ، قَالَ ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا، ثُمَّ قَالَ لِي يَا عُمَرُ، أَتَدْرِيْ مَنِ السَّائِلُ، قُلْتُ اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ، قَالَ فَإِنَّهُ جِبْرِيْلُ، أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ، رَوَاهُ مُسْلِم، وَرَوَاهُ أَبُوْهُرَيْرَةَ مَعَ اِخْتِلَافٍ، وَفِيْهِ، وَإِذَا رَأَيْتَ الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الصُّمَّ الْبُكْمَ مُلُوْكَ الْأَرْضِ، فِي خَمْسٍ

لَایَعْلَمُهُنَّ اِلَّا اللّٰه، ثُمَّ قَرَأَ "اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ، (متفق علیه)

حوالہ: بخاری شریف: ج ۲/ص ۷۰۴، باب قوله "ان الله عنده علم الساعة، سوره لقمان" کتاب التفسیر، عالمی حدیث نمبر ۴۷۷۷، مسلم شریف: ج ۱/ص ۲۹، باب بیان الایمان والاسلام والاحسان، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۸۔

حل لغات: بیاض، سفیدی، باض فلانا، (س) بیضاً، گورے پن میں کسی سے بڑھ جانا۔سواد، سیاہی سَوِدَ، (س) سَوَداً، سیاہ فام ہونا اسند الی شيءٍ، (افعال) سہارا دینا۔الرکبة، گھٹنا، زانو، ج رُکَبٌ، اَلْفَخُذُ، وَالْفَخِذُ، ران ج اَفْخَاذٌ. امارات، واحد اَمَارَةٌ، علامت نشان، حفاة، واحد حافی، برہنہ پا، حَفِیَ، (س) حَفاً، برہنہ پا ہونا، عراة، واحد عاری، برہنہ (ننگا) عَرِیَ من ثیابه (س) عُرْیاً، برہنہ ہونا، عالة، واحد عائل، محتاج، عَالَ فُلَانٌ، (ن) عَیْلاً محتاج ہونا۔رعاة، واحد راعی، چرواہا، رَعِیَ الماشیة، ۔ (س) رَعْیاً، جانور کو چرانا۔الشاء، واحد شاة، بکری، تطاول، غرور وتکبر کرنا، ڈینگیں مارنا، طول، (ن) سے مشتق ہے۔البنیان، تعمیر، عمارت، مکان، ملیاً، کچھ دیر، کچھ عرصہ۔

ترجمہ: حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ اچانک ایک شخص ہمارے درمیان آیا، اسکے کپڑے نہایت سفید اور بال نہایت سیاہ تھے، نہ تو اسپر سفر کی کوئی علامت تھی اور نہ ہم میں سے کوئی اسکو پہچانتا تھا، یہاں تک کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب بیٹھ گیا، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملا دئے اور اپنے دونوں ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں زانوے مبارک پر رکھدئے، اسکے بعد اس نے کہا کہ اے محمد! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) مجھ کو اسلام کی حقیقت سے روشناس کرائیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے

کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اور پابندی سے نماز پڑھو، زکوۃ کی ادائیگی کرو، رمضان کے روزے رکھو، اگر بیت اللہ تک پہنچنے کی قوت ہے تو حج کرو، سائل نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا، راوی کہتے ہیں کہ ہمیں اس بات پر تعجب ہوا کہ خود ہی سوال کرتا ہے اور خود ہی تصدیق کرتا ہے، پھر وہ شخص بولا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کی حقیقت سے آگاہ فرمایئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ایمان یہ ہے کہ تم خدا کے فرشتوں، اسکی کتابوں، اسکے رسولوں اور قیامت کے دن کو دل سے مانو، اور اس بات پر یقین رکھو کہ برا بھلا جو کچھ پیش آتا ہے، وہ نوشتۂ تقدیر کے موافق ہے۔" سائل نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درست فرمایا، اسکے بعد اس نے کہا احسان سے ہمیں مطلع فرمایئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اسطرح کرو گویا تم اسکو دیکھ رہے ہو، اگر ایسا ممکن نہ ہو تو (یہ دھیان کرلو کہ) وہ تم کو دیکھ رہا ہے، اسکے بعد سائل نے کہا کہ ہمیں قیامت کے بارے میں بتایئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس بارے میں جواب دینے والے کو سوال کرنے والے سے زیادہ علم نہیں ہے، اسکے بعد اس شخص نے کہا قیامت کی کچھ علامات بیان کردیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب باندی اپنے آقا کو جننے لگے اور ننگے پاؤں، ننگے بدن بکریوں کے چرانے والوں کو تم دیکھو کہ عالیشان بلڈنگ میں غرور و تکبر کے ساتھ زندگی گذار رہے ہیں، راوی کہتے ہیں کہ اسکے بعد وہ شخص چلا گیا، میں نے کچھ عرصہ توقف کیا، اسکے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اے عمر تم جانتے ہو یہ سائل کون تھے؟ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ہی بہتر جانتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ جبرئیل تھے جو تم کو تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔

اس روایت کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اختلاف الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے، ان کی روایت کے الفاظ یوں ہیں، جب تم برہنہ پا، برہنہ جسم اور بہرے گونگے لوگوں کو

زمین پر حکمرانی کرتے دیکھو (تو سمجھ لو قیامت قریب ہے) پانچ چیزیں ہیں کہ جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی ان اللہ عندہ الخ آخیر تک پڑھی۔

تشریح: سب سے پہلے اس حدیث کو لائے جس کا نام حدیث جبرئیل ہے۔ یہ احادیث کے لئے ایسی ہی ہے جیسے قرآن کریم کے لئے سورۂ فاتحہ ہے تو یہ احادیث کا اجمال ہے اس حدیث کو پڑھ لیا، تو گویا اجمالاً تمام احادیث پڑھ لیا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ حدیث عظیم الشان ہے۔ اس کو حدیث جبرئیل، ام الاحادیث اور ام الجوامع کہتے ہیں کیونکہ یہ روایت شریعت، طریقت اور حقیقت تمام مضامین کو اجمالی طور پر شامل ہے۔ جس طرح سورۂ فاتحہ کو ام القرآن اور ام الکتاب اس لئے کہتے ہیں کہ وہ مضامین قرآن اور احکام فرقانیہ پر مشتمل ہے۔ گویا کہ حدیث انما الاعمال بسملہ کے درجہ میں اور یہ حدیث فاتحہ کے درجہ میں ہے۔ جس سے بسملہ اور حمدلہ دونوں کا آغاز کتاب میں ذکر آ گیا۔ (مرقاۃ: ص ۱/۶۵)

اور امام قرطبیؒ نے اس روایت کا نام مذکورہ اوصاف کی بنا پر "ام السنۃ" قرار دیا ہے۔ (المفہم: ص ۱/۱۵۲)

شان ورود: حدیث میں مذکور واقعہ اس وقت پیش آیا، جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم غایت احتیاط اور خوف کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال نہ کرتے تھے اور ان کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ کوئی دیہاتی سمجھدار آدمی آئے اور سوال کرے، اس کے طفیل میں ہم بھی فیضیاب ہو جائیں۔ کیونکہ آیت "یایھا الذین امنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسوء کم" الآیۃ. یعنی اے ایمان والو! غیر ضروری سوالات مت کیا کرو کہ بعد میں تمہیں مشقت ہو، نازل ہو چکی تھی جس کا شان نزول امام ترمذیؒ نے حضرت علی رضی اللہ

تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب آیت "**وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا**" نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پوچھنے لگے کہ کیا ہر سال حج کرنا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہیں دیا۔ انہوں نے پھر سوال کیا، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ اسی طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن حذافہ سہمی (جن کو لوگ ان کے والد کے علاوہ دوسرے کی طرف منسوب کرتے تھے) کھڑے ہو کر پوچھنے لگے "**من ابی**" حضور صلی اللہ علی وسلم نے بتا دیا کہ تمہارے والد فلاں ہیں۔ اس پر یہ آیت "**یایھا الذین امنوا لا تسئلوا**" نازل ہوئی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جب میں کسی بات کو چھوڑ دوں تو تم بھی اس کو چھوڑ دیا کرو اور جس چیز کے کرنے یا چھوڑنے کا میں نے حکم دیا ہے اس پر عمل کیا کرو۔ کیوں کہ پہلی امتوں میں ہلاکت کا ایک سبب انبیاء علیہم السلام سے کثرت سوالات اور اختلاف بھی تھا۔ اسی وجہ سے صحابۂ کرام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے ہوئے ڈرنے لگے تھے تب **۱۰ھ** میں حجۃ الوداع سے کچھ قبل یہ واقعہ پیش آیا تا کہ احکام شریعت کا اجمالی خاکہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے سامنے آجائے، یہ رائے امام طیبیؒ نے نقل کی ہے۔

اور بعض روایات میں "**فی آخر عمرہ**" کا لفظ ہے جس سے فتح الملہم میں یہ احتمال نقل کیا گیا ہے کہ ممکن ہے یہ واقعہ حجۃ الوداع کے بعد پیش آیا ہو۔ (تنظیم الاشتات: ص ۳۱/۱، تحفۃ الاحوذی: ص ۴۲۰-۴۲۲/۸، تفسیر مظہری سورۂ مائدہ: ص ۱۹۱/۳، مرقاۃ: ۴۹/۱، طیبی: ۱۱۱/۱)

عن عمرؓ بینما نحن عند رسول اللہ صلی علیہ وسلم ذات یوم الخ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اسی درمیان میں کہ ہم ایک روز حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں موجود تھے۔

بینما: میں ما وقتیہ ہے (وقت کے لئے) **ترجمہ:** اس اثنا میں اس وقت میں،

ما وقت کو بتلاتا ہے، **ذات یوم**. جس طرح دلہن پر آوڈر پاوڈر اثر لے آتا ہے اسی طرح **یوم** پر **ذات** داخل کرنے سے وہی حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

اذ طلع علینا رجل: [اچانک ایک شخص سامنے آیا]

جس طرح سورج کے لئے طلوع شمس کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور چاند کے لئے طلع البدر استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح آنے والے کی عظمت کے پیش نظر **طلع** کا لفظ استعمال کیا۔ (اُبی شرح مسلم: ۱/۱۰۳)

یا اس وجہ سے کہ ملائکہ نورانی جسم رکھتے ہیں جیسا مسلم شریف میں ہے کہ ملائکہ نور سے پیدا کئے گئے ہیں، لہٰذا حضرت جبرئیلؑ کی آمد کو طلوع سے تعبیر فرمایا۔ (التعلیق الصبیح: ۱/۱۵)

رَجُلٌ: یعنی اصل میں فرشتہ تھا اور رجل کی صورت میں آیا تھا۔ (فتح الباری: ۱/۱۵۹)

شدید بیاض الثیاب الخ: بہت زیادہ سفید کپڑوں والا اور بہت زیادہ سیاہ بالوں والا، یہاں اضافت کے ساتھ بھی پڑھنا جائز ہے اور تنوین کے ساتھ بیاض کو اس کا فاعل بنا کر پڑھنا بھی جائز ہے۔ دوسرے جملے میں بھی یہی صورتیں ہیں۔

شدیدٌ (مرفوع) اور بیاض ثیابه تھا۔ "ہ" ضمیر کو محذوف کر دیا اور الف لام اس کے عوض میں دیدیا۔ اور شدید کو مضاف بھی بنا سکتے ہیں۔

اسی طرح **شدید سواد الشعر** میں **شدید** کو علیحدہ رکھو یا مضاف کردو اور **سواد شعرہ** پڑھو یہاں ضمیر کے عوض میں الف لام لے آئے۔

تو معلوم ہوا کہ ان کے سر پر سیاہ بال تھے۔ اور سیاہ بال بھی فطری حسن میں داخل ہیں ان کے سر پہ بال تھے وہ سر منڈے نہ تھے۔

لیکن ابن حبان کی روایت میں ہے کہ "شدید سواد اللحیة" (الاحسان: ص ۱/۱۹۵، رقم: ۱۶۸) لہٰذا معلوم ہوا کہ یہاں پر سر کے بالوں کی سیاہی کا تذکرہ نہیں بلکہ

داڑھی کی سیاہی کوراوی بیان کررہا ہے۔

سر پر بال رکھنا سنت ہے

فرشتے بھی آپ کے پاس زلفوں والے آئے۔حضرات انبیاء علیہم السلام بھی بال رکھتے تھے۔

لا یہ کہ احرام میں گئے اور بال منڈ وادیے چونکہ وہاں تو گردن منڈانی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے آسان کردیا کہ صرف بال منڈانے کا حکم فرمایا۔اس سے سر پر بالوں کے رکھنے کا سنت ہونا معلوم ہوگیا۔

پہلے جملے سے صفائی بدن ونظافت ثیاب کی طرف اشارہ ہے۔اور دوسرے جملے سے کمال قوت وشباب کی طرف اشارہ ہے۔اور دونوں سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ طالب علم کے زمانے میں صفائی بدن ونظافت کپڑے وغیرہ کا خیال رکھنا چاہئے،گندا بدن میلے کپڑوں سے پرہیز کرے تاکہ علم کا نور اندر سمو سکے، نیز اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بزرگوں کی مجلس میں جاتے وقت ہر قسم کی صفائی بدن، کپڑے اور دل کی صفائی لے کر جائے تاکہ ان سے برکات وفیض حاصل ہوسکے، اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ عنفوان شباب کے وقت طالب علم کرنا چاہئے تاکہ علم کا بوجھ اٹھانے اور محنت ومشقت کی تکلیف برداشت کرسکے۔

لَایُرٰی عَلَیْہِ اَثَرُ السَّفَرِ وَلَایَعْرِفُہٗ مِنَّا اَحَدٌ الخ: حضرت جبرئیل علیہ السلام اس طرح تشریف لائے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی یہیں کے رہنے والے ہیں چونکہ کوئی نشان سفر آپ پر نہ تھا۔اور کوئی پہچانتا نہ تھا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اجنبی ہیں۔

لَایُرٰی عَلَیْہِ اَثَرُ السَّفَرِ: اکثر روایات میں یریٰ فعل مجہول ذکر کیا گیا ہے

اور بعض روایات میں ”نـــری“ جمع متکلم معروف کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے اور دونوں روایات درست ہیں۔(مرقاۃ:ص۱/۵۰)

امام طیبیؒ کی رائے یہ ہے کہ صحابہ اس کی کیفیت سے حیرانی میں پڑ گئے اور انکے دل میں یہ بات کھٹک رہی تھی کہ ممکن ہے یہ شخص جنات میں سے ہو یا ممکن ہے کہ فرشتہ ہو۔(طیبی:ص۱/۹۴)

”وَ لَا یَعْرِفُہٗ مِنَّا اَحَدٌ“ حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا کہ ہم میں سے کوئی اس کو جانتا نہیں تھا محل اشکال ہے کیونکہ وہ اپنے بارے میں تو کہہ سکتے ہیں لیکن سب کی ترجمانی کس طرح کر سکتے ہیں؟ حافظ نے اس کے دو جواب دیئے ہیں۔

(۱)......اپنے گمان سے انہوں نے یہ فرمایا کہ میرا گمان یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی اس کو جانتا نہ تھا۔

(۲)......ایک روایت میں ہے کہ جب وہ آئے تو حاضرین نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کہ ممکن ہے یہ شخص کسی کا شنا سا ہو لیکن ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر انہوں نے انکار کر دیا کہ ہم اس کو نہیں جانتے لہذا حضرت عمرؓ نے کہا کہ کوئی بھی اس کو پہچانتا نہ تھا۔(فتح الباری:۱/۱۶۰)

البتہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پہچانا یا نہیں تو بعض علماء کی رائے ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پہچان لیا تھا۔ اور بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو اولاً پہچان نہ پائے تھے۔(مرقاۃ:۱/۵۰) جیسا کہ خود بعض روایات میں صراحت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اب کی مرتبہ میں بھی ان کی واپسی تک نہ پہچان سکا کہ یہ جبرئیل ہیں۔(المفہم شرح مسلم:۱/۱۵۲)

وضع کفیہ علی فخذیہ الخ: تو متضاد صفات ان میں موجود تھے۔ اور اس قدر قریب ہو گئے کہ اپنے گھٹنوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے ملا کر بیٹھ گئے

اور اپنے ہاتھوں کو اپنی رانوں پر رکھ کر بیٹھ گئے، جو شان طالب علمی کے لائق تھا۔

امام نوویؒ اور تورپشتیؒ کی رائے یہی ہے اسلئے کہ وہ اس وقت گویا متعلم تھے تو ایسی ہیئت کو انہوں نے اختیار کیا جو طالب علم کی شان کے مناسب ہے۔ (نووی: ص ۲۸/۱، فتح الباری: ۱/۱۶۰)

یہی رائے ہے امام بغوی، اسمٰعیل تیمی کی اور علامہ طیبیؒ نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے کیونکہ مسند بزار، ابن خزیمہ اور نسائی: ص ۱۰۵/۸، رقم ۵۰۰۱، میں روایت کے الفاظ یہ ہیں "وضع یده علی رکبتی رسول الله صلی الله علیه وسلم" اور حافظ ابن حجرؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس کی جانب کمال توجہ فرمائیں اور صحابہ کرام کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو کہ یہ بدوی ہے جو دربار نبوی کے آداب سے واقف نہیں ہے۔ (فتح الباری: ص ۱/۱۶۰، اُبیؒ: ۱/۱۰۴، طیبی: ۱/۹۵)

اور اگر ضمیر کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹاؤ تو مطلب یہ ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رانوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اول اپنی رانوں پر ہاتھ رکھے ہوں اور پھر کمال بے تکلفی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رانوں پر ہاتھ رکھ لئے ہوں۔ ایسا تو وہی کر سکتا ہے جس کے ساتھ پرانی یاری ہو جب کوئی اول آپ کے پاس آتا تو مرعوب ہو جاتا، وہ تو خود آپ ہی انہیں بے تکلف بنا دیتے تھے، ورنہ سامنے بیٹھنے کی بھی جرأت نہ ہوتی تھی۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب ناراض ہوتے تو حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے حضرات بھی کونوں میں کھڑے ہو جاتے تو وہ آئے اور بلا تمہید کے یہ بات پوچھی۔ تمہید تو شہر والوں کی عادت ہوتی ہے۔

قال یامحمد الخ: اور خطاب بھی کیا تو یا محمدؐ کہہ کر گاؤں والوں کی طرح۔

اشکالات مع جوابات

اشکال اول: اس پر ایک اشکال یہ ہے کہ بلا سلام کے اس نے گفتگو کیوں شروع کردی؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ بعض روایات میں صراحت ہے کہ آکر اس نے سلام کیا تھا پھر سوالات کا آغاز کیا تھا۔ (فتح الباری: ۱/۱۶۰)

اشکال دوم: یہ ہے کہ قرآن پاک میں ہے "لاتجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا" پھر اس نے یا محمد کیوں کہا؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں حکم امت محمد یہ کے جن وانس کے لئے ہے ملائکہ اس میں داخل نہیں۔ یا انہوں نے ایسا اس لئے کہا تا کہ صحابہ ان کو بدوی سمجھیں اور ان کا معاملہ مخفی رہے۔ اور بعض روایات میں یہ ہے کہ اس نے یا رسول اللہ کہہ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا اور پھر سوالات کئے۔ گویا کہ روایات میں خود تعارض ہے کہ فرشتے نے نام لیا یا یا رسول اللہ کہا۔ حافظ نے ان کے درمیان یہ تطبیق دی ہے کہ پہلے اس نے نام سے پکارا اور پھر یا رسول اللہ کہکر سوالات کا آغاز کیا۔ (فتح الباری: ۱۶۰/۱، مرقاۃ: ۱/۵۱)

اَخْبِرْنِی عَنِ الْاِسْلَامِ: مجھے خبر دیجئے اسلام کیا ہے؟

روایات اس سلسلہ میں مختلف ہیں بعض روایات میں ایمان کا سوال مقدم ہے جیسا کہ بخاری ومسلم وغیرہ میں، اور بعض میں اسلام کا سوال مقدم ہے جیسا کہ نسائی اور مشکوۃ وغیرہ میں ہے اور بعض کتب میں احسان مؤخر ہے اور بعض میں درمیان میں ہے علماء نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں لیکن محققین کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ یہ رواۃ کا تصرف ہے اس لئے کہ واقعہ ایک ہی ہے ہر ایک نے اپنے ذوق کے اعتبار سے اس کو بیان کیا ہے۔

(مرقاۃ:۴۵/۱، فتح الباری:۱۶۱/۱)

اسلام کی تعریف میں چار قسم کی عبادات کو بیان کیا گیا۔ صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، اس کی حکمت یہ بیان کی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی دو قسم کی صفتیں ہوتی ہیں۔ جمالی، جلالی، جمالی کا تقاضا انس ومحبت ہے۔ اور جلالی کا تقاضا غضب وانتقام ہے۔ اور ان صفات کا ظہور مختلف اشیاء کے توسط سے ہوتا ہے۔ ان میں عبادات بھی ہیں۔ تو صلوٰۃ وزکوٰۃ مظہر ہیں صفات جلالی کا کیونکہ نماز میں ایک مجرم کی طرح کھڑا ہونا پڑتا ہے کہ کسی طرف نظر نہ ہو ہاتھ باندھ کر بغیر حرکت نیچے کی طرف نظر کر کے کھڑا ہوتا ہے، گویا کہ ایک مجرم آدمی کسی حاکم کے اجلاس میں کھڑا ہے۔ اسی طرح زکوۃ کہ گویا ایک مجرم کی طرح اپنا مال کا جرمانہ حاکم کو دے رہا ہے، اور صوم وحج صفات جمالی کے مظہر ہیں کہ روزہ دار خدا کی محبت کا دعویدار ہے۔ اسکی محبت سے ہر قسم کی نفسانی خواہش کو چھوڑ دیا۔ اور حج میں تو سارے افعال عاشقوں کے ہیں کہ دیار محبوب کے دیدار کے لئے پراگندہ بال ہوکر کوچۂ محبوب میں پریشان حال ہوکر گھومتا رہتا ہے اور محبوب کی دیواروں کو بوس وکنار کرتا ہے۔ پھر آخر میں محبت کے مارے در محبوب کے قریب اپنی جان کی قربانی کر کے آجاتا ہے۔ یہ سارے افعال صفات جمالی کا مظہر ہیں۔

قولہ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً: اس پر یہ سوال ہے کہ استطاعت تو تمام ہی احکام میں مشروط ہے پھر حج کے ساتھ ہی خصوصی طور پر اس قید کو کیوں ذکر کیا گیا ہے۔

امام طیبیؒ کی رائے یہ ہے کہ اس استطاعت سے مراد زاد وراحلہ پر قدرت ہے کیونکہ بہت سے لوگ بلا زاد وراحلہ کے سفر کرتے تھے اور حاجیوں پر بار بنتے تھے لہذا ان کے لئے یہ حکم صادر فرمادیا گیا کہ حج کرو مگر زاد وراحلہ اختیار کرو دوسرے حضرات حجاج پر بار نہ بنو۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں ممکن ہے کہ اس میں یہ حکمت ہو کہ بعد میں یہ ان مالداروں کے خلاف دلیل بن جائے جو حج بالکل نہیں کرتے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مال ودولت دنیا

میں عطا فرمایا تھا۔ (طیبی: ۹۷/۱، مرقاۃ ۴۷/۱)

قولہ أن تؤمن: دوسرا سوال کیا وما الایمان الخ. اور ایمان کیا چیز ہے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا۔ یہاں ظاہراً یہ اشکال ہوتا ہے کہ یہاں معرَّف اور معرِّف متحد ہو گئے، کیونکہ ان مصدریہ کی بناء پر مضارع مصدر ہو گیا۔ تو اب عبارت یوں ہوئی: **الایمان الایمان باللہ**. حالانکہ معرَّف اور مُعرِّف میں تغایر ضروری ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ معرَّف میں الایمان سے ایمان شرعی مراد ہے۔ اور معرِّف میں ایمان لغوی مراد ہے اور وہ اپنے متعلقات سے مل کر ایمان شرعی کی تعریف ہو گئی۔ فلا اشکال.

پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سوال کیا ایمان کے بارے میں۔ اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جواب دیا مؤمنٌ بہٖ سے تو سوال و جواب میں تطابق نہ ہوا۔ تو بات یہ ہے کہ قرائن سے معلوم ہوا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مقصد مؤمنٌ بہٖ کی تعیین تھا، بنابریں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی اس کی تعیین فرمادی۔ ایمان باللہ کی شرح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور ذات و توحید ذات وصفات کمالیہ پر ایمان لائے۔ اور ہر قسم کے عیوب ونقائص سے منزہ سمجھیں۔

قولہ وملائکتہ: یہ جمع ہے مَلَکٌ کی اور ملک اصل میں **ملئک** تھا۔ اور یہ مقلوب ہے **مالک** ماخوذ ہے **ألوکۃ** سے بمعنی رسالۃ اور فرشتے اللہ تعالیٰ اور رسولوں کے درمیان قاصد ہوتے ہیں۔ اس لئے **ملک** کہا جاتا۔ خلاف قیاس لام کو ہمزہ پر مقدم کر لیا پھر ہمزہ کی حرکت کو ماقبل میں دے کر ہمزہ کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا۔ **مَلَکٌ** ہو گیا۔ ملائکہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے وجود پر ایمان لایا جائے اور ان کی جو صفات قرآن کریم میں مذکور ہیں: **وانهم عباد مكرمون يسبحون الليل والنهار لايفترون ولايعصون الله ما امرهم ويفعلون مايؤمرون. الآية.** ان پر ایمان لائے اور یہ وصف

ذکورت وانوثت سے پاک ہیں۔

قولہ و کتبہ: ان کے وجود پر یقین کیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت سی کتابیں نازل ہوئیں۔ اور یہ سب حق ہیں ان میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ اور جن کا ذکر قرآن وحدیث متواتر میں آیا ہے ان کو معین کر کے ماننا جیسے، قرآن، توارت، انجیل، اور زبور اور جن کا ذکر قرآن میں مذکور نہیں ان پر اجمالاً ایمان رکھے، اور یہ بھی یقین رکھے کہ سوائے قرآن کریم کے تمام کتابیں منسوخ ہوگئیں۔ اور قرآن کریم میں کسی قسم کے نسخ وتحریف واقع نہیں ہوسکتی قیامت تک۔

قولہ ورسلہ: یہ جمع ہے رسول کی معنیٰ اسم مفعول مرسل کے ہیں ان پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصلاح ناس کے لئے بہت سے منتخب شدہ آدمیوں کو مقرر کیا۔ وہ فرشتے نہیں بلکہ انسان ہیں، وہ سب کے سب حق ہیں۔ اور جنکی تفصیل معلوم ہے ان کی تفصیل پر ایمان لائے اور یہ بھی یقین کرے کہ انہوں نے ادائے رسالت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔ اور وہ معصوم ہیں۔ رسول بھیجنے کی حکمت یہ ہیکہ اللہ جل شانہ کی ذات ہر قسم کے عیوب وگندگی سے پاک ہے اور انسان ہر قسم کی پلیدگی وعیوب سے ملوث ہے اسلئے بلا واسطہ ہر انسان سے کلام کرنا شان خداوندی کے لئے مناسب نہیں۔ بنابریں ایسی ہستیوں کو منتخب کیا جو ظاہراً تو انسانی صفات کے ساتھ متصف ہیں لیکن باطناً ہر قسم کی گندگی وپلیدگی سے منزہ وپاک ہیں۔ لہذا ان کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ سے بھی ہے اور انسان سے بھی۔ تا کہ اللہ تعالیٰ سے احکام لے کر انسانوں میں تقسیم کریں اور اس سے انسان کا تعلق اپنے خالق سے پیدا ہو جائے۔ اور خلقت بنی آدم کا مقصد حاصل ہو جائے۔

قولہ والیوم الآخر: [یوم آخرت پر ایمان لائے] کہ اس دار کے بعد دوسرا ایک دار آنیوالا ہے اس پر اور اسمیں جو کچھ ہونے والا ہے بعث جسمانی، حساب اور

جنت و دوزخ وغیرہ ان سب پر یقین کرے، کیونکہ دنیا میں بہت لوگ اچھے کام کرتے ہیں ان کو کوئی جزا نہیں ملتی، اور بہت سے لوگ برے کام کرتے ہیں مگر ان کو کوئی سزا نہیں ملتی، لہذا اس عالم کے بعد اور ایک عالم ہونا چاہئے جہاں پوری طرح جزاء وسزا ملے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ پر ظلم و ناانصافی کا الزام ہوگا۔ (العیاذ باللہ)

قوله وتؤمن بالقدر: سب کو پہلے مؤمن به اللہ پر عطف کر دیا گیا۔ مگر یہاں عطف نہ کر کے لفظ ایمان کو صراحۃ مکرر لائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقدیر کا مسئلہ مزلۃ الاقدام مسئلہ ہے۔ بہت سے علماء اس میں افراط وتفریط کر کے گمراہ ہو گئے ہیں۔ تو بطور تاکید ہوش کے ساتھ قدم رکھنے کی غرض سے مکرر لائے اور قدر کے بارے میں مستقل باب آرہا ہے۔ بناء بریں یہاں زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔

فعجبنا له: یہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام سے بہت سے احوال متعارضہ ظہور پذیر ہوئے۔ جس بناء پر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو بہت تعجب ہوا۔ ایک تو اس پر سفر کا کوئی اثر نہیں، کپڑے اور بدن نہایت صاف ستھرے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قریب آس پاس کا کوئی آدمی ہوگا۔ نیز بلا تکلف حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گئے۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر ادھر ہم میں سے کوئی نہیں پہچانتا ہے۔ نیز آداب نبوت کا بھی خیال نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت دور کا کوئی اعرابی آدمی ہوگا۔ پھر جب سوال کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس سے جاہل ہے اور دور کا آدمی ہے۔ پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کی تصدیق کی جس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس سے پہلے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس نے یہ باتیں سنی ہیں۔ کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط کے علاوہ ان باتوں کا جاننا ممکن نہیں۔ یہی وجوہات تھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعجب کے۔ لہٰذا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تعجب کرنا برمحل ہے۔

تیسرا سوال! ما الاحسان پوچھا کہ احسان کیا ہے؟

احسان کے معنی ہیں کسی شئ کو حسین بنا دینا اس کے جواب میں ارشاد فرمایا "اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ" تو آپ نے بتلادیا کہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرنا کہ گویا اللہ تعالیٰ کو تم دیکھ رہے ہو۔ اور اگر تم نہیں دیکھ رہے تو سمجھو کہ اللہ تعالیٰ تم کو دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ حال ہر وقت رہنے لگے تو پوری زندگی حسین بن جائے گی۔

خطابیؒ کے نزدیک اس مقام پر احسان سے مراد اخلاص ہے کیونکہ اخلاص ایمان اور اسلام دونوں کے لئے شرط ہے لہٰذا اگر کوئی شخص ایمان لائے مگر اس میں اخلاص نہ ہو، نیز اعمال صالحہ بھی کرے مگر ان میں مخلص نہ ہو تو وہ مؤمن نہیں ہے۔ (ذکرہ الطیبی: ۱/۱۰۲)

اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سے مراد اتقان عبادت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اخلاص، خشوع وخضوع سے عبادت کی جائے اور ذہن دنیاوی علائق سے فارغ ہو اور یہ سمجھ کر عبادت کی جائے کہ میں معبود کو دیکھ رہا ہوں یا کم از کم یہ کہ معبود مجھے دیکھ رہا ہے۔ (فتح الباری: ۱/۱۶۴)

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اس سے ان آیات کی جانب اشارہ ہے جن میں احسان کا لفظ موجود ہے مثلاً "للذین احسنوا الحسنی ان اللہ یحب المحسنین" اور اس سے مراد اسلام یعنی اعمال ظاہرہ کو ریا وسمعہ وشرک خفی وغیرہ سے پاک کرنا اور ایمان یعنی اعمال باطنہ وعقائد کو نفاق وغیرہ سے پاک کرنا ہے۔ (تنظیم مع زیادۃ: ۱/۳۴)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کے جواب میں دو حالتوں کی جانب اشارہ کیا جن میں سے ارفع حالت یہ ہے کہ اس پر مشاہدۂ حق کا غلبہ ہو جو اس درجہ کو پہنچ گیا ہو کہ گویا وہ ذاتِ باری کو دیکھ رہا ہے "کانک تراہ" میں اسی کو بیان کیا گیا ہے اور دوسری حالت یہ ہے کہ اس کو اس بات کا استحضار ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے اور یہ مرتبۂ مراقبہ ہے

"**فانہ یراک**" سے اسی کو بیان کیا گیا ہے۔جیسا کہ قرآن پاک میں ہے "**الذی یریٰک حین تقوم**" علامہ قسطلانی شارح بخاری فرماتے ہیں کہ یہ حدیث جوامع الکلم سے ہے کیونکہ مقام مشاہدہ اور مقام مراقبہ دونوں کو شامل ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ کے اس کی عبادت میں تین مقام ہیں۔

(۱)......عبادت کو شرائط وارکان کی رعایت کے ساتھ اس طرح ادا کرے کہ قضا ذمہ میں واجب نہ رہے اور وہ ذمہ سے ساقط ہو جائے۔

(۲)......مذکورہ صورت کے ساتھ ذوق وشوق اور مکاشفہ کے دریائے ناپیدا کنار میں مستغرق ہو کر اس طرح عبادت کرے گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اور یہی مقام مشاہدہ ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا۔

(۳)......ارکان وشرائط کی رعایت کے ساتھ اس طرح عبادت کرے گویا کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے اور یہی مقام مراقبہ ہے۔اور یہ تینوں احسان کے مراتب ہیں لیکن صحت عبادت کے لئے شرط مرتبہ اولیٰ ہے اور دوسرا اور تیسرا خواص کا مقام ہے جو ہر ایک کی دسترس سے باہر ہے۔ (قسطلانی:۲۴۱/۱، فتح الباری:۱۶۴/۱، المفہم شرح مسلم: ۱۴۳/۱، ابی مع سنوسی:۱۱۴-۱۱۵/۱، نووی:۱۴۱/۱ مصری)

بعض علماء کے نزدیک احسان سے عبادت ہی مقصود ہے جس کی دو جہات ہیں۔(۱) جہت اولیٰ سے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی حالت مفروضہ ہے اسی لئے **کانک** سے تعبیر کیا گیا ہے۔(۲) اور جہت ثانیہ میں اللہ تعالیٰ کے بندہ کو دیکھنے کی حالت چونکہ دائمی اور متحقق ہے لہذا "**فانہ یراک**" سے تعبیر کیا گیا ہے۔(تنظیم الاشتات:۲۵/۱)

ضرورت سلوک وتصوف

اسی کیفیت کا نام نسبت یادداشت ہے، اس نسبت کے حاصل ہونے کے بعد طاعات

کی رغبت اور معاصی سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور اگر کسی وقت بشری تقاضہ سے معصیت کا صدور ہو جائے، جب تک آدمی پختہ توبہ نہ کر لے اس کو چین نہیں آتا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہ نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارکہ سے حاصل ہو جاتی تھی، مگر جوں جوں دور نبوت سے بعد ہوتا گیا، اس نسبت میں اضمحلال آتا گیا، اور اس کے لئے مجاہدات کی ضرورت پیش آنے لگی، اس کے لئے مشائخ نے اذکار واشغال اور مجاہدات تجویز کئے، جس نے باقاعدہ فنی شکل اختیار کر لی جس کا نام سلوک وتصوف یا طریقت رکھا گیا، یہ سب اس صفت احسان کی تعبیرات ہیں۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہ نے فرمایا: تصوف کی ابتداء "انما الاعمال بالنیات" اور انتہاء "ان تعبداللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک" ہے، یعنی ابتداء تصحیح نیت اور انتہاء صفت احسان کا حصول ہے۔

اس صفت احسان کے حاصل ہونے کے بعد مشائخ نے دینی خدمات کے بڑے بڑے کارنامے انجام دئے، اور اگر غور کیا جائے کہ اس وقت جو دین کی بہار نظر آتی ہے وہ ان ہی مشائخ کی خدمات کا نتیجہ ہے، مگر افسوس اب اس سے بے رغبتی بڑھتی جارہی ہے۔

فاخبرنی عن الساعة: کہ ساعت کے بارے میں بھی خبر دیجئے۔

تین سوال کر چکے چوتھا سوال کیا۔ پہلے تینوں سوالوں میں مناسبت تھی، لیکن قیامت کی مناسبت پہلے تینوں کے ساتھ ظاہراً اگرچہ معلوم نہیں ہورہی ہے مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس میں عجیب وغریب مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کو جس مقصد کے لئے بنایا گیا وہ ایمان واسلام واخلاص جب تینوں حاصل ہو جاتے ہیں تو مقصد پورا ہو گیا۔ اور جب کسی چیز کے بنانے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو اس کو ختم کر دیا جاتا ہے، لہٰذا پہلے تینوں کے بعد قیامت کا ذکر مناسب ہے۔

ساعۃ کے معنی قطعۃ من الوقت اور چونکہ وقت کا اہم حصہ قیامت ہی ہے اس لئے وہی مراد ہے۔ اور قیامت کو ساعت سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ جلدی سے واقع ہو جائیگی۔ قرآن پاک میں ہے "لاتأتیکم الا بغتۃ" یا اس لئے کہ قیامت کا تمام وقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک ساعت کی طرح ہے۔ (ابی: ۱۱۶/۱، تحفۃ المرأۃ: ۱۱۰)

گذشتہ تینوں سوالات میں "مــــا" تھا اسی وجہ سے وہاں مقصود ایمان، اسلام اور احسان کی حقیقت دریافت کرنا تھا اور یہاں پر حقیقت قیامت کو دریافت کرنا نہیں بلکہ اس کے قیام کا وقت دریافت کرنا ہے مگر شارح مسلم اُبی کی رائے یہ ہے کہ مراد یہ ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماویں گے کہ نہ مجھے پتہ اور نہ آپ کو معلوم، صرف اللہ تعالیٰ ہی اس کو جانتا ہے تو لوگ قیامت سے متعلق سوال کرنے سے باز آجائیں گے۔ ورنہ تو وہ قیامت کے بارے میں بکثرت سوال کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے "یسألک الناس عن الساعۃ" یہ مقصود نہیں کہ قیامت کب آئیگی۔ (اُبی: ۱۱۶/۱، مرقاۃ: ۱/۵۵)

قولہ ما المسئول عنھا باعلم من السائل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ما انا اعلم بھا منک" کے بجائے عمومی طور پر سائل و مسئول کے عدم علم کو ثابت کیا تا کہ قیامت تک ہر سائل و مسئول اس عدم علم میں شامل ہو جائے۔ ورنہ کسی کو اس شبہ کا احتمال تھا کہ حضور اور جبرئیل کے علاوہ دوسرے کو معلوم ہوسکتا ہے۔

ما المسئول عنھا باعلم من السائل: یعنی جس طرح تمہیں قیامت کا وقت مخصوص نہیں معلوم، اسی طرح مجھے بھی قیامت کا وقت مخصوص نہیں معلوم، گویا کہ سائل و مسئول دونوں اس کا علم نہ ہونے کے سلسلہ میں برابر ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا علم کسی کو نہیں دیا ہے اور مغیبات میں سے اس کو قرار دیا ہے۔ اور مزید فرمایا ہے: "اکاد اخفیھا" (مرقاۃ: ۱/۵۴، اشعۃ اللمعات: ۱/۴۵)

المسئول کی ضمیر نائب فاعل الف لام امی کی جانب اور عنھا کی ضمیر مجرور "الساعۃ" کی جانب راجع ہے اور ما علم میں با زائدہ ہے۔(طیبی:١٠٥/١، فتح الباری:١/١٦٥)

ما امارا تھا: (اس کی علامتیں کیا ہیں؟) امارات امارۃ کی جمع ہے بمعنی علامت۔(مرقاۃ)

تو فرمایا کہ یہی انقلابات اس کی علامات ہیں، قیامت ایک بڑا انقلاب ہے یہ چھوٹے چھوٹے انقلابات ہیں۔ جب سورج نکلتا ہے تو اس سے پہلے صبح صادق نکلتی ہے جب کوئی شئ عظیم آتی ہے تو اس کے مقدمات پہلے ہی آجاتے ہیں جیسے سلطان کی سواری سے پہلے خادم وغیرہ پہلے ہی آجاتے ہیں، ایسے ہی قیامت عظیم انقلاب ہے چھوٹے چھوٹے انقلابات اس کی علامتیں ہیں۔

حقیقی معنی:- ان تلد الامۃ ربتھا الخ: کے دو مفہوم ہیں کہ جاریہ اپنی مالکہ کو جنے، یہ حقیقی معنی ہیں یعنی لڑکی اپنی والدہ کی مالکہ بن جائے کسی صورت سے جنا تو اس کو ماں ہی نے تو گویا ماں نے اپنی مالکہ کو جنا ہے۔

اور اس طرح مالک ہو جانا اس زمانہ میں کچھ مشکل بھی نہیں ۱۹۷۱ء میں لڑائی ہوئی عورتوں مردوں کو قید کیا گیا ایک پندرہ سالہ عورت کو بھی گرفتار کر لیا اس عورت کی دو تین سالہ بچی باقی رہ گئی، یہ بچی اسی ملک میں پرورش پاتی رہی دس پندرہ سال بیت گئے بال بچوں والی ہو گئی کسی دوسری جگہ رہنے لگی اچھی عمارتیں بنوالیں۔ اب پھر دوسری جنگ ہوئی تو اس کی والدہ جو اب بوڑھی ہو چکی تھی گرفتار ہو کر آئی تو اس کی لڑکی نے خرید لی والدہ تو اس کو پہچانتی نہیں چونکہ کبھی ذرا سی بچی کو دیکھا تھا اور اب یہ بھی بڑھیا ہو نیکو ہے۔ اور لڑکی بھی نہیں پہچانتی کیونکہ اس نے زمانہ ہوش میں دیکھا ہی نہیں تھا۔ تو اس صورت میں والدہ مملوک ہے اور لڑکی مالکہ ہے، کبھی اتفاق سے ذکر چلا تب خبر ہوئی۔

مجازی معنی: یہ ہیں کہ عقوق والدین کی طرف اشارہ ہے کہ بچیاں اپنی ماؤں کی ایسی نافرمانی کریں گی۔ایسا حکم چلائیں گی جیسے بادشاہ اپنی رعایا پر حکم چلاتے ہیں۔

اسمیں مختلف اقوال ذکر کئے گئے۔

(۱)......سب سے اولیٰ واضح قول یہ ہیکہ دنیا کا انتظام بگڑ جائیگا اصول بمنزلہ فروع ہوجائیں گے اور فروع بمنزلہ اصول کے، یعنی معاملہ نااہل کے سپرد ہوجائیگا۔ جیسے دوسری حدیث میں ہے کہ:**اذا وسد الامر الی غیر اهله فانتظر الساعة.**

(۲)......عقوق والدین کی طرف اشارہ ہے کہ اولاد اپنے والدین سے ایسی خدمت لینا شروع کریگی جیسے باندیوں سے لیجاتی ہے اور سب وشتم اور اہانت سے پیش آئیگی۔

(۳)......باندی زادے حکومت کے مالک ہوجائیں گے تو ان کی والدہ بھی ان کی رعیت میں ہوگی اور وہ مولی ہوگا۔

(۴)......قرب قیامت میں باندی کی کثرت اولاد ہوگی حتی کہ ماں اپنے بیٹے کی باندی کی طرح ہوگی۔کیونکہ باپ کے مرنے کے بعد وہ وراثۃً مالک ہوگا۔

(۵)......اس سے فساد حال کی طرف اشارہ ہے کہ امہات اولاد کی بیع وفروخت شروع ہوجائے گی۔حتی کہ ہاتھ در ہاتھ جاتے جاتے لڑکا اپنی ماں کو خرید کرے گا اور وہ مملوکہ کی طرح برتاؤ کریگا۔

رب سے مراد مربی ہے اور اس کو نسمۃ ذی روح کی تاویل میں کر کے مؤنث لائے ہیں۔ چونکہ مذکر ومؤنث دونوں کو شامل ہے اور فساد احوال پر دال ہے کہ معاملہ برعکس ہوجائیگا۔کہ سافل عالی اور عالی سافل بن جائیگا۔(فتح الباری:۱/۱۶۸،اُبّی:۱/۱۱۸)

حفاۃ: جمع ہے حافی کی (ننگے پیر) کہ جن کو جوتا بھی پہننے کو میسر نہیں۔

عراۃ: جمع ہے عاری کی (ننگے بدن) کہ کبھی کپڑے بھی بدن چھپانے کو نہیں ہوتے۔

عالۃ: جمع ہے عائل کی (فقیر) بالکل نادار قسم کے لوگ۔

رعاۃ[1]: جمع ہے راعی کی (چرواہا)

الشاء: جمع ہے شاۃ کی (بکری)

قولہ یتطاولون فی البنیان: اونچی اونچی عمارات بنائیں گے اور ان کے حسن وزینت سے ایک دوسرے پر فخر وبڑائی کرینگے۔ خلاصہ یہ ہے کہ رذیل اور ان پڑھ جاہل نالائق قسم کے لوگوں کے لئے ہر اعتبار سے دنیاوی ترقی ہوگی۔ ملک وبادشاہت ان کو مل جائے گی۔ اور شریف لوگ ان کے زیر دست ہو جائیں گے۔ الغرض معاملہ بالکل پلٹ جائے گا۔

اس تمثیل سے ایک کلیہ نکلا کہ جب یہ چھوٹے چھوٹے انقلابات آرہے ہیں تو ضرور ایک بڑا انقلاب بھی آئیگا اگر صبح صادق ہوگی تو سورج بھی نکلے گا۔ تو یہ کل پانچ سوال ہوئے جن سے سارے مدرسہ کے امتحان کی سنت بھی نکل آئی کہ پانچ سوال کرو، تین لازمی۔

تو انہوں نے پانچ سوال کئے سب سنتے رہے آپ کی مجلس میں خاموش سناٹا ہوتا تھا جب ایک آدمی گفتگو کرتا تو سب خاموشی سے سنتے رہتے۔

فلبثت ملیا: بعضوں نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ تین دن تک ٹھہرے رہے حضرات صحابہؓ کی عادت تھی کہ علم کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف منسوب کردیتے تھے۔ ایسے ہی حضرت عمرؓ نے بھی عادت کے موافق علم کو آپ کی طرف منسوب کردیا کہ اگر مصلحت مقتضی ہو تو فرمادیجئے ورنہ نہیں۔ یہ نہیں کہ بتلانا ہی ہوگا۔

---

[1] رعاۃ: اس لفظ کو دو طرح سے ضبط کیا گیا ہے۔

(۱) راء کے ضمہ اور آخر میں تاء مدورہ کے ساتھ یعنی رُعاۃ۔

(۲) راء کے کسرہ اور آخر میں ہمزہ کے ساتھ رِعاۃ۔ (نووی:۱/۱۴۳)

فَلَبِثْتُ مَلِیًّا: بعض روایات میں متکلم کے صیغہ کے ساتھ ہے اور فاعل حضرت عمرؓ ہیں اور بعض روایات میں "فلبث" غائب کا صیغہ ہے۔ (نووی: ۱/۱۴۳) اور دونوں ہی روایت درست ہیں۔

"ملیا" کے معنی زمن طویل کے ہیں۔ لیکن چونکہ بعض روایات میں تین دن کی صراحت ہے اسی وجہ سے بعض علماء نے یہ تفسیر کی ہے۔ لیکن اسپر اشکال یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ بھی اس روایت کے راوی ہیں انکی روایت میں ہے کہ وہ شخص سوالات دریافت کر کے فوراً چلا گیا۔

امام نوویؒ نے ان دونوں روایات میں یہ تطبیق دی ہیکہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہوگا تو حضرت عمرؓ مجلس میں موجود نہ ہونگے کہیں چلے گئے ہونگے۔ حاضرین سے آپ نے فوراً فرمادیا اور حضرت عمرؓ کو پھر تین دن بعد بتایا۔ (نووی: ۱/۱۴۳)

هذا جبرئیل اتاکم یعلمکم دینکم: یہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں جو تمہارے پاس تمہارا دین سکھانے کے لئے آئے ہیں۔

"اتاکم یعلمکم دینکم" اس سے مراد دین کے قواعد کلیہ ہیں چونکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سوال کرنے کی وجہ سے لوگوں کو ان باتوں کا علم ہوا تھا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی نسبت مجازاً حضرت جبرئیلؑ کی جانب کر کے فرمایا کہ تم کو تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔ اور اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ دین نام ہے اسلام، ایمان اور احسان کے مجموعہ کا، البتہ کبھی کبھی اس کا اطلاق خاص طور پر اسلام پر بھی ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے **"ان الدین عند الله الاسلام" "ومن یبتغ غیر الاسلام دینا" "فلن یقبل منه"** (اشعة اللمعات: ۱/۴۷، مرقاة: ۱/۵۷)

رواه مسلم: اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

رواه مسلم: حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت متعدد صحابہؓ کرام مثلاً

حضرت عمرؓ، ابو ہریرہؓ، ابوذرؓ، انس بن مالکؓ، وغیرہ سے وارد ہوئی ہے لیکن حضرت عمرؓ کی روایت کو صرف مسلم نے روایت کیا ہے۔ بخاری نے اس کو ذکر نہیں کیا، اس لئے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب کی روایت کے راویوں میں اختلاف ہے، حتی کہ بعض رواۃ نے حضرت عمرؓ کے بجائے حضرت ابن عمرؓ کی روایت اس کو قرار دیا ہے۔ (فتح الباری: ۱/۱۵۶)

الصُمَّ، البُکمَ مُلوکَ الاَرْضِ: بہرے گونگے قسم کے لوگ زمین کے بادشاہ ہونگے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جاہل ان پڑھ قسم کے لوگ محض مال و دولت کی بنیاد پر بادشاہ بنیں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ مصیبت زدہ مظلوم کتنی ہی فریادیں کریں کتنا ہی روئیں چلائیں۔ مگر وہ سنیں گے ہی نہیں۔ اور سنی ان سنی کردیں گے۔ کہ ان کی حمایت میں کوئی لفظ نہیں بولیں گے۔ گویا بالکل گونگے ہی ہیں۔

الصم البکم: یعنی وہ اپنی سماعت اور زبان کو دین کے کاموں میں استعمال نہیں کرتے جس کی وجہ سے وہ کانوں کے باوجود بہرے، زبان کے باوجود گونگے ہیں۔ جس طرح قرآن پاک میں ہے: "صم بکم عمی فهم لایرجعون" اور دوسری جگہ اس کی وضاحت ہے "لهم قلوب لایَفْقَهُون بها ولهم اعین لا یبصرون بها و لهم آذان لا یسمعون بها أُلئک کالانعام بل هم اضل" (المفہم: ۱/۱۴۹، مرقاۃ: ۱/۵۷)

"ملوک الارض" منصوب ہے مفعول ثانی یا حال ہونے کی وجہ سے، اسی طرح "فی خمس" بھی حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ (مرقاۃ: ۱/۵۷)

اور مطلب یہ ہے کہ "تراهم ملوک الارض متفکرین فی خمس" یعنی جاہل اور شریعت کے احکام سے عاری لوگ زمین کے حاکم ہونگے اور ان پانچ چیزوں کے بارے میں غور و فکر کریں گے جس سے کچھ نتیجہ حاصل نہ ہوگا۔ یا مطلب یہ ہے: "ما المسئول عنها باعلم من السائل فی خمس" یعنی پانچ چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق ہم دونوں علم میں

برابر ہیں اسلئے کہ انکا علم ذات باری کے ساتھ مخصوص ہے۔(مرقاۃ:۱/۵۷، طیبی:۱/۱۰۸)

"وماتدری نفس ماذا تکسب غدا" یہاں پر سوال یہ ہیکہ آیت میں پانچ چیزوں کا تذکرہ ہے۔پہلی تین چیزوں کے علم کو اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت کیا گیا ہے اور بعد کی دو چیزوں کے علم کی بندے سے نفی کی گئی ہے۔اس اثبات سے نفی کی جانب رجوع میں کیا نکتہ ہے؟ اسکا جواب یہ ہیکہ یہاں مبالغہ اور تعمیم مراد ہے کیونکہ بعد کی دونوں چیزوں کے متعلق مادہ ''درایت'' کا استعمال کیا گیا ہے اور درایت کہا جاتا ہے۔"اکتساب علم الشئ بحالة" اور یہ اکتساب انسانی خصوصیات میں سے ہے تو جب وہ چیزیں جن کا تعلق انسان کے ساتھ ہے ان کو انسان نہیں جان سکتا تو پھر قیامت وغیرہ کے بارے میں کیسے جان سکتا ہے۔(فتح الباری:۱/۱۶۹، تنظیم الاشتات:۱/۳۷، طیبی:۱/۱۱۰)

الآیة: کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کو آخر تک پڑھتے جاؤ۔یہ منصوب ہے اور کسی راوی کا قول ہے ورنہ تو مسلم کی روایت میں پوری آیت "خبیر" تک موجود ہے۔(مرقاۃ:۱/۵۸)

غیث: وہ بارش جو رحمت کے ساتھ ہو۔

رحم: کوئی نہیں بتلا سکتا کہ رحم میں کیا ہے؟ (ارحام رحم کی جمع ہے)

اگر آلات ایجاد بھی کرلیں اور سمجھ لیں کہ بچہ موجود ہے مگر یہ نہیں بتلا سکتے کہ مرد ہے یا عورت۔اگر یہ بھی بتلادیں تو نہیں بتلا سکتے کہ زندہ پیدا ہوگا یا مردہ۔اگر یہ بھی بتلادیں تو یہ نہیں بتلا سکتے کہ کب تک زندہ رہیگا۔نہرو کہکر آیا کہ ابھی بیس سال تک زندہ رہوں گا رات ہی کو ملک الموت آگئے۔

"متفق علیه" یعنی حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت کو بخاری اور مسلم دونوں نے ذکر کیا ہے مگر میرک شاہ نے اس مقام پر یہ فرمایا ہے کہ ابو ہریرہؓ کی یہ روایت ہے تو متفق علیہ مگر اس کے بعض الفاظ بخاری میں مختلف ہیں۔مثلاً "الصم البکم ملوک الارض" کے

بجائے بخاری کتاب الایمان میں ہے:"اذا تطاول رعاة الابل البھم فی البنیان" اور کتاب التفسیر میں ہے:"اذا کان الحفاة العراة رؤوس الناس." (مرقاۃ:۱/۵۸)

فوائد

حدیث کے اہم لفظی ومعنوی مباحث مناسب وضاحت کے ساتھ آجانے کے بعد اس حدیث سے مستنبط ہونے والے فوائد کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱)......حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سفید لباس زیادہ پسند تھا۔روح القدس سفید لباس میں بحیثیت سائل وطالب کے آئے۔اس سے یہ بات نکلی کہ طالب علم کو لباس وغیرہ میں اپنے استاذ کے محبوب انداز کو اختیار کرنا چاہئے۔

(۲)......حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بالوں کی شدت سواد سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ طالب علم کا اصل زمانہ جوانی کا دور ہے۔جب کہ جوانی،قوت وطاقت پر ہوتی ہے۔

(۳)......طالب علم کو اپنے معلم ومربی کا مجلس میں ظاہری قرب بھی حاصل کرنا چاہئے۔

(۴)......متعلم کی نشست کی ہیئت اپنے استاذ کے سامنے متأدبانہ ہونی چاہئے،جیسا کہ التحیات پڑھنے کے لئے بیٹھتا ہے۔

(۵)......انسان کا ظاہر تعلیمات شریعت کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

(۶)......عقائد ونظریات بھی علوم نبوت کے موافق رکھنا لازم ہے۔

(۷)......احسانی کیفیت پیدا کرنا اور باطن کی تعمیر کرنا بھی مطلوب ہے۔

(۸)......جس بات کی حقیقت کا علم نہ ہو اس کے متعلق معلم ومفتی کو"لا ادری" کہنے سے ہرگز ہچکچاہٹ نہ ہونا چاہئے۔"لقوله علیه السلام ما المسئول عنها الخ."

(۹)......علم غیب وعلم محیط صرف باری تعالیٰ کی شان ہے۔

(۱۰)...... مستحسن سوالات کرنا پسندیدہ امر ہے۔"کما قیل حسن السوال نصف العلم."

(۱۱)...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً فرمایا ہے کہ "اتاکم یعلمکم دینکم" اس سے معلوم ہوا کہ یہ سوال وجواب تعلیم حقائق دینیہ کیلئے ہوئے ہیں۔ تعلیمی مجلس میں ہر چیز کی حقیقت سمجھنا مقصود ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایمان واسلام کے حقیقی مفہوم وہی ہیں جو اس حدیث میں بیان کئے گئے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ: ایمان نام ہے انقیاد باطنی کا، جب کہ اسلام نام ہے انقیاد ظاہری کا۔ حقیقتیں یوں ہی ہیں، گو ان دونوں میں باہمی گہرا ارتباط ہے۔ جس کی وجہ سے تجوزاً ہر ایک کا اطلاق دوسرے پر ہوسکتا ہے۔

(۱۲)...... کسی مقصد حسن کے لئے اخفاء وتعمیہ کرنا اور اپنی شخصیت کو چھپانے کی سعی کرنا جائز ہے۔"کما فعل جبرئیل علیہ السلام"

(۱۳)...... طاعات سب اہم ہیں، لیکن تفسیر اسلام میں ذکر کی گئی باتیں اہم الطاعات ہیں۔

(۱۴)...... ملائکہ کا وجود برحق ہے۔

(۱۵)...... فرشتے صور مختلفہ میں متمثل ہو سکتے ہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام عام طور پر حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں آتے تھے۔ اس دفعہ غیر معروف صورت میں آئے ہیں۔ صرف دو مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو اصلی شکل میں دیکھا ہے۔

(۱۶)...... بنا بر جامعیت یہ حدیث "ام السنة" کہنے کے لائق ہے۔ (عمدۃ القاری: ۱/۲۹۱)

(۱۷)...... دار دنیا میں ظاہری آنکھوں سے باری تعالیٰ کی رویت واقع نہیں ہوگی۔ مسلم شریف میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مرفوع ہے۔"واعلموا انکم لن تروا ربکم حتی تموتوا" اسی لئے تفسیر احسان میں "کانک تراہ" فرمایا ہے۔ آخرت میں رویت بالابصار کا وقوع ہوگا۔ (عمدۃ القاری: ۱/۲۹۱)

﴿اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے﴾

﴿۴﴾ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ، شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حوالہ: بخاری شریف: ص ۶/ج ۱، باب بنی الاسلام علی خمس، کتاب الایمان، عالمی حدیث نمبر: ۸، مسلم شریف: ص ۳۲/۱، بیان ارکان الاسلام، کتاب الایمان،

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ (۱) اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ (۲) نماز قائم کرنا۔ (۳) زکوۃ ادا کرنا۔ (۴) حج کرنا۔ (۵) رمضان کے روزے رکھنا"۔

تشریح: اس حدیث کو ابن عمر[1] نے روایت فرمایا ہے۔

---

[1] **حالات ابن عمر:** حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے ایک سال قبل پیدا ہوئے، اور ۷۳ھ میں چوراسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ نے بچپن میں ہی اسلام قبول کرلیا تھا۔ اور آپ نے والد کے ساتھ مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کی تھی جنگ احد میں صغر سنی کی وجہ سے شرکت سے روک دیئے گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد غزوۂ خندق اور اس کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے۔ نہایت متقی اور زاہد، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر چیز میں اتباع پیش نظر رکھتے تھے آپ کی مرویات کی تعداد (۱۶۳۰) ہے۔ اور "اعلم الصحابة بمناسک الحج" کے نام سے مشہور رہیں اور کنیت ابوعبد الرحمٰن ہے۔ (وفیات الاعیان: ۲۸-۳۱/۱، مرقاۃ: ۵۹/۱، تحفۃ المرأۃ: ۱۱۲-۱۱۳)

عنهما: میں ضمیر تثنیہ اس وجہ سے لائے کہ حضرت عمر اور عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما دونوں صحابی ہیں تا کہ دونوں کی طرف ضمیر لوٹ جائے اور دعاء میں دونوں شریک ہوں۔

بنی الاسلام علی خمس: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔

چند اصول کے جاننے کا نام اسلام ہے اور چونکہ وہ معقول ہیں اس لئے ان کو تشبیہ دی محسوس کے ساتھ اس میں اس بات کیطرف اشارہ ہے کہ ان باتوں کا تعلق اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے ہے جو کہ معقولی ہیں۔

اور دونوں چیزوں کا اس طرح دل میں یقین ہو جیسا کہ دیکھی ہوئی شئی کا ہوتا ہے۔

بنی الاسلام: اسلام مشبہ ہے مکان اور خیمہ مشبہ بہ مکان اور خیمہ کا وقایہ عن البرد والحر ہونا وجہ تشبیہ ہے۔

جس طرح مکان اور خیمہ انسان کی سردی گرمی سے حفاظت کرتا ہے۔ سردی و گرمی حد اعتدال تک تو مضر نہیں لیکن حد اعتدال سے بڑھی ہوئی نقصان دیتی ہے۔

تو مکان اور خیمہ جس طرح سردی گرمی سے حفاظت کرتا ہے دشمن سے حفاظت کرتا ہے اسی طرح اسلام بھی پریشانیوں مصیبتوں فتنوں جہنم کے عذابات قبر کے عذابات اور محشر کی رسوائیوں سے روکتا اور بچاتا ہے اسی طرح داخلی دشمن نفس امارہ خارجی دشمن شیطان کے حملوں سے حفاظت کرتا ہے۔

لہٰذا اسکو ہر اس شئی سے تشبیہ دیجا سکتی ہے جس میں وقایہ ہونا پایا جائے، محل و خیمہ وغیرہ۔

مشبہ بہ مکان اور خیمہ و جہ تشبیہ حرف تشبیہ سب کو حذف کر دیا اس وجہ سے یہ استعارہ بالکنایہ ہے اور استعارہ تخییلیہ بھی ہے۔

چونکہ مشبہ بہ مکان اور خیمہ کے لازم کو (جو کہ بنیاد ہے مکان کے لئے اور اطناب وعمود ہیں خیمہ کے لئے اور بنیاد مکان کے لئے اور اطناب وعمود خیمہ کے لئے ضروری ہوتی ہے)

اسلام کیلئے ثابت کیا ہے۔

استعارہ تخییلیہ: مشبہ کے لئے مشبہ بہ کے لازم کو ثابت کرنے کا نام استعارہ تخیلیہ ہے اور اس میں استعارہ ترشیحیہ بھی ہے۔

کیونکہ بنیاد جو مکان کیلئے مناسب ہوتی ہے اس کو اسلام کیلئے ثابت کیا ہے استعارہ ترشیحیہ مناسب مشبہ بہ کو مشبہ کے لئے ثابت کرنیکا نام استعارہ ترشیحیہ ہے۔

اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ استعارہ تمثیلیہ ہے کیونکہ اسلام کو اپنے ارکان خمسہ کے ساتھ اس خیمہ کے مماثل قرار دیا گیا ہے جس کے پانچ ستون ہوں۔ درمیانی عمود تو کلمۂ شہادت ہے اور باقی چاروں ارکان اس طرح ہیں جیسے خیمہ کے لئے اطناب ہوتے ہیں۔ (قسطلانی:۱/۱۵۳)

یہ کلام ان تینوں استعاروں پر مشتمل ہے جو کلام کے منقح اور ابلغ ہونیکی دلیل ہے۔

بنی الاسلام علی خمس اجمال ہے۔

"**علی خمس**" اس لفظ کو روایات میں دو طرح پر ضبط کیا گیا ہے خمس اور خمسۃ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ دونوں روایات درست ہیں خمس کی صورت میں مطلب ہوگا **خمس خصال او دعائم او قواعد** وغیرہ اور خمسۃ کی صورت میں **خمسۃ ارکان خمسۃ اشیاء** وغیرہ ہوگا۔ (نووی:۱/۱۵۹)

شانِ ورود

اس روایت کا شان ورود مسلم شریف میں بعض روایات میں ذکر کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے (جسکا نام حکیم تھا) حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے دریافت فرمایا تھا "الاتغزو" اسکے جواب میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یہ روایت ارشاد فرمائی۔

البتہ اس روایت میں جہاد کا تذکرہ نہیں کیونکہ وہ فرض کفایہ ہے فرض عین نہیں ہے یہ بات دیگر ہے کہ بعض احوال میں فرض عین بھی ہو جاتا ہے۔ اور یہ پانچ چیزیں ان لوگوں پر فرض عین ہیں دائمی حالات میں، جن کے اندر ان کی شرائط پائی جائیں۔

نیز ایک جماعت کی رائے یہ بھی ہے کہ فتح مکہ کے بعد جہاد کی فرضیت ختم ہو چکی ہے لیکن اگر دشمن ہی ہم پر حملہ کردے یا امام کی جانب سے جہاد کا حکم ہو تو پھر اس پر عمل ضروری ہو جاتا ہے اور حضرت ابن عمرؓ کو بھی اسی جماعت میں شمار کیا گیا ہے۔ اور ان کا سائل کے جواب میں جہاد کا ذکر نہ کرنا اور یہ روایت بیان کرنا بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ (المفہم شرح مسلم:۱۶۸/۱، فتح الباری: ۱/۷۳)

شهادة الخ: سے تفصیل ہے۔

فصاحت و بلاغت کی اہمیت

اس سے معلوم ہوا کہ جب کلام کرو تو پہلے اجمالاً مقصد ذکر کرو پھر تفصیل سے بیان کرو چونکہ تفصیل بعد الاجمال اوقع فی النفس ہوتی ہے اور حدیث شریف کی یہی سنت تفصیل بعد الاجمال ہے تو کلام فصیح کرنا بلیغ کرنا یہ بھی سنت ہے یوں نہیں کہ ویسے ہی پھس پھسا کلام کرے، نہیں، بلکہ کوئی بات سمجھانے کے لئے الفاظ بھی بلیغ ہونے چاہئیں۔

اور بلاغت بغیر تلخیص مختصر وغیرہ پڑھے نہیں آتی اسلئے ان کا پڑھنا بھی سنت ہوا اور بلاغت سے متعلق دیگر کتب مقامات وغیرہ کو اس نیت سے اگر پڑھا کہ ہمارا ذوق عربوں کے مشابہ ہو جائے تاکہ ہم کلام اللہ شریف اور فقہ کے نکات و باریکیوں سے واقف ہو سکیں تو یہ بھی سنت ہے۔ چونکہ سنت کا موقوف علیہ بھی سنت ہو گا۔

لفظ شہادۃ میں تین صورتیں

لفظ شہادۃ کے اعراب میں تین صورتیں ہیں، اس کو تین طرح پڑھا جا سکتا ہے۔

صــــورت اول: شہادۃ سے تفصیل شروع ہوتی ہے اسکو مجرور پڑھنا بھی درست ہے خمس کا بدل ہونے کی وجہ سے اور بذریعہ عطف اگلے جملے بھی مجرور ہیں۔

صــورت ثــانــی: اور اس کو مرفوع بھی پڑھ سکتے ہیں مگر اس وقت محذوف کا ارتکاب لازم آئیگا۔ اگر آپ اختصار پسند ہیں تو شہادۃ کے شروع میں ہی نکال لو اور اگر تفصیل طلب ہو تو احدھا، ثانیھا وغیرہ نکالنا پڑیگا۔ اور اس صورت میں ہر معطوف کے اول میں مبتدا محذوف ماننا پڑیگا۔ اور مرفوع پڑھنے کی صورت میں اس کی خبر کو بھی محذوف مانا جا سکتا ہے اور عبارت ہوگی ''شهادة ان لااله الا الله''. (فتح الباری:۱/۷۳)

صورت ثالث: اس کو منصوب بھی پڑھ سکتے ہیں اسلئے کہ اخف الحرکات فتحہ ہوتا ہے اس صورت میں بھی محذوف ماننا پڑیگا۔ اور اعنی فعل محذوف شروع میں نکالا جائیگا۔

تینوں صورتوں میں افضل صورت اولی ہے کیونکہ اس صورت میں کوئی محذوف ماننا نہیں پڑتا اور جس صورت میں محذوف ماننا نہ پڑے وہ بہتر ہوتی ہے اس صورت سے جس میں محذوف کا ارتکاب کیا جائے۔

حضرت شیخ الادبؒ کا ارشاد

شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب قدس سرہ استاذ دارالعلوم دیوبند فرمایا کرتے تھے کہ محذوف کا ارتکاب ایسا ہے جیسا مردار کھانا اور مردار مخمصہ کی حالت میں جائز ہے لہذا محذوف بھی مجبوری کی حالت میں ماننا چاہئے۔

اور جس طرح لفظ شہادۃ میں یہ تین صورتیں ہیں اسی طرح اس کے بعد معطوفات اربعہ میں بھی یہی تین صورتیں ہیں۔

اشکال مع جواب

اشــکــال: اس حدیث پر ایک اشکال ہوتا ہے کہ حدیث جبرئیل میں ایمان بالانبیاء، ایمان بالملائکہ وغیرہ کو بھی ذکر کیا گیا تھا یہاں پر اس کا تذکرہ نہیں ہے؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں شہادت سے مراد "تصدیق الرسول فیما جاء به" ہے لہٰذا حدیث جبرئیل میں مذکور تمام چیزیں بھی اس میں آ گئیں۔ اور علامہ اسماعیلیؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ "تسمیة الشی ببعضه" کی قبیل سے ہے۔ جس طرح سے کہا جاتا ہے کہ میں نے "الحمد" پڑھی۔ اور مراد پوری سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ہوتا ہے اسی طرح یہاں پر بھی بعض چیزوں کا تذکرہ ہے۔ اور تمام ایمانیات مراد ہیں۔ (فتح الباری: ۱/۷۳)

رہی یہ بات کہ اسلام کی بنیاد مذکورہ پانچ چیزیں ہی کیوں ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ عبادت یا تو قولی ہوگی یا نہیں۔ اگر قولی ہے تو وہ شہادت ہے۔ اور اگر غیر قولی ہے تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو وہ ترکی ہے یا فعلی ہے۔ اگر ترکی ہے تو اس کو صوم سے تعبیر کرتے ہیں اور اگر فعلی ہے تو پھر یا تو بدنی ہے یا مالی ہے یا ان دونوں سے مرکب ہے بدنی نماز ہے اور مالی عبادت زکاۃ ہے اور حج ان دونوں سے مرکب ہے۔ (قسطلانی: ۱/۱۴۲)

تو قلعہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں اسلام کو خیمہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو پانچ ستون پر قائم ہو جن میں سے وہ قطب جو خیمہ کے درمیانی ستون کی طرح ہے وہ شہادت ہے اور باقی چاروں شعبے اوتاد کی طرح ہیں۔ کیونکہ خیمہ میں ایک قطب (عمود) ہوتا ہے اور باقی

چار چیزیں اطناب ہوتی ہیں۔اور یہ بات درست نہیں کہ اس روایت میں اسلام کو مکان سے تشبیہ دی گئی ہو کیونکہ مکان کی چار بنیادیں ہوتی ہیں پانچ نہیں۔(طیبی:۱/۱۱۱)

یہی تو وجہ ہے کہ درمیانی عمود جب تک باقی ہے اسلام کا لفظ صادق آتا ہے چاہے اعمال میں کوتاہی ہو۔لیکن اگر عمود ہی گر جائے تو خیمہ ہی باقی نہیں رہتا اسی طرح اگر شہادت نہ ہو تو اسلام بھی باقی نہیں رہتا۔(فتح الباری مع زیادۃ:۱/۷۲)

اول تو الوہیت خداوندی اور رسالت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت یہ اسلام کا اعلیٰ ترین عنصر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی الوہیت جو کہ معقولی شئ ہے اس کا یقین محسوس کی طرح ہو جائے جیسے دیکھی ہوئی شئ کا یقین ہوتا ہے ذرا بھی شک وشبہ نہیں رہتا اسی طرح اللہ تعالیٰ کی الوہیت ذہن میں راسخ ہو جائے۔

اور ایسا ہی یقین حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ہو جائے تو اس شہادت سے یہ ظاہر ہوا کہ الوہیت ورسالت کا یقین شئ محسوس کی طرح ہو جائے اور زبان سے اس کا اقرار واظہار ہو۔

اللہ کا الٰہ ہونا بھی بدیہی ہے اور رسالت نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی بدیہی ہے ایسی بدیہی؟ جو محسوس کی طرح ہوں۔دنیا میں وہ کونسا مذہب ہے جو ایسی بدیہیات کی دعوت دے سوائے اسلام کے۔جب الوہیت ورسالت سے انسان کو نوازا گیا اور اس نے ان دونوں کو اپنا لیا تو اب ضرورت پڑتی ہے دوسرے احکام کی جو از قبیل اعمال ہیں۔لہٰذا ان کو ذکر کیا۔

و اقام الصلوۃ الخ:[1] شہادت الوہیت ورسالت کے بعد دوسرے ارکان میں

[1] اقام: باب افعال کا مصدر ہے جس میں عین کلمہ (واو) کو حذف کر کے اس کے عوض آخر میں تا لا کر "اقامۃ" استعمال کیا جاتا ہے مگر اس مقام پر طول عبارت کی وجہ سے اس تا کو حذف کر دیا گیا ہے۔(مرقاۃ:۱/۵۹) کیونکہ مضاف الیہ واحد وہ کا عوض بننے کے لئے کافی ہے۔(تحفۃ المرأۃ:۱۱۳)

سے صلوۃ کا درجہ ہی اعلیٰ ہے اور ایسا قانون عام ہے جو کسی صورت بھی عاقل بالغ سے جدا نہیں ہوتا سفر ہو حضر ہو صحت ہو بیماری ہو امیری ہو غریبی ہو ہر حال میں نماز شامل ہے ہاں یہ الگ بات ہے کہ حضر میں چار رکعات اور سفر میں دو کا حکم دیدیا ہے۔ مجبوری کی حالت میں بیٹھ کر اشارہ سے بھی اجازت ہے۔

برخلاف زکوٰۃ کے کہ سب انسانوں کو شامل نہیں۔ وہ انہیں پر ہے جو نصاب کے مالک ہوں اور سال بھر بھی اس پر گذر جائے۔

حج اسی پر ہے جو اتنی استطاعت رکھتا ہو کہ آسانی وہاں پہنچ سکے۔

روزے بھی سال بھر میں صرف ایک ہی مرتبہ آتے ہیں اور وہ بھی مسافروں کو شامل نہیں۔

نماز! جامع العبادات

بڑے بڑے فلاسفہ عبادت کا نماز جیسا طریقہ نہ کبھی پیش کر سکے اور نہ پیش کر سکتے ہیں کوئی حصۂ بدن اور شعبۂ جسم ایسا نہیں جو نماز میں عبادت نہ کرتا ہو پورے اعضائے انسانی وقت صلاۃ عبادت میں مشغول ہوتے ہیں۔

تکبیر اس میں تہلیل اس میں، ذکر اس میں فکر اس میں، نظر اس میں، قراءۃ اس میں، قیام اس میں رکوع و سجدہ اس میں، اس طرح نماز تمام مخلوقات کی عبادتوں کو جامع ہے، چونکہ دیگر مخلوقات میں کوئی قیام میں ہے، کوئی رکوع میں، کوئی سجدہ میں، اسی طرح ملائکہ بھی جب سے ان کو پیدا کیا گیا ہے بعض قیام میں ہیں، جو قیامت تک قیام ہی میں رہیں گے، بعض رکوع اور بعض سجدہ میں ہیں، جو قیامت تک رکوع اور سجدہ ہی میں رہیں گے، اس طرح نماز جامع العبادات ہوئی۔ اور پہلے انبیاء کی نمازیں بھی اتنی جامع نہ تھیں۔ کیونکہ بعض میں قیام نہ تھا بعض میں رکوع نہ تھا اسی طرح جب انسان سجدہ کرتا ہے رکوع کرتا ہے سر پر جتنے بال ہیں

مثلاً ایک لاکھ وہ سب سجدہ کرتے ہیں اور ایک نیکی دس شمار کیجاتی اس اعتبار سے دس لاکھ سجدے ہوتے ہیں تو بتلایئے اسی ایک سنت میں کتنا بڑا راز مضمر ہے تبھی تو تمام انبیاء علیہم السلام بال رکھتے تھے۔

و ایتاء الزکوۃ: یہ اسلام کا تیسرا رکن ہے[1]۔

---

[1] اس روایت میں شہادت کو بقیہ ارکان اربعہ پر مقدم کیا گیا ہے اس لئے کہ وہی اصل ہے اس کے بعد نماز کا تذکرہ ہے کیونکہ نماز ہی عماد اعظم ہے حتی کہ حدیث شریف میں ہے "وعمودها الصلوة" و "الصلوة عماد الدین" وقال تعالٰی "ان الصلوة تنهی عن الفحشاء والمنکر" اسی وجہ سے نماز کو ام العبادات بھی کہا جاتا ہے جس طرح سے خمر کو ام الخبائث کہا جاتا ہے پھر زکوۃ کا ذکر ہے کیونکہ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر زکوۃ کو نماز کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے نیز اس وجہ سے بھی کہ نماز بدنی عبادت ہے تو زکاۃ مالی عبادت ہے اور ان دونوں کے درمیان مناسبت ہے۔ پھر حج کو لائے ہیں کیونکہ یہ عبادت بدنیہ اور مالیہ کا مجموعہ ہے نیز بعض روایات میں یہاں تک آیا ہے کہ اگر زاد و راحلہ پر قدرت کے باوجود بلاعذر کے حج نہیں کیا تو چاہے یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر وفات پائے۔ گویا اس کے سوء خاتمہ کا خدشہ ہے۔ (پھر روزہ کا تذکرہ ہے جو ایک اہم عبادت ہے اور شہوت بطن اور شہوت فرج کو توڑتا ہے) اور بعض روایات میں صوم کو حج پر مقدم کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ فرضیت صوم فرضیت حج پر مقدم ہے اس لئے صوم کو حج پر مقدم کیا گیا ہے۔ کیونکہ صوم کی فرضیت ۲ھ میں ہے اور حج کی فرضیت میں ۹ھ تک کا قول ہے۔ (مرقاۃ: ۱/۶۰)

تنبیہ: جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا کہ بعض روایات میں صوم رمضان مقدم ہے اور حج مؤخر ہے اور دونوں قسم کی روایات مسلم شریف میں موجود ہیں لیکن اس میں یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عمرؓ نے روایت کرتے ہوئے فرمایا "وصیام رمضان والحج" یعنی صیام رمضان کو مقدم کیا تو ایک شخص (جن کا نام یزید بن بشر السکسکی تھا) نے دریافت کیا "الحج وصیام رمضان" یعنی حج کو مقدم کر کے روایت بیان کر سکتے ہیں یا نہیں تو حضرت ابن عمرؓ نے نکیر فرمائی اور فرمایا کہ "صیام رمضان والحج هکذا سمعته من رسول الله صلی الله علیه وسلم" یعنی میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے صیام رمضان کو مقدم سنا ہے۔ لہذا تم بھی اسی کو مقدم کر کے روایت کرو۔

اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب صیام رمضان کو مقدم بیان کیا گیا ہے اور حج کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد میں بیان کیا ہے اور ابن عمرؓ اس کے خلاف روایت پر نکیر فرما رہے ہیں پھر بعض روایات میں تقدیم حج علی الصوم کیسے وارد ہو گیا۔ جبکہ دونوں قسم کی روایات صحیح ہیں۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ ایک قانون ہے کہ جب اس قدر مال ہو جائے تو اس قدر اس میں سے نکال کر غرباء فقراء اور مساکین پر خرچ کیا جائے۔ اس قانون کو بنے ایک سو نہیں چودہ سو برس بیت گئے مگر ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کی نوبت آئی۔

کیا یہ بات اس پر دلالت نہیں کرتی کہ یہ قانون انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے بنائے ہوئے قانون تبدیلی اختیار کرتے رہتے ہیں آج بنا کل ٹوٹا کل بنا پرسوں ٹوٹ گیا۔ قس علی هذا.

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) امام نووی فرماتے ہیں کہ ممکن ہے حضرت ابن عمرؓ نے اس روایت کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دو مرتبہ سنا ہو ایک مرتبہ تقدیم حج کے ساتھ اور ایک مرتبہ تقدیم صیام کے ساتھ۔ اور ان دونوں وجود کے اعتبار سے وہ روایت کرتے ہوں لیکن یزید بن بشر نے حج کو صیام پر مقدم کیا تو حضرت ابن عمرؓ کے دوسری روایت یاد نہیں رہی اور آپؓ نے یزید بن بشر پر نکیر فرمادی، یا اس وجہ سے کہ جب ابن عمرؓ نے تقدیم صیام علی الحج کے ساتھ بیان کی پھر یزید بن بشر نے تقدیم الحج علی الصیام کر کے سوال کیا تو حضرت نے فرمایا کہ بھئی جس طرح میں نے تم سے روایت بیان کی ہے اس طرح سے بیان کرو۔ جو تمہیں نہیں بتایا گیا اس کی کھود کرید مت کرو۔ تو اس پہ لازم نہیں آتا کہ دوسری روایت غلط ہو۔ کیونکہ ان کو دوسری طرح سے روایت بیان ہی نہ کی گئی تھی۔ لہذا دونوں روایات درست ہیں۔ (نووی:۱/۱۵۹)

مگر حافظ ابن حجرؒ نے امام نوویؒ کی اس رائے کو دور کی کوڑی اور بعید از قیاس قرار دیا ہے کیونکہ بخاری شریف کتاب التفسیر میں صیام کا تذکرہ زکوۃ پر بھی مقدم ہے جسکی وجہ امام نوویؒ کے مطابق یہ کہنا پڑیگا کہ ممکن ہے حضرت ابن عمرؓ نے اس روایت کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تین مرتبہ سنا ہو۔ اور یہ مستبعد ہے۔

لہذا حافظ ابن حجرؒ کے نزدیک زیادہ صحیح ہے کہ راوی نے روایت بالمعنی سے کام لیا ہے اور اصل روایت وہی ہے جس میں صیام رمضان کو حج پر مقدم کیا گیا ہے اور روایت بالمعنی کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یا تو راوی اس مجلس میں موجود نہیں تھا جس میں حضرت ابن عمرؓ نے یزید بن بشر پر نکیر کی تھی یا اس مجلس میں تھا مگر روایت کرتے وقت اس بات کو بھول گیا۔

نیز اس میں یہ فائدہ بھی ہے کہ نسیان کی نسبت صحابی کی جانب نہیں کرنی پڑتی اور اسکی دلیل یہ بھی ہے کہ ایک ہی راوی حنظلہ بن ابی سفیان رمضان کو اپنی روایت میں مقدم کرتے ہیں اور کبھی مؤخر کرتے ہیں لہذا واضح ہو گیا کہ حضرت ابن عمرؓ نے تو ایک ہی طرح سے روایت بیان کی تھی مگر راوی کبھی روایت باللفظ کر دیتا تھا اور کبھی روایت بالمعنی۔ اور جب روایت بالمعنی اپنی شرائط کے ساتھ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ (فتح الباری مع زیادة:۱/۷۴-۷۳)

اگر ایک وزیر ایک قانون بناتا ہے تو دوسرا اس کو ختم کرڈالتا ہے دوسرا بناتا ہے تو تیسرا اس میں کمی محسوس کرتا ہے اور وہ اس کو ختم کر کے کوئی نیا قانون ایجاد کرتا ہے۔

ع ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت

تو کیا یہ کھلی دلیل نہیں ہے کہ اگر یہ انسان کا بنایا ہوا قانون ہوتا تو دوسرے لوگوں کے قوانین کی طرح یہ بھی ادلتا بدلتا رہتا مگر اس میں سرِ مو بھی فرق نظر نہیں آتا۔ دنیا کا وہ کونسا سورما ہے جو اس جیسا قانون بنا سکے۔

غرباء وفقراء کی امداد کا اس سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہوسکتا مساکین کی امداد کا یہ واحد ذریعہ ہے نہ بار ہوتا ہے نہ خیال ہوتا ہے صرف فرض سمجھ کر انسان ادا کرتا ہے اور غرباء کا کام چلتا ہے۔

اگر دنیا کا کوئی انسان اس کے بارے میں کچھ اشکال کرے تو ہم اس کو ہر پہلو سے سمجھا سکتے ہیں کہ اس سے بہتر کوئی طریق ہو ہی نہیں سکتا۔

والحج: یہ چوتھا رکن اسلام ہے۔ خانہ کعبہ جو سرچشمۂ ہدایت ہے اس کی زیارت کا لوگوں کو حکم دیا گیا کیونکہ لوگوں کے اجتماع کا اس سے بہتر کوئی دوسرا قانون نہیں ہوسکتا لوگوں کے ایک جگہ جمع ہونیکا اس سے بہتر کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ اور اجتماعیت اور باہمی اتفاق واتحاد کے فوائد مسلم ہیں۔

وصوم رمضان: یہ اسلام کا پانچواں رکن ہے۔

ایمانی وروحانی قوت کے لئے صبر واستقلال کے لئے جسمانی تقویت اور دفع معاصی کے لئے اس سے بہتر کونسا قانون ہوسکتا ہے۔

اس روایت میں "صوم رمضان" آیا ہے حالانکہ بعض روایات میں ہے **"لاتقولوا رمضان، فان رمضان اسم من اسماء الله تعالیٰ، ولکن قولوا: شهر**

رمضان. (الکامل لابن عدی: ۸/۳۱۲، وفی ترجمة نجیح ابومعشر المدنی) اسی وجہ سے بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ رمضان کا اطلاق اس وقت تک درست نہیں جب تک شہر کو اس کی جانب منسوب نہ کیا جائے۔

امام قرطبی اور محققین علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ روایت قابل استدلال نہیں ہے اس لئے کہ اس کے ایک راوی ابو معشر نجیح ہیں جو غیر معتبر ہیں۔ نیز اگر اس روایت کو درست فرض بھی کر لیا جائے تب بھی وہ روایات جن میں رمضان کا لفظ بغیر شہر کی نسبت کے آیا ہے اصح اور اکثر ہیں لہذا ان ہی روایات پر عمل ہوگا۔ مزید برآں یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء کا جہاں بھی تذکرہ آیا ہے وہاں رمضان کا ذکر نہیں۔ نیز رمضان کے معانی کا اطلاق بھی ذاتِ باری عزاسمہ پر درست نہیں ہے۔ اسی وجہ سے رمضان کہنے میں کوئی حرج نہیں۔

امام باقلانی (قاضی ابوبکر بن الطیب) کی رائے یہ ہے کہ اگر مطلق رمضان استعمال کرنے کی صورت میں التباس ہوتا ہو تب تو اسکا استعمال کراہت سے خالی نہیں مثلاً **جاء رمضان، دخل رمضان،** کہتے ہیں۔ اور اگر کلام میں التباس نہ ہو تو بلا اضافت شہر استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ مثلاً کہا جائے "**صمنا رمضان**" (المفہم شرح مسلم: ۱/۱۵۴)

اگر کوئی انسان ان پانچوں ارکان اور ان پانچوں قوانین پر عمل پیرا ہو تو یقینی بات ہے کہ کوئی معصیت اس کو چھو بھی نہیں سکتی۔

اگر ان پر عمل کرنے کے باوجود اسے معصیت پہنچتی ہے تو سمجھ لو کہ اس کے عمل میں کمی ہے کسی نہ کسی قانون پر اس کے عمل میں کوتاہی ہو رہی ہے۔

یہ حدیث پاک تمام احادیث کا اجمال اور گویا متن متین ہے کہ بقیہ تمام احادیث اسی حدیث کی تفصیل و تشریح ہیں۔

ارکان خمسہ کی حکمتیں

اول حکمت: کلمۂ شہادت کے ذریعہ بندہ اپنے خالق و مالک تعالیٰ شانہ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے، چونکہ اپنے مالک ومحسن کی محبت فطری چیز ہے، ایک حیوان بھی اپنے مالک سے محبت کا اظہار کرتا ہے، اگر کسی انسان میں اپنے خالق و مالک تعالیٰ شانہ کی محبت نہیں، وہ حیوانات سے بھی بدتر ہے۔ بس کلمۂ شہادت کے ذریعہ بندہ اپنے خالق و مالک کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے اور کوئی دعویٰ بلا دلیل معتبر نہیں ہوتا، پس دعویٰ محبت کے لئے بھی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے، نماز کے ذریعہ جو پانچ وقت اللہ تعالیٰ کے دربار کی حاضری ہے، بندہ اپنی محبت کا ثبوت پیش کرتا ہے چونکہ محبت کا ادنیٰ درجہ یہی ہے کہ وہ محبوب کے پاس آنا جانا شروع کرتا ہے، اور کسی کے پاس کثرت سے آنا جانا محبت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اور زکوۃ (جو مالی قربانی ہے) کے ذریعہ اور مزید محبت کا ثبوت پیش کرتا ہے، چونکہ محب محبوب کی خوشنودی کے لئے مالی قربانی پیش کرتا ہی ہے۔ روزہ (جو کہ اپنے نفس کے تقاضوں کو دباتا ہے) کے ذریعہ مزید محبت کا ثبوت دیتا ہے، چونکہ عاشق اپنے محبوب کی خوشنودی کے لئے اپنی طبیعت اور اپنے نفس کے تقاضوں کو قربان کیا کرتا ہے۔ اور حج جو سراسر دیوانگی کا مظہر ہے کہ نہ کپڑوں کی پرواہ نہ جوتوں کی فکر، سر کھلا ہوا ہے، لبیک لبیک میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں کی رٹ لگی ہوئی ہے، کبھی کعبہ کے ارد گرد گھومتا ہے، اور کبھی حجر اسود کو چومتا ہے، جیسے دیوانہ "اقبـــل ذا الـجـدار ا ذا الـجـدارا" کہتا ہے، کبھی دیوانوں کی طرح اکڑ کر چلتا ہے، کبھی جمرات پر دیوانوں کی طرح کنکری مارتا ہے، کبھی منیٰ میں کبھی عرفات میں کبھی مزدلفہ میں بسیرا کرتا ہے۔

یکجا رہتے نہیں عاشق بدنام کہیں
دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں

غرضیکہ حج مکمل اعمال دیوانگی کا مظہر ہے، اور محبت کا اعلیٰ درجہ یہی دیوانگی ہے، پس بندہ حج کے ذریعہ محبت کے اعلیٰ درجہ کا ثبوت پیش کرتا ہے، اور حج کے ذریعہ ہی دین کی تکمیل ہوتی ہے کہ حج کے موقع پر میدان عرفات میں "**الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی الآیة**" نازل ہوئی، اور حج کے ذریعہ ہی محبت کی تکمیل ہوتی ہے، پس ارکان خمسہ کے ذریعہ بندہ اپنے خالق و مالک حق تعالیٰ شانہ کی محبت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

دوسری حکمت: اخلاق کی دو قسمیں ہیں: اخلاق حمیدہ، اخلاق رذیلہ۔

اول: انسان کے اندر فطری طور پر اخلاق رذیلہ بھی کچھ نہ کچھ موجود ہوتے ہیں، مثلاً کبروغرور جوام الامراض اور ام الفسادات ہیں، اس کے ازالہ کے لئے، نماز کو رکھا ہے کہ نماز کے ذریعہ انسان کے اندر سے کبر نکلتا ہے، اور عبدیت پیدا ہوتی ہے، جوام الحسنات ہے۔

دوم: انسان کے اندر بخل بھی رکھا ہوا ہے اس کے ازالہ کے لئے زکوۃ کو رکھا ہے، زکوۃ کے ذریعہ بخل ختم ہو کر سخاوت پیدا ہوتی ہے۔

سوم: انسان کے اندر حرص وطمع بھی رکھی ہوئی ہے اس کے ازالہ کے لئے روزہ کو رکھا گیا ہے کہ روزہ کے ذریعہ حرص وطمع ختم ہو کر ایثار و قناعت پسندی کی صفت پیدا ہوتی ہے۔

چہارم: انسان کے اندر ایک مرض ریا اور شہرت پسندی بھی رکھا ہوا ہے، اس کے ازالہ کے لئے، حج کو رکھا ہے کہ حج کے ذریعہ ریا وشہرت پسندی ختم ہو کر اخلاص وللّٰہیت کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح ان ارکان خمسہ کے ذریعہ اگر ان کو صحیح طور پر اور کامل طور پر ادا کیا جائے تو یہ اخلاق رذیلہ ختم ہو کر اخلاق حمیدہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

ضرورت صحبت شیخ

مگر چونکہ عادۃً از خود انسان کامل طور پر ان ارکان کو کما حقہ ادا نہیں کرسکتا اس لئے از

خود نہ کلی طور پر اخلاق رذیلہ ختم ہوتے ہیں، نہ کلی طور پر اخلاق حمیدہ حاصل ہوتے ہیں اس لئے شیخ کامل کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ اس کی صحبت اور اس کے حکم کے مطابق ان ارکان کو ادا کرنے اور دیگر تدابیر کے ذریعہ اخلاق رذیلہ ختم ہوں اور انسان اخلاق حمیدہ سے متصف ہو جائے، پس حدیث پاک سے صحبت شیخ کی ضرورت بھی ثابت ہوگئی۔

ایک خاص فائدہ

مکان جتنا ہی کامل ومکمل ہوتا ہے، اتنا ہی اس سے سردی گرمی سے حفاظت ہوتی ہے، اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور جتنا ناقص ہوگا اتنی ہی افادیت کم ہوگی اور دیواریں گر کر صرف کھنڈر باقی رہ جائے گا، اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا، اسی طرح اسلام کامل کی طرف غیروں کی بھی کشش ہوتی ہے، پس اسلام کامل ہونے کی حالت میں دعوت کا بھی کام دیتا ہے۔

ایک اشکال مع جواب

یہاں ایک اشکال ہوتا ہے: اشکال یہ ہے کہ جب اسلام کی بنیاد ان پانچ چیزوں پر ہے ان پانچوں چیزوں کے ذریعہ اسلام کا خیمہ قائم ہوگیا تو اب مزید اعمال کی ضرورت نہیں رہی۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک ستون پانچ چیزیں ہیں، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ستونوں کو قائم کرنے کے لئے کیل، رسیوں وغیرہ بہت سی چیزوں کی احتیاج ہوتی ہے، اور پھر خیمہ کی تحسین وتزئین کے لئے بھی بہت سی چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے، اسی طرح اسلام کا مدار واقعی ان پانچ ارکان پر ہے، لیکن اسلام کے دیگر

واجبات وسنن ومستحبات اورآداب وغیرہ کا انکار نہیں کیا جا سکتا، جو اسلام کی تقویت اور تحسین وتزئین کا ذریعہ ہیں۔

ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک جنازہ میں حضرت حسن بصریؒ اور مشہور شاعر فرزدق شریک ہوئے حضرت حسن بصریؒ نے فرزدق شاعر سے کہا کہ موت سب کو آتی ہے، آپ نے سفر آخرت کے لئے کیا تیاری کی ہے؟

فرزدق نے جواب دیا: کہ **شهادة ان لااله الا الله وان محمد عبده ورسوله.**

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: **هذه العمود فاين الاوتاد والاطناب** [کہ یہ تو اصل ستون ہے اس کے لئے کیل، رسیاں کہاں ہیں، جن سے خیمہ کھڑا ہوتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ اصل ستونوں کے علاوہ بھی دیگر اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح ان پانچ ارکان اسلام کے علاوہ بھی دیگر اعمال کی ضرورت ہے۔

﴿ایمان کی شاخیں﴾

﴿۴﴾ **عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْإِيْمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ شُعْبَةً فَاَفْضَلُهَا قَوْلُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ، وَاَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِيْمَانِ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔**

حواله: بخاری شریف: صفحہ ۶ رج ۱، **باب امور الايمان، كتاب الايمان،** حدیث نمبر: ۹، عالمی حدیث نمبر: ۹، مسلم شریف: صفحہ ۴۷ رج ۱، **باب بيان عدد شعب الايمان، كتاب الايمان،** حدیث نمبر: ۳۵ ر

حل لغات: **بضع،** ٹکڑا، چند، **الشعبة،** درخت کی شاخ، حصہ، گروہ، ہر ایک،

ج شُعَبٌ، وَشِعَابٌ. اماطة، ب افعال سے، دور کرنا، ہٹانا مجرد میں مَاطَ (ض) مَیطاً، ہٹنا، الاذی، تکلیف، کوفت، قرآن کریم میں ہے، لن یضروکم الا اذیٰ، اَذِیَ (س) فلان بکذا تکلیف پہنچنا۔ الحیاء، شرم، وقار، حَیَ، (س) حَیاءً من القبح بری بات سے شرم کرنا۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ[1] سے روایت ہے: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایمان کی ستر سے زائد شاخیں ہیں، ان میں سب سے اعلیٰ شاخ، اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سواء کوئی معبود نہیں ہے۔ اور سب سے کم درجہ کی شاخ، راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا ہے اور حیاء ایمان کی ایک شاخ ہے۔

---

[1] **حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ:** کثیر الروایۃ صحابی ہیں، علامہ ابن عبدالبرؒ کی رائے یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام کے ان کے نام کے بارے میں جس قدر اختلاف ہے اتنا کسی کے نام کے بارے میں نہیں۔ اور امام نووی کی رائے یہ ہے کہ ان کے اور ان کے والد کے نام کے متعلق تیس سے زائد قول ہیں۔

البتہ اکثر علماء کے نزدیک ان کا اسلامی نام عبدالرحمٰن بن صخر ہے اور زمانۂ جاہلیت کا نام عبد شمس یا عبد عمرو ہے۔ قبیلہ دوس کی جانب نسبت کرتے ہوئے ان کو دوسی کہا جاتا ہے، خیبر کے سال میں اسلام لائے اور پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں مواظبت اختیار کی۔ اور اٹھہتر سال کی عمر ۵۹ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی اور بقیع میں تدفین عمل میں آئی۔

امام بخاریؒ کی رائے ہے کہ آپ سے آٹھ سو سے زائد حضرات نے روایت کی ہے جن میں تابعی بھی ہیں اور صحابہؓ کی بھی ایک بڑی جماعت ہے۔ آپ کی کل مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) ہے جن میں سے چار سو چھہتر (۴۷۶) احادیث شریفہ بخاری میں ہیں جن میں سے سب سے پہلی روایت یہی ہے۔

وجہ کنیت: ھریرۃ۔ ھرۃ کی تصغیر ہے ایک مرتبہ آپ نے آستین میں بلی لے رکھی تھی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا یہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا ھرۃ (بلی) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم تو ابو ہریرہ (بلی کے ابو) ہو۔ محبوب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہوا نام ایسا پسند آیا کہ اسی نے اصل نام کی شکل اختیار کر لی۔ اور اصل نام لوگ بھول گئے۔ نیز اضافت کی وجہ سے ھریرۃ کی تا مجرور ہونی چاہئے یہی ایک جماعت کی رائے بھی ہے لیکن جمہور محدثین کے نزدیک علمیت اور ترکیب کی وجہ سے غیر منصرف ہونے کی بنا پر اس پر کسرہ نہیں آتا۔ (مرقاۃ: ۶۰/۱، فتح الباری: ۷۵/۱، قسطلانی: ۱۵۵/۱)

بضع: کے معنی بعض کے ہی ہیں۔عین کو پلٹ دیا اور ضاد کو درمیان میں لے آئے اس کا اطلاق اکائیوں پر ہوتا ہے۔اس کا ترجمہ چند کے ساتھ ہوتا ہے اور ٹھیٹ اردو میں اس کا ترجمہ کچھ ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مبہم کلام کرنا بھی جائز ہے۔

جیسے کسی نے کہا کہ کتنا ٹھہرو گے؟ کہا کہ چند دن ٹھہروں گا۔ یہ جائز ہے۔لیکن چند چند ہی رہے، ایسا نہ ہو جیسا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب نور اللہ مرقدہ کے یہاں ایک طالب علم آئے، آپ نے پوچھا کب جاؤ گے کتنے دن ٹھہرو گے؟ اس نے کہا چند دن ٹھہروں گا فرمایا یہ مبہم ہے اس کی تفصیل کرو۔ اس نے کہا ایک مہینہ ٹھہروں گا۔فرمایا تم سے چند کا ترجمہ بھی نہ آیا، جاؤ ابھی مدرسہ میں پڑھ کر آؤ۔کیونکہ اس کا ترجمہ سات، آٹھ، نو ہوتا ہے۔

شعبۃ: کہتے ہیں شاخ کو، منشعب جو میز ان کی بہن ہے اس کو بھی منشعب اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ شاخ در شاخ ہے۔

تو ان شعبوں میں سے اول و آخر کو متعین کر دیا کہ درمیانی شعبوں کو خود سوچ لو ابتداء وانتہاء متعین کر دی۔

بنیادی شعبہ: لا الہ اللہ کہنا ہے جس کا مصداق ایمان ہے اور ایک

ادنی شعبہ: راستہ سے ایذ ارساں چیز کا ہٹا دینا ہے۔

درمیانی شعبہ: بھی ذکر کر دیا الحیاء شعبة من الایمان [حیا بھی ایک ایمان ہی کا شعبہ ہے] بہشتی زیور کے آخری حصہ میں یہ شعبے لکھے ہوئے بھی ہیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کی ایک کتاب فروع الایمان ہے اس میں ان تمام شعبہ جات کی تفصیل موجود ہے۔

نماز، زکوۃ، روزہ، حج، تلاوت، سلام کرنا، عیادت کرنا، والدین کی خدمت کرنا، بڑوں کی تعظیم، چھوٹوں پر شفقت وغیرہ یہ سب ایمان کے شعبے ہیں[۱]۔

جامعیت حدیث

وجہ اول: ایمانی شعبے دو قسم کے ہو سکتے ہیں، (۱) قولی۔ (۲) فعلی۔

قولی شعبوں میں سے قول "لا الٰہ الا اللہ" کا ذکر فرمایا۔ اور فعلی میں سے "اماطة الاذی عن الطریق" کا ذکر فرمادیا۔ مطلب یہ ہوا کہ ایمان کی سرسبزی وشادابی کے لئے اقوال بھی صحیح ہونے چاہئیں اور افعال بھی۔

وجہ دوم: ایمانی شعبے دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔ (۱) فعلی۔ (۲) ترکی۔

---

[۱] قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ علماء کی ایک جماعت نے ان شعبوں کی تحقیق وتفتیش کی ہے لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ان کے بیان کردہ شعبے ہی حدیث میں مراد ہیں نیز ان کے بالتفصیل نہ جاننے سے ایمان میں کوئی کمی نہیں آتی۔ حافظ ابن حجرؒ کی رائے یہ ہے کہ جن لوگوں نے ان کا شمار کرایا ہے ان کے طریقے مختلف ہیں اور ان میں ہمارے خیال میں زیادہ درستگی کے قریب ابن حبانؒ کا طریقہ ہے۔ پھر حافظؒ نے ان شعبوں کی تفصیل بیان کی ہے کہ بعض قلب سے تعلق رکھتے ہیں بعض زبان سے اور بعض بدن سے، جو قلب سے تعلق رکھتے ہیں وہ چوبیس ہیں اور جو زبان سے متعلق ہیں وہ سات ہیں اور جو بدن سے تعلق رکھتے ہیں وہ ۳۸ ہیں۔ پھر ان میں سے پندرہ خصائل اعیان سے، چھ اتباع سے اور بقیہ سترہ عوام سے متعلق ہیں۔ لہٰذا کل ۶۹ خصائل ہیں ان کو ۷۷ بھی کہا جا سکتا ہے بعدم تداخل کے اعتبار سے۔ (فتح الباری: ۱/۷۷)

اور امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ایمان سے مراد اعمال شرعیہ ہیں کیونکہ اس میں اعلیٰ اور ادنیٰ عمل کا تذکرہ ہے لہٰذا جو چیزیں اعلیٰ اور ادنیٰ کے درمیان ہیں وہ بھی اعمال ہی ہیں اور وہ اعمال اسی عدد میں منحصر ہیں مگر شریعت نے وہ اعمال متعین مفصل طور پر ہمارے لئے بیان نہیں فرمائے، لہٰذا جن لوگوں نے ان اعمال کو شمار کرانے کی کوشش کی ہے وہ صحیح نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ شمار کرنے پر تعداد بڑھ جائے اور ممکن ہے کہ تداخل کا اعتبار کرنے پر تعداد گھٹ جائے، البتہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے علم میں مفصل طور پر متعین ہیں۔ (المفہم شرح مسلم: ۱/۲۱۷)

ان کی تعداد کے متعلق مستقل تصانیف بھی موجود ہیں مثلاً متقدمین علماء میں ابو عبد اللہ الحلیمی الشافعی کی کتاب المنہاج اور بیہقی کی شعب الایمان وغیرہ۔ (نووی: ۲/۵)

فعلیات میں سے قول ”لا الٰہ الا اللہ“ ذکر کر دیا۔ اور ترکی میں سے ”اماطة الاذی عن الطریق“ کا ذکر فرمادیا۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان کے کمال کے لئے افعال بھی شریعت کے مطابق ہوں، اور تروک بھی۔

وجہ سوم: ایمانی شعبے بعض حقوق اللہ سے متعلق ہیں، اور بعض حقوق العباد سے۔ اول کو قول ”لا الٰہ الا اللہ“ سے بیان کیا۔ اور دوم کو ”اماطة الاذی عن الطریق“ سے۔ اور حیاء دونوں کے لئے معین ہے۔ انسان میں جب حیا ہوتی ہے، حقوق اللہ بھی ادا کرتا ہے، اور حقوق العباد بھی۔ فقط واللہ اعلم

الایمان بضع وسبعون شعبة:[۱] اس جملہ میں بھی استعارات ہیں جیسے پہلے جملہ میں تھے۔ اس میں ایمان کو تشبیہ دی ہے شجر کے ساتھ۔ مشبہ بہ کو وجہ تشبیہ اور حرف تشبیہ کو حذف کر کے صرف مشبہ کو ذکر کیا اس لئے یہ استعارہ بالکنایہ ہے۔

---

[۱] روایات اس سلسلے میں مختلف ہیں کہ ان شعبوں کی تعداد کیا ہے ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ میں ان کی تعداد بضع وسبعون ذکر کی گئی ہے اور بخاری شریف میں بضع وستون، پھر ترمذی کی ایک روایت میں اربعة وسبعون اور مسلم کی ایک روایت میں شک کے ساتھ "بضع وسبعون او بضع وستون" اور صحیح ابوعوانہ کی روایت میں "ست وسبعون او سبع وسبعون" بھی موجود ہے۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ الفاظ کے مختلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاً اقل کا علم دیا گیا پھر اکثر کا علم دیا گیا۔ مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ کتنی مرتبہ ایسا ہوا۔ کیونکہ روایات کا اختلاف ماقبل میں گذر چکا ہے کہ روایات میں شدید اختلاف ہے۔ مثلاً چھ سات مرتبہ ایسا ہوا، حافظ ابن الصلاح نے عدد اقل کی روایت کو ترجیح دی ہے، متیقن ہونیکی وجہ سے، اور امام نووی نے عدد اکثر کی روایت "بضع وسبعون" کو ترجیح دی ہے زیادتی ثقہ ہونیکی بناپر اور اس کے قائل قرطبی وغیرہ ہیں۔ اور امام طیبیؒ نے قاضی ناصر الدین سے نقل کیا ہے کہ ممکن ہے تحدید مراد نہ ہو بلکہ تکثیر مراد ہو کیونکہ "سبعة" اور "سبعین" کا لفظ بکثرت تکثیر کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کہ قرآن پاک میں ہے۔ "ان تستغفر لهم سبعين مرة" اور اسی کو امام طیبیؒ اور ملا علی قاریؒ نے ترجیح دی ہے کیونکہ اگر تحدید مراد ہوتی ہے تو ان کو مبہم نہ رکھا جاتا۔ گویا مطلب یہ ہے کہ ایمان کے بہت سارے شعبے ہیں جن کی تعداد مبہم ہے اور ان کی کل تعداد کیا ہے یہ معلوم نہیں۔ (فتح الباری: ۱/۷۵، قرطبی: ۱/۲۱۷، نووی: ۲/۵، طیبی: ۱/۱۱۵، مرقاۃ: ۱/۶۱)

اور لوازمات شجر یعنی شاخوں کا ہونا ایمان کے لئے ثابت کیا ہے اس لئے یہ استعارہ تخییلیہ ہے۔

اور ایمان کے لئے مناسبات شجر یعنی سیدھا ہونا تومند ہونا زائد شاخوں کا ہونا ثابت کیا ہے اس لئے یہ استعارہ ترشیحیہ ہوگیا۔ جس طرح درخت کے ذریعہ گرمی سے بچا جاتا ہے اور اس سے پھل حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح ایمان کے ذریعہ بھی تکالیف سے بچا جاتا ہے اور اس سے پھل یعنی جنت وغیرہ حاصل ہوتی ہے۔

پس جس طرح درخت محبوب ہوتا ہے کہ صحن سے اس کو کاٹنے نہیں دیتے ایسے ہی ایمان کی بھی محبت ہونی چاہئے۔ اور جس طرح درخت کی خوبصورتی اور کمال کے لئے ضروری کہ اس کی تمام شاخیں سرسبز وشاداب ہوں، اسی طرح ایمان کے کمال اور خوبصورتی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تمام شاخیں سرسبز وشاداب ہوں، اور جس طرح درخت کی کوئی ایک شاخ بھی ٹوٹ جاتی ہے یا سوکھ جاتی ہے تو اس سے مالک کو رنج ہوتا ہے، اسی طرح ایمان کی کوئی ایک شاخ بھی اگر مرجھاتی ہے تو اس سے مومن کو تکلیف ہونی چاہئے، اور اس کی فکر کرنی چاہئے۔ فقط

قرآن شریف میں ہے: مثل کلمة طیبة الخ: ایمان ایسا درخت ہے جس کی شاخیں آسمان میں اور جڑیں زمین کے اندر ہیں اور اس پر ہر آن پھل لگتا رہتا ہے۔

کبھی نماز کا کبھی روزہ کا کبھی زکوۃ کا کبھی حج کا کبھی صبر کا کبھی شکر کا کبھی محبت کا کبھی خوف وخشیت کا کبھی تلاوت کا کبھی تسبیح کا کبھی ذکر کا کبھی سلام کا وغیرہ وغیرہ۔

اشکال مع جوابات

اشکال: اگر کہیں کہ یہ سب اعمال تو کافر بھی کرتے ہیں صبر وشکر محبت وغیرہ تو کیا وہ

مومن ہو گئے؟

جواب(۱): اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ وہ بھی مومنوں ہی کی بدولت ہے، یعنی ایمان والوں کی صحبت وغیرہ سے حاصل کر کے وہ ان اعمال کو کرتے ہیں، جیسے بہت سے لوگوں کے گھروں میں کھیتوں میں پھلوں کے درخت نہیں ہوتے، مگر پھل پھر بھی کھالیتے ہیں، بس اسی طرح کفار اگر ان اعمال کو کرتے ہیں تو ایمان والوں کی بدولت کرتے ہیں، گویا ایمان والوں کے گھروں میں جو ایمان کا درخت ہے اس کے پھل ان کو بھی پہونچ جاتے ہیں، اور وہ بھی کھالیتے ہیں، پس وہ ان اعمال کی وجہ سے صاحب ایمان نہیں ہونگے۔

مگر آخرت میں اعمال کے ثمرات حور و غلماں اور مرضی خدا وغیرہ مومنوں ہی کے لئے مخصوص ہے۔

جواب(۲): دوسرا جواب یہ ہے کافر میں جو حیا ہے وہ اسمی ہے حقیقی نہیں اس لئے کہ جو اپنے خالق حقیقی سے ہی حیا نہیں کرتا تو وہ حیا حقیقی نہیں۔

جواب (۳): تیسرا جواب یہ ہے کہ ایمان کی ایک خصلت پائے جانے پر کوئی مومن نہیں ہو سکتا ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ایمان کی ایک خصلت موجود ہے۔ جیسے مومن اگر اس میں کوئی کفر کی خصلت ہو تو اس کو کافر نہیں کہیں گے۔ ہاں یہ کہیں گے کہ اس کے اندر کفر کی ایک خصلت موجود ہے۔

لا الٰــــه الا اللّٰه الــخ[1] کہنا اس شجر کا سب سے بڑا تنا ہے۔ اور اسی کی تائید وہ حدیث کرتی ہے جس میں ہے: **افضل الذکر لا الٰہ الا اللّٰہ**. (مرقاۃ:۱/۶۱)

---

[1] فــافـضـلها قـول لا الٰه الا اللّٰه: افضل پر "فا" تفضیلیہ یا تفریعیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ: اذا کان **الایمان ذا شعب فافضلها ......**" (مرقاۃ:۱/۶۱)

اماطۃ الاذی: یعنی راستہ سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا اس درخت کا ہی چھوٹا سا تنا ہے[1]۔ اور آج کل کے بدچلن لوگ جب سڑک پر تفریح کے لئے جاتے ہیں تو بجائے ایذا سے بچانے اور اینٹ پتھر ہٹانے کے کیلیں اور چاقو وغیرہ سڑک پر ڈالدیتے ہیں تاکہ وہ پہیہ میں بندھ جائے اور پھر تماشا دیکھیں۔

یہ تو ابولہب کی بیوی کا کام ہے۔ مسلمان کا نہیں۔ مسلمان کا کام تو ایذا دہ چیز کے ہٹانیکا ہے۔ اگر کسی غیر مسلم کو اماطۃ الاذی کرتے دیکھو تو اس کو مسلمان سمجھ لینا ضروری نہیں۔ کہ کسی ایک شاخ کے ہونے سے کل درخت کا ہونا لازم نہیں آتا اگر کسی کے گھر میں ایک شاخ ہو تو یہ نہیں کیا جاتا کہ اس کے گھر میں درخت موجود ہے۔ ہاں یہ کہیں گے کہ اس کو ایمان کے ایک شعبہ سے محبت ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کے درخت سے بھی نواز سکتا ہے۔ مگر ابھی وہ مومن نہیں۔

اگر کوئی مومن اماطۃ الاذی کے بجائے تکلیف دہ چیز راستہ میں ڈالتا ہے۔ تو اس کو کافر نہیں کہہ سکتے۔ ہاں یوں کہیں گے کہ اس کے ایمان کے درخت کی چند شاخیں ٹوٹ گئیں۔ اور کسی شاخ کے ٹوٹنے سے درخت کا نہ ہونا لازم نہیں آتا۔

حیاء کی تعریف

حیاء: یہ کیا چیز ہے؟ یہ انسان کے اندر ایک کیفیت ہے جیسے قوت سمع و بصر وغیرہ اسے دیکھ نہیں سکتے بلکہ صرف محسوس کرتے ہیں۔

---

[1] و ادناھا: ادنیٰ یا تو "دنو" بمعنی قرب سے ماخوذ ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا بہت آسان ہے۔ یا یہ "دناءۃ" سے ماخوذ ہے اور مطلب یہ ہے کہ کم از کم فائدہ کی چیز۔ (مرقاۃ: ۱/۶۱)

اماطۃ: کے معنی ازالہ کے ہیں۔ اور "اذی" یا تو مصدر ہے جو اسم فاعل موذی کے معنی میں ہے یا مبالغہ کے طور پر وصف (مصدر) کا ذات پر حمل کیا گیا ہے یا اس سے مراد موذی چیز ہے مثلاً کانٹا، پتھر نجاست وغیرہ۔ (مرقاۃ: ۱/۶۱)

ایسے ہی حیاء بھی انسان کے اندر ایک قوت وملکہ ہے، جس کے ذریعہ انسان مکروہ چیزوں سے منقبض ہوجاتا ہے[1]۔ جیسے چھوئی موئی کا درخت کہ ذرا بھی اس کو ہاتھ لگاؤ تو وہ مرجھا جاتا ہے، اور ہاتھ ہٹانے پر پھر ٹھیک ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اس قوت کا حال ہے کہ ذرا مکروہ چیز سامنے آئی اور وہ مرجھائی۔ یا جیسے صبر کوئی پوچھے کہ صبر کیا ہے؟ تو اسے جیب سے نکال کر تو بتلایا نہیں جاسکتا، بلکہ یوں کہا جائیگا کہ صبر ایسی قوت ہے جس سے انسان مصیبتوں پر صبر کرتا ہے۔

انقباض النفس علی ماتکرہ. حیاء ہے۔

اور حیاء ذی حیات اشیاء میں ہوتی ہے۔ انسان میں یہاں تک کہ حیوان میں بھی پھر اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔

حیا کی اقسام: عقلی، طبعی، فطری، شرعی۔

حیاء عقلی: ایسی بات جو عقل کو مکروہ معلوم ہو انسان کو پیش آ جائے اور وہ اس سے منقبض ہوجائے تو یہ حیاء عقلی ہے۔ وقس البواقی علی ہذا۔

یہاں پر حیا سے شرعی حیا مراد ہے۔

حیا شرعی: خلاف شرع شئ پر طبیعت کے منقبض ہونے کو کہتے ہیں۔

شعبۃ: میں تنوین برائے تعظیم ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حیا ایمان کا ایک عظیم ترین شعبہ ہے۔ جو بہت سے شعبوں پر مشتمل ہے اس سے اور بھی چھوٹی چھوٹی شاخیں نکلتی ہیں۔

---

[1] اس پر ایک اشکال بھی ہوتا ہے کہ حیا ایک امر طبعی غیر اختیاری ہے اور ایمان مامور بہ امر اختیاری ہے تو یہ ایمان کا جزء کیسے بن گیا۔
اس کا جواب دیا گیا ہے کہ حیاء کو اس کی غایت ونتیجہ کے اعتبار سے جزء قرار دیا گیا ہے وہ اختیاری ہے اور وہ ہے فعل مکروہ کا ترک کرنا۔

یہی قوت انسان کو ادب پے مجبور کرتی ہے اور نامحرم پر نظر ڈالنے سے روکتی ہے۔ اور اس کو نماز وغیرہ اعمال شرعیہ کی طرف بلاتی ہے۔

اذا فاتک الحیاء فافعل ماشئت: جب انسان میں حیا نہ رہے، تو وہ جو چاہے کرے۔

ہر عضو کی علیحدہ حیا ہے۔

آنکھ کی حیا غیر محرم کو نہ دیکھنا ہے۔

کان کی حیا بری بات کا نہ سننا ہے۔

دماغ کی حیا غلط بات کو نہ سوچنا ہے۔

پیٹ کی حیا یہ ہے کہ اس میں حرام چیز نہ جائے اگر جاتی ہے تو سمجھ لو کہ وہ بے حیا ہے اسی طرح انسان کے ہاتھ پیر غرضیکہ ہر ہر عضو اور ہر ہر بال باحیا بھی ہو سکتا ہے اور بے حیا بھی جب سب اعضاء بے حیا ہو جائیں تو سمجھ لو کہ وہ مکمل بے حیا ہو گیا۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "الحیاء خیر کلہ" (حیا خیر ہی خیر ہے) اور اگر نظر باحیا ہے تو غیر محرم کے سامنے جھک جائے گی اور اس کو ایک لذت محسوس ہو گی۔

ایک روایت میں اسی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استحیوا من اللہ حق الحیاء قلنا: یا نبی اللہ! انا لنستحیی والحمد للہ، قال: لیس ذالک ولکن الاستحیاء من اللہ حق الحیاء ان تحفظ الرأس، وماوعی وتحفظ البطن، وماحوی، وتتذکر الموت والبلی، ومن اراد الآخرة ترک زینة الدنیا، فمن فعل ذلک فقد استحیی یعنی من اللہ حق الحیاء. رواہ الترمذی واحمد.

[حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے اس طرح حیا کرو جیسا کہ حیا

کرنے کا حق ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے فرمایا: اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ہم اللہ سے حیا کرتے تو ہیں۔(حق الحیاء نہ کہہ کر صحابۂ کرام نے اپنے عجز کا بھی اعتراف کیا) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے حق حیاء کے طور پر شرم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سر کی حفاظت کرو اور ان چیزوں کی جن پر وہ مشتمل ہے۔(یعنی تمہارا سر غیر اللہ کے آگے نہ جھکے، ریاءً نہ جھکے، اور تکبر میں نہ اکڑے، اور تمہاری زبان، آنکھ اور کان ان چیزوں میں استعمال نہ ہوں جن میں اللہ تعالیٰ کی معصیت ہوتی ہو) اور پیٹ کی حفاظت کرو اور ان چیزوں کی جو اس کے اردگرد ہیں۔(یعنی پیٹ میں حرام نہ جانے دو، اور شرمگاہ، ہاتھ، پیر اور قلب کو معاصی میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے کاموں میں استعمال کرو۔اور موت کو پھر قبر میں جا کر ہڈیوں کے چورا ہو جانے کو یاد رکھو، اور جو آخرت کا طالب ہوتا ہے وہ دنیاوی زینت کو چھوڑ دیتا ہے۔اور جو ان تمام امور کو اختیار کرتا ہے۔وہی ہے اللہ تعالیٰ سے اس طور پر حیا کرنے والا جیسی حیاء کرنی چاہئے۔]
(تحفۃ الاحوذی: ۷/۱۵۴، رقم: ۲۵۷۵)

ایک خاص فائدہ

جس طرح اس سے قبل والی حدیث میں اسلام کو ایک مکان اور خیمہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، اسی طرح اس حدیث پاک میں ایمان کو ایک درخت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، اور درخت جتنا پھل دار-سایہ دار ہوگا، اتنا ہی اس کی افادیت زیادہ ہوگی، اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہونگے اور جتنی شاخیں کم ہونگی اتنی ہی افادیت کم ہوگی اور اتنا ہی لوگوں کی کشش بھی اس کی طرف کم ہوگی، پس ایمان کامل و مکمل ہونے کی حالت میں خود بخود لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کریگا، اور دعوت کا کام کریگا۔فقط

﴿کامل مسلمان کی پہچان﴾

﴿۵﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ، وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ، هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِي، وَلِمُسْلِمٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرٌ، قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ۔ (متفق عليه)

حوالہ: بخاری شریف: ص ۶/۱، باب المسلم من سلم المسلمون الخ، کتاب الایمان، عالمی حدیث نمبر: ۱۰، مسلم شریف: ص ۴۸/۱، باب بیان تفاضل الاسلام کتاب الایمان، حدیث نمبر: ۴۰،

حل لغات: سلم (س) سلاما، وسلامة، محفوظ ہونا۔ المهاجر، اسم فاعل، ترک وطن کرنے والا، مفاعلة سے، ہجرت کرنا، نهى (ف) نهيا عن الشئ، روکنا، منع کرنا۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (کامل) مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں، اور (کامل) مہاجر وہ ہے، جس نے اللہ تعالیٰ کی منع فرمودہ باتوں کو چھوڑ دیا۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں، مسلم شریف نے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ: ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مسلمانوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

تشریح: حضرت عبداللہ بن عمرو[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ مسلمان وہ ہے یعنی اس کی پہچان یہ ہے کہ اس سے کسی مسلمان کو کوئی دکھ نہ پہنچے اور نہ کسی انسان کو نہ زبان سے نہ ہاتھ سے۔

اعلیٰ درجہ کا مسلمان وہ ہے کہ جس کے دل میں کبھی کسی انسان کو تکلیف پہنچانے کا کوئی خطرہ ہی پیدا نہ ہوا ہو، اور یہ جب ہے جب کہ کوئی انسان اس کو ستانے کے واسطے تیار رہتا ہے، تو اس صورت میں بھی اگر ہم اس کو تکلیف پہنچانے کی سوچتے ہیں تو سمجھنا چاہئے کہ ہمارے اندر ایمان کامل نہیں۔ ہاں اس کی تکلیف سے بچنے کی تدبیر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

المسلم: میں الف لام عہد خارجی کا ہے اس سے مراد مسلم کامل ہے۔

اشکال: چونکہ اس مقام پر مبتداء اور خبر دونوں مرفوع بھی ہیں لہٰذا حصر پیدا ہوگا جو کاملیت ہی کے معنی پر دلالت کریگا۔ لیکن مسلم کامل، معنی مراد لینے کی صورت میں اشکال یہ ہے کہ اگر صرف اس صفت کے ساتھ وہ متصف ہے کہ کسی کو ایذا نہیں پہنچاتا، لیکن باقی ارکان اسلامی کو ادا نہیں کرتا تو تب بھی کیا وہ مومن کامل ہے؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مراد یہ ہے کہ باقی ارکان کی رعایت کے ساتھ، اس

---

[1] عبداللہ بن عمرو بن العاص بن وائل، القرشی، السہمی، آپ کی کنیت ابوعبدالرحمن، یا ابومحمد تھی، بعض روایات میں ہے کہ ان کا نام العاص تھا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بدل کر عبداللہ کر دیا۔ اپنے والد حضرت عمرو بن عاص سے قبل ان کا اسلام لانا ثابت ہے۔ حضرت ابوہریرۃ فرماتے ہیں: کہ مجھ سے زیادہ روایات صرف عبداللہ بن عمرو کے پاس ہیں، کیونکہ وہ لکھتے تھے، اور اس کے باوجود ان کی مرویات کی تعداد صرف سات سو ہے۔ اور میں لکھتا نہیں تھا۔ اور یہ قصہ مشہور احادیث سے ثابت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام لیل اور صیام نہار پر مواظبت کی وجہ سے ان کو نہی فرمائی تھی اور اخیر عمر میں فرمایا کرتے تھے کاش کہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی رخصت منظور کر لیتا۔ اخیر عمر میں بینائی جاتی رہی اور مکہ، طائف یا مصر ۶۵ھ میں وفات ہوئی۔ ایک لطیفہ یہ ہے کہ ان کے والد کی عمر میں ان کی پیدائش کے وقت ۱۱-۱۲-۱۳-۲۰ وغیرہ اقوال ہیں اور اکثر علماء ۱۲ سال کی عمر کے قائل ہیں۔ (اصابہ: ۲/۳۰۲، مرقاۃ: ۱/۶۳)

حدیث کے مقتضی پر بھی عمل کرے۔ اور امام خطابی کی رائے یہ ہے کہ جو حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ حقوق المسلمین کی ادائیگی کا جامع ہو وہ افضل المسلمین ہے۔ (فتح الباری: ۸۷/۱، قسطلانی: ۱۵۹/۱)

نیز یہاں شریعت نے حکم کو ماخذ سے مشتق مانا ہے لہٰذا حکم دیا کہ مسلمان وہ ہے جس کے اندر ماخذ اشتقاق یعنی سلامتی کی شان ہو اور اگر ماخذ اشتقاق نہیں تو گویا وہ مسلم نہیں۔

بہت سے مسلمان انگوٹھا دکھاتے ہیں ناک منہ چڑھاتے ہیں، ہونٹ پچکاتے ہیں جس سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے تو وہ مسلمان تو ہیں مگر کامل مسلمان نہیں۔ مسلمان کامل وہ مسلمان ہے جس سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

صرف زبان اور ہاتھ کو ذکر کرنے کی وجہ

یہاں صرف دو چیزوں کا ذکر کیا ہے یعنی لسان اور ید کا حالانکہ دوسرے اعضاء سے بھی تکلیف پہنچائی جاتی ہے جیسے کھنکھارنے سے آنکھ مارنے سے تو پھر ان دو ہی چیزوں کو کیوں ذکر کیا؟ اس کی دو وجہ ہیں۔

وجہ اول: یہ کہ بسا اوقات دو چیزوں کو ذکر کر کے ان سے کل مراد لیتے ہیں جیسے یوں کہیں کہ فلاں سیاہ و سفید کا مالک ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سرخ کا مالک نہیں یا جیسے "**وللہ المشرق والمغرب**" ہے اس سے بھی یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ شمال وجنوب کا مالک نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام جہتوں اور تمام چیزوں کا مالک ہے۔

وجہ ثانی: یہ ہے کہ یہ دو چیزیں یعنی لسان وید ایذا پہنچانے کے اندر دوسرے اعضا سے زائد ہیں جتنی تکلیف ان سے پہنچتی ہے دوسرے اعضا سے اتنی نہیں پہنچتی۔ اور جب

ان کی تکلیف سے بھی منع کیا ہے تو دوسری ایذاؤں سے بدرجۂ اولیٰ ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایذاء کی دو قسمیں ہیں۔قولی اور فعلی۔حدیث میں ان دونوں ہی چیزوں سے بچنا مسلمان کامل کی علامت بیان کیا گیا ہے۔(تحفۃ المرأۃ:۱۱۵)

لسان سے قولی اور ید سے فعلی مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ نہ اس کے قول سے کسی کو تکلیف پہونچے اور نہ فعل سے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ اس کی کسی حرکت سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہونچے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے کل سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

لسانہ: زبانی ایذاء میں سب وشتم، لعنت وملامت، غیبت و چغل خوری، بہتان وغیرہ سب چیزیں داخل ہیں۔اور زبان کو ید پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ زبانی ایذا آسان ہے اور کثیر الوقوع ہے یا اس لئے کہ اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے کما قال الشاعر: ؎

جراحات السنان لها التیام

ولا یلتام ما جرح اللسان

تیر کا تلوار کا تو گھاؤ بھرا

لگا جو زخم زبان کا رہا ہمیشہ ہرا

یا اس لئے کہ زبانی ایذاء زندہ ومردہ، عوام وخواص، متقدم ومتاخر ہر ایک کو پہنچائی جا سکتی ہے۔اور قول کے بجائے لسان کو ذکر کرنیکی وجہ یہ ہے کہ یہ اخراج اللسان استہزاء بالغیر کو بھی شامل ہے۔فتح الباری:۱/۸۷، مرقاۃ:۱/۶۳)

نیز زبان کو مقدم کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ لڑائی وغیرہ میں اول زبان چلتی ہے ہاتھ کی نوبت بعد میں آتی ہے۔

ویدہ: ہاتھ کی ایذا میں ضرب ناحق، قتل ناحق، غلط تحریر، دھکا دینا، زخمی کرنا وغیرہ

وغیرہ چیزیں داخل ہیں۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ہاتھ بولکر کنایۃً تمام اعضاء مراد ہیں کیونکہ بطش واخذ، وصل وقطع وغیرہ اسی سے سرزد ہوتے ہیں گویا کہ سلطنتِ افعال کے ہاتھ سے ظاہر ہونیکی وجہ سے کنایۃً تمام اعضاء مراد ہیں۔

مگر ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ لفظ ید اگر مفرد ہو تو اس سے تمام اعضاء مراد نہیں لئے جاتے البتہ اگر وہ تثنیہ اور جمع کے طور پر ''ایدی'' ''یدان'' مستعمل ہو تو اس سے تمام اعضاء مراد لئے جاتے ہیں لہذا یہ معنی مراد لینا محل نظر ہے۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ''ید'' کے ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں معنوی ہاتھ یعنی غیر کے حق پر ناحق طور پر غلبہ حاصل کرنا بھی داخل ہوگیا ہے۔ مرقاۃ: ۱/۶۳، تنظیم الاشتات: ۱/۴۱)

البتہ اقامتِ حدود، تعذیراً اور تادیب اطفال وغیرہ اس میں داخل نہیں، کیونکہ یہ چیزیں شرعاً اس سے مستثنیٰ ہیں، یا ان چیزوں پر عرفاً اذی کا اطلاق نہیں کیا جاتا ہے۔ (فتح الباری: ۱/۸۷، تنظیم الاشتات: ۱/۴۱)

المسلمون: میں صرف مسلمان مرد ہی نہیں عورتیں بھی داخل ہیں اور دوسری نصوص سے اہل ذمہ کے بھی یہی احکام معلوم ہوتے ہیں۔ حتی کہ سب حیوانات بھی اس میں داخل ہیں، بیل بھینس، گھوڑے یہاں تک کہ خنزیر بھی مسلمان ہیں[1]۔ اور یہ جہنم میں نہیں جائیں گے بلکہ انکو حساب کتاب اور بدلہ کے بعد مٹی بنا دیا جائے گا۔

تو معلوم ہوا کہ مسلمان کامل وہ ہے جس سے کسی انسان حیوان کتے اور گدھے تک کو بھی کوئی تکلیف نہ پہنچے، حتی کہ وہ چاند و سورج کو بھی تکلیف نہ دے۔ چاند و سورج کی تکلیف یہ

---

[1] ان حیوانات کو اس اعتبار سے مؤمن کہا کہ ان کو جس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہ اس میں لگے رہتے ہیں، مگر وہ اس میں مجبور محض ہیں ان کے اختیار کو اس میں کوئی دخل نہیں اس لئے وہ جنت میں بھی نہیں جائیں گے۔

ہے کہ ان کی طرف کو منہ کر کے پائخانہ پیشاب کرے اگر یہ بولتے تو شکایت کرتے اور کہتے کہ ہم ان کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور یہ پھر بھی ہم کو ستاتے ہیں۔

اسی طرح گناہ کرنے سے فرشتوں کو حیوانات کو بلکہ زمین کا وہ حصہ جس پر گناہ کیا جاتا ہے، اس کو اور اس کے آس پاس شجر وحجر کو تکلیف ہوتی ہے، اگر ان کو زبان دیجاتی تو اپنی تکلیف بیان کرتے اور ہمارا ناطقہ بند کردیتے۔

یہ تو اللہ تعالیٰ نے ہماری مصلحتوں کی وجہ سے ان کا بولنا بند کردیا ہے۔ ہاں قیامت میں بولیں گے اور شکایت کریں گے کہ مجھ پر فلاں نے ظلم کیا ہے وہاں بدلہ دیا جائے گا۔ گدھا شکایت کریگا کہ مجھ کو کمہار نے یہ تکلیف دی ہے، وہاں کمہار پر کون لدے گی۔ اور گدھا اس کمہار سے بدلہ لیگا، اسی طرح دوسرے جانور بدلہ لیں گے۔ اور یہ حق ہے ایسا ہی ہوگا اور ہم بھی وہاں ان کی بولی سمجھیں گے۔

اور یہاں کعبہ کی طرف کو منہ کرکے پیشاب کرتے رہتے ہیں اگر وہ بولتا تو شکایت کرتا کہ میں محترم ہوں پھر بھی تو میری طرف منہ کرکے پیشاب کرتا ہے۔

اپنی ذات کو تکلیف

انسان کے گناہ کرنے سے اس کو سزا دی جاتی ہے، جو انسان گناہ کرتا ہے وہ اپنی ذات کو تکلیف پہونچانے کا ذریعہ بنا، خود اس کی ذات اس کی ایذاؤں سے محفوظ نہیں، لہٰذا وہ کامل مسلمان نہیں، نیز زندگی میں بھی گناہ کرنے سے اس کے دل اور روح کو تکلیف پہونچتی ہے، پس جس شخص کا خود اپنا دل اپنی روح اس کی ایذاؤں سے محفوظ نہیں وہ کامل الایمان نہیں ہوسکتا ہے۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء

امتی کے نامہ اعمال حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کئے جاتے

ہیں، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے نیک اعمال سے خوشی ہوتی ہے، اور برے اعمال سے تکلیف ہوتی ہے، پس گنہگار انسان اپنے محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایذاء پہونچاتا ہے، پس وہ کامل الایمان کیسے ہوسکتا ہے۔

مرحوم والدین کو ایذاء

اسی طرح انسان کے اعمال نامے اس کے مرحوم والدین کی خدمت میں بھی پیش کئے جاتے ہیں، اور ان کو بھی نیک اعمال سے خوشی اور برے اعمال سے تکلیف ہوتی ہے، پس گنہگار انسان اپنے مرحوم والدین کو بھی ایسے ہی مرحوم اساتذہ ومشائخ کو تکلیف پہونچاتا ہے، پس وہ کامل الایمان کیسے ہوسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو ایذاء

خود بندہ کے گناہوں سے حق تعالیٰ شانہ کو ایذاء ہوتی ہے، کہ اس کا بندہ ہوکر ہر وقت اس کے کروڑوں احسانات کے ہوتے ہوئے اسی کی نافرمانی کرتا ہے اور اپنے دل میں اس کی محبت بسانے کے بجائے اس کے غیر کی محبت کو اپنے دل میں بساتا ہے، حق تعالیٰ شانہ کو اس سے غیرت آتی ہے اور ایذاء ہوتی ہے، جو شخص اپنے خالق ومالک تعالیٰ شانہ کو بھی ایذاء پہونچاتا ہے وہ کامل الایمان کیسے ہوسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ بھی مسلم ہے چونکہ اس کا مومن ہونا قرآن شریف سے ثابت ہے اور جو مومن ہو وہی مسلم ہوتا ہے اور وہ تو ایسا ہے کہ ہر وقت ساتھ ہی رہتا ہے دیکھتا ہے سنتا ہے کسی وقت جدا ہوتا ہی نہیں، یہ اس کی مہربانی ہے کہ فوراً سزا نہیں دیتا، کسی کی ستاری ہے کہ اس کی پردہ دری نہیں کرتا، چلمن میں چھپائے رکھتا ہے قادر ہے کہ فوراً سزا دے مگر رحیم ہونے کی وجہ سے نہیں دیتا کبھی کبھی کسی کو کچھ عذاب دیتا ہے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔

اعجاز حدیث

حدیث پاک سے پورا دین نکل رہا ہے، یہ حدیث پاک کا اعجاز ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جوامع الکلم عطا فرمائے گئے ہیں، کہ ایک ایک جملہ میں معانی کا دریا کا دریا بھرا ہوا ہے۔

والمهاجر من هجر ما نهى الله عنه: اور مہاجر وہ شخص ہے جو چھوڑ دے ان سب چیزوں کو جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔

جس شخص کے لئے اپنے وطن میں رہکر شریعت پر عمل کرنا ناممکن ہو جائے اور وہ دین کی خاطر شریعت کی خاطر اپنے وطن عزیز کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں وہ آسانی شریعت پر عمل کر سکے تو اس کو عرف میں مہاجر کہتے ہیں اور اس ترک وطن کو ہجرت۔ جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے گئے تھے ایسے ہی جو لوگ شام یا کسی اور ملک یا شہر کو چھوڑ کر مکہ مدینہ آ گئے یہ مہاجرین کہلاتے ہیں، لیکن یہ باعتبار عرف ہے۔

حقیقت میں مہاجر وہ ہے جو ان تمام چیزوں کو چھوڑ دے جن کو اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے چاہے وہ از قبیل ماکولات ومشروبات ہوں اور چاہے از قبیل منکوحات ہوں ظاہر ہوں یا باطن۔ اس اعتبار سے سب مسلمان مہاجر بن سکتے ہیں۔

جو لوگ دار الکفر میں ہیں وہ تو طریق مذکور سے مہاجر بن سکتے ہیں، مگر وہ مسلمان جو دار الاسلام میں رہتے ہیں وہ مہاجر نہیں بن سکتے مگر اس طریقہ سے کہ وہ ان تمام چیزوں کو چھوڑ دیں جو من جانب اللہ ممنوع ہیں۔

بالفاظ دیگر اس طرح سے اس کو تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ ہجرت لغۃ بمعنی ترک ہے اور شرعی

تعریف یہاں مذکور ہے۔ پھر ہجرت اسلام میں دو طرح پر واقع ہوئی ہے۔

(۱) **الانتقال من دار الخوف الی دار الامن.** جیسے ہجرت حبشہ میں۔

(۲) **الانتقال من دار الکفر الی دار الایمان.** یہ اس وقت عمل میں آئی جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام مکہ کو چھوڑ کر (جو اس وقت دار الکفر تھا) مدینہ میں جا کر قیام پذیر ہوئے۔ اور اس زمانہ میں جب ہجرت بولا جاتا تھا تو فتح مکہ تک ہجرت مدینہ ہی مراد ہوتی تھی۔ پھر یہ خصوصی معنی فتح مکہ کے ساتھ ختم ہو گئے اور عمومی معنی یعنی دار الکفر سے دار الایمان کی جانب ہجرت باقی رہ گئے۔ (فتح الباری: ۱/۲۵)

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ہجرت کی دو قسمیں ہیں:

(۱)......ہجرت ظاہرہ۔ (۲)......ہجرت باطنہ۔

ھجرت ظاھرہ: تو یہ ہے کہ دین کو فتن سے بچانے کے لئے کسی جگہ سے دوسری جگہ جائے۔

ھجرت باطنہ: یہ ہے کہ ان برائیوں کا ارتکاب نہ کرے جن کی جانب نفس و شیطان داعی ہوتے ہیں۔

اور گویا کہ مہاجرین کو خطاب ہے تا کہ وہ حضرات صرف نقل مکانی پر اکتفا نہ کریں بلکہ اوامر کی اتباع اور نواہی سے اجتناب کریں۔ اور ممکن ہے کہ فتح مکہ کی وجہ سے انقطاع ہجرت کے بعد ان لوگوں کی تطییب خاطر کے لئے فرمایا گیا ہو جو لوگ ہجرت کی فضیلت کو نہیں پا سکے۔ کہ ہجرت کاملہ یہی ہے کہ منہیات شرع کو چھوڑ دے۔ (فتح الباری: ۱/۷۸)

المھاجر: میں الف لام ایسا ہی ہے جیسا کہ المسلم میں یعنی مہاجر کامل وہ شخص ہے جو تمام منہیات سے رک جائے۔

المهاجر : باب مفاعلت سے اسم فاعل ہے جو جانبین سے اشتراک کا تقاضہ کرتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ مہاجر اسم فاعل کے معنی میں اور واحد کے لئے ہے۔ جس طرح مسافر واحد کے لئے ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کو باب کے اصلی معنی میں رکھا جائے اور کہا جائے کہ چونکہ جو اپنے وطن کو چھوڑ رہا ہے تو لازمی طور پر اس کو اس کے وطن سے مجبور کر دیا گیا ہے۔ (فتح الباری:۱/۷۸)

فائدہ: حدیث کے دونوں جملوں "المسلم من ......" اور "المهاجر من......" میں مناسبت یہ ہے کہ جس طریقہ سے کمال ایمان کی علامت سلامتی ہے اور دوسروں کا اس سے محفوظ ہونا ہے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہجرت بھی کمال ایمان کی علامت تھی۔ (تحفۃ المرأۃ:۱۱۶)

هذا لفظ البخاری: حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث افرادِ بخاری میں سے ہے اور مسلم میں یہ حدیث نہیں ہے البتہ امام مسلمؒ نے دوسرے طریقہ سے اس کے معنی کو روایت کیا ہے۔ (فتح الباری:۱/۷۸)

اسی اہم نکتہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے امام خطیب تبریزیؒ نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ اور آگے فرمایا ہے: "ولمسلم قال ان ......"

"ای المسلمین خیرٌ" اس پر اشکال یہ ہے کہ ایک روایت میں "ای الاسلام خیر" ہے اس کے جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "تطعم الطعام وتقرأ السلام ......" اور ایک روایت میں ہے: "ای الاعمال افضل" جس کے جواب میں "الصلوة لوقتها" فرمایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد روایات میں مختلف جوابات وارد ہوئے ہیں حالانکہ الفاظ سوال تقریباً ایک ہی ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اختلاف جواب سائلین کے حال کے اعتبار سے ہے کہ

سائل کی حالت کے اعتبار سے جواب دیا، مثلاً اگر کسی سائل میں شان سلامتی ہے، تو اس کو فرمادیا"من سلم المسلمون من لسانه ویده" وقس البواقی.

یا اختلاف زمانہ پر محمول ہے کہ جس زمانہ میں ایثار کی ضرورت ہوتو اطعام طعام فرمایا گیا اور جس زمانہ میں نماز کا اہتمام بتانا مقصود ہوا تو نماز کو افضل بتایا۔ (تنظیم الاشتات: ۴۱/۱، فتح الباری: ۸۱/۱)

یا الفاظِ سوال کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف جوابات دیئے مثلاً "ای المسلمین خیر" سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں سے جو افضل ہو اور خیر ہو اس کے بارے میں سوال ہے۔ لہٰذا اس کا جواب "من سلم المسلمون......" سے دیا۔ اور "ای الاسلام خیر" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کونسی خصلت اسلامی بہتر ہے تو اس کے جواب میں فرمایا "تطعم الطعام وتقرأ السلام......" (المفہم شرح مسلم: ۲۲۳/۱)

خلاصۂ حدیث

تمام عبادات میں حظ نفس کا دخل ہوسکتا ہے۔ نماز میں اس خیال کا دخل ہوسکتا ہے کہ لوگ عزت کرینگے۔ حج میں سیر وتفریح کے خیال کا دخل ہوسکتا ہے۔ روزہ میں اسکا دخل ہوسکتا ہے کہ صحت ہوتی ہے۔ زکوۃ میں بھی یہ بات پیدا ہوسکتی ہے کہ یہ بڑا سخی ہے۔ لیکن جب انسان یہ خیال کرتا ہے کہ مجھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے اور اتنا اہتمام کرے آدمی کہ پڑوسی کو کچھ بھی تکلیف نہ پہنچے تو اس میں حظ نفس کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ نفس پر بار ہوتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان فرشتہ بن جاتا ہے۔

بہت سے لوگ تکلیف پہونچانے کا ارادہ تو نہیں کرتے مگر اس سے بچنے کا بھی اہتمام نہیں کرتے۔ مثلاً کیلا کھایا یا سیب کھائے اور چھلکے باہر ڈالدئے، جن کو غریب پڑوسیوں کے بچے دیکھیں گے اور ان کو احساس ہوگا تو اس صورت میں اگر اس نے قصد ایذا کا نہیں کیا تو ایذا

سے بچنے کا ارادہ بھی نہیں کیا لوگ دیکھیں گے تو خیال کریں گے کہ مولانا تو روز سیب کھاتے ہیں۔ پر ہمیں کبھی نصیب نہیں ہوتے تو تکلیف پہنچی۔ یہ مقام تمام ریاضتوں سے بڑھ کر ہے اور سب سے زیادہ مشکل ہے۔

کبھی انسان خود تکلیف نہیں پہنچاتا لیکن متعلقین میں سے کوئی تکلیف پہنچاتا ہے۔ کبھی بیوی تکلیف پہنچاتی ہے کبھی کوئی اور متعلق اور کبھی گھر والے لہ مولانا نے کیوں اہتمام نہیں کیا بعض مولانا کے یہاں کوئی موٹے سے اچھے کپڑے پہنے آئے تو بچے چپٹے جاتے ہیں پیسے پیسے اگر اس وقت پیسے نہ ہوں تو ان کو ندامت ہوتی ہے۔ تو اس نے کیوں ایسی تربیت کی کیوں ایسی عادت ڈالی۔

کامل الایمان اور اہل علم کی شان تو یہ ہونی چاہئے جیسا کہ کوئی بزرگ چینی خرید کر لا رہے تھے راستہ میں چیونٹیوں پر نظر پڑی تو واپس چینی وہیں پہنچا کر آئے کہ ممکن ہے ان کے جوڑے وہاں رہ گئے ہوں جس کی وجہ سے ان کو تکلیف ہو۔ ؎

شنیدم کہ مردان راہِ خدا ۔۔۔ دل دشمناں ہم نہ کردند تنگ

ترا کے میسر شود ایں مقام ۔۔۔ کہ با دوستانت خلاف ست و جنگ

ایک بزرگ کے گھر میں ایک چور داخل ہوا وہاں اس کو کچھ نہ ملا، صاحب مکان نے خیال کیا کہ ہمارے گھر مہمان آئے اور خالی ہاتھ جائے یہ ہماری شایان شان نہیں اس لئے اپنی کملی راستہ میں ڈالدی تا کہ محروم واپس نہ ہو۔

ہر انسان اور ہر طبقہ اپنے کو اچھا سمجھتا ہے۔ مگر کردار کے اعتبار سے وہ انسان اچھا ہے جو اس بات کا اہتمام کرے اس سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، ظاہراً تو یہ بہت آسان ہے مگر حقیقتاً بڑا کٹھن ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

تمام عمر اس احتیاط میں گذری

کہ آشیاں شاخ چمن پر بار نہ ہو

﴿اللہ کے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت عین ایمان ہے﴾

﴿۲﴾ عَنْ اَنَسٍ[۱] رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ (متفق علیہ)

حوالہ: بخاری شریف: ۷/۱، باب حب الرسول من الایمان، کتاب الایمان، عالمی حدیث نمبر: ۱۵، مسلم شریف: ص۴۹/۱، باب وجوب محبۃ الرسول اکثر من الاھل الخ، کتاب الایمان، حدیث نمبر: ۴۴۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن (کامل) نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کو اس کے باپ، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

تشریح: لَا یُؤْمِنُ: میں جو نفی کی گئی ہے وہ کمال ایمان کی گئی ہے نفسِ ایمان کی نہیں۔ اس حدیث میں دو چیزوں کو ذکر کیا ایک اصول سے ایک فروع سے یعنی ایک والد ایک اولاد انہیں دو کو بطور خاص ذکر کیا۔ کیونکہ انسان والدین سے محبت اس لئے کرتا ہے کہ وہ ان سے پیدا ہوا ہے وہ اس کا سبب بنے ہیں۔

---

[۱] **احوال**: انس بن مالک بن النضر الانصاری، قبیلہ خزرج کی جانب نسبت کرتے ہوئے خزرجی کہے جاتے ہیں، ہجرت کے وقت دس سال کی عمر تھی تبھی آپ کی والدہ ام سلیم بنت ملحانؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سونپ دیا، اسی وقت سے وصال تک دس سال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی، حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں تعلیم فقہ کے لئے بصرہ منتقل ہو گئے۔ اور وہیں ۹۳ھ میں ایک سو تین سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کی کنیت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوحمزہ اور لقب ''ذوالاذنین'' قرار دیا تھا، کثیر الاولاد تھے اور بصرہ میں سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی تھے۔ (اصابہ: ۷۱/۱، مرقاۃ: ۶۳، ۶۴/۱)

پھراولاد سے محبت ہوتی ہے فروع ہونے کی وجہ سے اس لئے کہ اولاد سے اس کا کام بھی چلے گا اور نام بھی۔اس وجہ سے ان دو کو ذکر کیا۔

اور والد کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر ولد کے لئے والد کا ہونا ضروری ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کی اولاد بھی ہو، یا والد کی تقدیم عظمت اور زمانہ کے اعتبار سے مقدم ہونے کی وجہ سے ہے۔

البتہ نسائی کی روایت میں ولد، والد پر مقدم ہے مزید شفقت کی وجہ سے، نیز ولد میں اولاد ذکور واناث دونوں داخل ہیں البتہ والد کو اگر ذو ولد کے معنی میں لیا جائے تو ماں بھی داخل ہے۔ورنہ کہا جائے گا کہ نسبت اشرف کی جانب ہے اور چونکہ والد وولد کی محبت عاقل کے نزدیک مال سے زیادہ ہوتی ہے بلکہ بسا اوقات اپنی جان سے زیادہ یہ عزیز ہوتے ہیں لہذا نفس اور مال کا تذکرہ نہیں کیا۔(فتح الباری:۸۴-۱/۸۵)

و الناس اجمعین: میں تو بالکلیہ نفی ہی کردی۔(یہ عطف العام علی الخاص کے قبیل سے ہے)جب کہ انسان استاد سے محبت کرتا ہے دوستوں سے محبت کرتا ہے اور دوسرے انسانوں سے محبت کرتا ہے۔تو ایسا نہیں کہ محبت کرنیکی اجازت نہیں بلکہ من جانب اللہ محبت کرنیکی اجازت ہے۔مگر تصادم کے وقت دیکھا جاتا ہے کہ ترجیح کس کو دیتے ہیں۔اگر اس وقت اللہ تعالیٰ کی محبت کو ترجیح دیتے ہیں تو ٹھیک ہے ایمان کامل ہے ورنہ نہیں۔

حضرت حسنؓ چھوٹے سے بچے تھے انہوں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ تمہیں اماں سے محبت ہے؟ کہا کہ ہاں۔پھر پوچھا کہ بھائی سے محبت ہے؟ کہا کہ ہاں۔پھر پوچھا کہ مجھ سے محبت ہے؟ کہا کہ ہاں۔پھر پوچھا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت ہے؟ کہا کہ ہاں۔حضرت حسنؓ نے کہا یہ دل کیا ہوا یہ تو کشکول ہوا آپ نے فرمایا کہ محبت تو اللہ تعالیٰ ہی سے ہے اوروں سے تو صرف تعلق ہے۔حضرت حسنؓ نے عرض کیا کہ پھر تو یوں کہو، یہ صحیح ہے۔

اقسام محبت

علامہ طیبیؒ نے خطابیؒ سے نقل کیا ہے کہ محبت کی تین قسمیں ہیں:(۱) محبت لذت جیسے مرد کی عورت سے محبت،(۲) محبت نفع جیسے نفع بخش شئی سے محبت۔(۳) محبت فضل جیسے اہل علم کا ایک دوسرے کی علم کی بنا پر محبت و تعظیم کرنا، پھر محبت یا تو طبعی غیر اختیاری ہوگی، یا عقلی اختیاری ہوگی یہاں پر حب عقلی اختیاری مراد ہے کہ نا جائز امر کی طرف اگر چہ دل مائل ہو لیکن یہ سمجھ کر کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہی میں دنیوی واخروی فائدہ ہے،اس کو ترک کر کے سنت کا اتباع کرے۔اور چونکہ محبت طبعی ایک قلبی میلان ہے،جس پر بندہ کا بس نہیں لہذا وہ مراد نہیں۔لایکلف اللہ نفساً الا وسعھا. (طیبی:۱۱۸/۱،مع زیادۃ)

بعض دیگر محققین علماء کی رائے یہ ہے کہ یہاں پر محبت قلبی مراد ہے۔جو میلان قلب کا نام ہے اور یہ کہنا کہ حب طبعی طاقت بشریہ سے خارج ہے یہ مساحمت ہے۔کیونکہ کبھی عاشق اس درجہ کو پہنچ جاتا ہے کہ محبوب کی محبت کو اپنے نفس کی محبت پر بھی ترجیح دیدیتا ہے یہی رائے ہے حضرت شاہ ولی اللہؒ، طیبیؒ اور علامہ عینیؒ کی۔(تنظیم الاشتات:۴۲/۱)

اور اسی کی تائید ہوتی ہے قاضی عیاض ابن بطالؒ وغیرہ کے قول سے جو فرماتے ہیں کہ محبت کی تین قسمیں ہیں۔

(۱)......محبت اجلال واعظام جیسے والد سے اولاد کو محبت ہوتی ہے۔

(۲)......محبت شفقت ورحمت جیسے کہ والد کی اولاد سے محبت۔

(۳)......محبت مشاکلت واستحسان جیسے کہ تمام لوگوں سے ہوتی ہے حضور اقدس صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے ان تینوں محبتوں کو جمع فرمایا اور یہ حق بات ہے کہ جو مومن کامل ہوگا وہ یہ اعتقاد کریگا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی محبت ان تینوں جماعتوں سے

زیادہ مؤکد ہے۔ کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی کی وجہ سے جہنم سے چھٹکارا اور گمراہی سے ہدایت ملی ہے، اور حق تعالیٰ شانہ کی بے شمار نعمتیں حاصل ہوئیں۔(نووی:۲/۱۴)

اسباب محبت

اب جاننا چاہئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبت کیوں ہونا چاہئے۔تو اسباب محبت چار چیزیں ہوا کرتی ہیں، جمال، کمال، نوال، قرابت، کسی کے اندر جمال ہو اس سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔جمال پر بعض حیوان بھی عاشق ہو جاتے ہیں۔جیسے بعض پرندے چاند کے حسن پر عاشق ہیں اور پروانے چراغ کی روشنی پر عاشق ہیں کہ جان دیدیتے ہیں۔اور کسی پر کسی کا احسان ہو تو اس سے محبت ہو جاتی ہے۔انسان تو انسان ہے، موذی جانور بھی احسان کی وجہ سے محبت کرنے لگتے ہیں اور محسن کے تابع ہو جاتے ہیں۔کتے، شیر، بلی وغیرہ کو اپنے مالک سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔اگر کسی کے اندر حسن بھی نہیں احسان بھی نہیں مگر صاحب کمال ہے، بڑا عالم اور بزرگ ہے، اس سے محبت ہو جاتی ہے، چاہے کتنا ہی بدصورت اور بدشکل کیوں نہ ہو۔اور قرابت کی وجہ سے محبت ہونا تو بدیہی بات ہے۔ان میں سے کوئی ایک سبب موجود ہونے سے محبت ہو جاتی ہے۔اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر یہ تمام چیزیں علی وجہ الاتم والاکمل موجود ہیں۔...... ؎

جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں
اور تیرے کمال کسی میں نہیں مگر دو چار

لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام مخلوق سے زیادہ محبت کا ہونا لازمی اور بدیہی چیز ہے۔حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اجمل الخلائق پیدا کیا اور کیونکر نہ ہو

جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب بنایا تو سب سے زیادہ حسین ضرور بنائے گا۔ اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ ان کو دنیا کا نصف جمال دیا گیا۔ مگر متکلم حکم سے خارج ہوتا ہے لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ جس ہستی کو اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کے مکارم سے مزین کیا تو صورت کے اعتبار سے بھی اعلیٰ ہونا چاہئے۔ اس کیلئے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے دو شعر ہی کافی ہیں۔

فرمایا:۔ ؎

واحسن منک لم تر قط عینی واجمل منک لم تلد النساء
خلقت مبرأ من کل عیب کانک قد خلقت کما تشاء [1]

اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ:۔ ؎

لنا شمس وللأفاق شمس وشمسي خير من شمس السماء
وشمس الناس تطلع بعد فجر وشمسي تطلع بعد العشاء [2]

اس کے علاوہ شمائل کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن و جمال کے بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ چودہویں کا چاند نکلا ہوا تھا، اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، میں کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور کو دیکھتا تھا اور کبھی چودہویں کے چاند کو دیکھتا تھا، اور حیران تھا کہ دونوں میں کون زیادہ حسین ہے، آخر میں نے فیصلہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ

---

[1] **ترجمہ:** میری آنکھوں نے کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی حسین نہیں دیکھا، اور عورتوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی صاحب جمال نہیں جنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر عیب سے پاک پیدا کیا گیا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مرضی کے مطابق پیدا کئے گئے ہوں۔

[2] **ترجمہ:** ہمارا بھی سورج ہے، اور آسمان کا بھی سورج ہے، اور میرا سورج آسمان کے سورج سے بہتر ہے، لوگوں کا سورج فجر کے بعد طلوع ہوتا ہے، اور میرا سورج عشاء کے بعد طلوع ہوتا ہے۔

تعالیٰ علیہ وسلم چودہویں کے چاند سے زیادہ حسین ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

چاند سے تشبیہ دینا بھی کوئی انصاف ہے
چاند میں ہیں چھائیاں اور حضرت کا چہرہ صاف ہے

اور کمال کا تو ٹھکانہ ہی نہیں خواہ علمی ہو یا عملی، اخلاقی ہو یا تعلق مع اللہ کے اعتبار سے ہو یا تعلق مع الناس کے اعتبار سے ہو، خود اللہ جل شانہ کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے: "انک لعلیٰ خلق عظیم" تمام انبیاء علیہم السلام کو جو کمالات تقسیم کر کے دیئے گئے وہ سب بلکہ ان سے بدرجہا بڑھ کر تنہا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیئے گئے۔ ؎

لیس علی اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی الواحد

اللہ تعالیٰ پر یہ کچھ بھی دشوار نہیں کہ تمام عالم کو ایک ذات میں جمع کر دے۔

حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

خلاصہ یہ ہے کہ: ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا احسان ورحمت ورافت کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہے: "وما ارسلنک الا رحمة للعالمین[1]" الآیة. تمام بنی آدم کو دوزخ ابدی سے بچانے کی کوشش فرمائی اور بہتوں کو بچایا بھی۔ اور بھی ارشاد ہے: "وکنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منها[2]"، بہرحال یہ تینوں اسباب تو ظاہر ہیں البتہ قرابت میں کچھ پوشیدگی ہے۔ لیکن اگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو آپ کی قرابت

---

[1] ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام دنیا جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

[2] اور تم جہنم کے گڑھے کے کنارہ پر تھے، پس اس نے تم کو اس سے بچایا۔

دوسروں کی قرابت سے اقویٰ ہے۔ کیونکہ دوسروں کی قرابت جسمانی ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے قرابت روحانی ہے۔ اسی کو قرآن کریم میں بیان کیا گیا: "**النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم**" کہ نبی سے تعلق ایمانداروں کو اپنی ذات سے بھی زیادہ ہے اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایمان والوں پر ان کی جانوں سے زیادہ قریب اور مہربان ہیں، اور بمنزلہ باپ کے ہیں، بلکہ باپ سے اور دنیا بھر کے باپوں سے بدرجہا بڑھ کر ہیں۔ چنانچہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ قرأت: "**وھو اب لھم**" ہے۔ اور ابوداؤد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے: "**قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما انا لکم بمنزلۃ الوالد**[1]" تو جب یہ اسباب محبت حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر علی وجہ الاتم والاکمل موجود ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے محبت بھی سب سے زیادہ ہونا عقل کا تقاضا ہے۔

پھر جاننا چاہئے کہ محبت کے دو درجے ہیں۔ ایک درجہ کمال۔ دوم درجۂ ناقص۔ درجۂ کمال حاصل ہوگا کمال اتباع سے۔ اسی کو دوسری حدیث میں فرمایا گیا: "**لایؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعاً لما جئت بہ**" اگر کمال اتباع نہ ہو تو محبت ہو سکتی ہے۔ لیکن ناقص ہوگی۔ تو معصیت کے ساتھ محبت جمع ہو سکتی ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک آدمی شراب پی کر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مجلس میں آیا تو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے لعنت کرنا شروع کیا تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: "**لا تلعنوہ فانہ یحب اللہ و رسولہ الخ**" [اس کو لعنت مت کرو اس لئے اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے محبت ہے۔] اس سے معلوم ہوا کہ گنہگاروں کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے دل میں اللہ و رسول کی محبت نہیں بلکہ محبت ہے مگر

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں تمہارے لئے باپ کے درجہ میں ہوں، یعنی جس طرح باپ اپنی اولاد پر مہربان ہوتا ہے، میں تم پر اسی طرح مہربان ہوں۔

ناقص۔ نفسانی خواہش کی بناء پر مغلوب ہے۔ اور مطلوب کامل محبت ہے نہ کہ ناقص۔

علامت محبت

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تمام مخلوق سے زائد ہونا معلوم ہوگیا تو اس کی علامت اور نشانی کیا ہوگی، کیونکہ ہر شخص یہی دعویٰ کرتا ہے کہ مجھ کو سب سے زیادہ محبت ہے، اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث پاک میں خود ارشاد فرمادیا: ''من احب سنتی فقد احبنی'' [کہ جس شخص نے میری سنت سے محبت کی پس بے شک اس نے مجھ سے محبت کی] معلوم ہوگیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سنتوں سے محبت یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی نشانی ہے۔

اور سنت سے محبت کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایک سنت کو خود بھی اختیار کرے اور اس پر عمل کرے اور اپنی زندگی میں لائے اور اپنی پوری زندگی سنت کے مطابق گذارنے کی کوشش کرے اور اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سنتوں کو اپنے گھر والوں میں محلہ والوں میں بستی والوں میں اپنے معاشرہ وماحول میں پھیلانے کی کوشش کرے۔ جو شخص جتنی جتنی یہ محنت کریگا اسی درجہ وہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والا شمار ہوگا، اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مبارک سنتوں کا اتباع کئے بغیر محبت کا دعویٰ معتبر نہ ہوگا، بلکہ وہ محبت ناقص یا غیر معتبر ہوگی، جیسا کہ کسی نے کہا ہے۔ ؎

تعصی الرسول و انت تظهر حبه   ان هذا لفی الفعال بدیع

لو کان حبک صادقا لاطعته   ان المحب لمن یحب مطیع

[تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی بھی کرتا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ بھی کرتا ہے۔ بیشک یہ تو کاموں میں عجیب بات ہے، اگر تیری محبت

سچی ہوتی تو ان کا مطیع وفرمانبردار ہوتا، اس لئے کہ بیشک محب اپنے محبوب کا مطیع وفرمانبردار ہوتا ہے۔]

پس معلوم ہوا کہ ایمان کے لئے کسوٹی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے، جس درجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہوگی اسی درجہ ایمان ہوگا، اگر محبت کامل درجہ کی تو ایمان بھی کمال درجہ کا، محبت ادنیٰ درجہ کی، ایمان بھی ادنیٰ درجہ کا۔

اور محبت کے لئے کسوٹی اتباع سنت ہے، جس درجہ اتباع سنت اسی درجہ محبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔

فائدہ: حدیث پاک میں حتی اکون الخ فرمایا ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات اس کے ماسواء سے سب سے زیادہ محبوب ہوجائے اور ذات میں افعال، اقوال، احوال، عادات سب داخل ہیں، پس مطلب یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال مبارکہ، اقوال مبارکہ، احوال مبارکہ، عادات مبارکہ سب کے سب اس کے ماسواء سے سب سے زیادہ محبوب ہوجائیں۔

کسی نے خوب کہا ہے۔ ؎

وہی سمجھا جائے گا شیدائے جمال مصطفےٰ
جس کا حال حالِ مصطفیٰ ہو اور قال قالِ مصطفےٰ

﴿ایمان کی واقعی حلاوت﴾

﴿۷﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ، مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا

سِوَاهُمَا وَمَنْ اَحَبَّ عَبْداً لَا يُحِبُّهُ اِلَّا لِلّٰه وَمَنْ يَكْرَهُ اَنْ يَعُوْدَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ اَنْ اَنْقَذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُلْقَىٰ فِي النَّارِ۔ (متفق علیه)

حواله: بخاری شریف:ص ۸/۱،باب من کره ان یعود فی الکفر کما یکره ان یلقی فی النار من الایمان، کتاب الایمان، حدیث نمبر:۲۱، مسلم شریف: ص۴۹/۱،باب بیان خصال من اتصف بهن الخ، کتاب الایمان، حدیث نمبر:۴۳۔

حل لغات: حلاوة، حلا الشئ (ن) حلاوة، میٹھا ہونا، یکره، کره الشئ (س) کرهاً و کراهیة، نفرت کرنا، احب کی ضد ہے، یعود، عاد الیه وله (ن) عوداً، لوٹنا واپس ہونا، انقذه (افعال) جان بچانا، نجات دلانا۔

ترجمه: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ جس میں تین خصلتیں ہوں گی وہ ان کی وجہ سے ایمان کی حقیقی لذت پالیگا، پہلی چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت بقیہ تمام چیزوں سے زیادہ ہو، دوسری چیز یہ ہے کہ کسی بھی انسان سے محبت ہو تو وہ محض اللہ تعالیٰ کی وجہ سے ہو، تیسری چیز یہ ہے کہ کفر کی تاریکی سے نجات پانے کے بعد، کفر میں لوٹنے کو اتنا ہی برا سمجھے، جتنا کہ آگ میں ڈالے جانے کو برا سمجھتا ہے۔

تشریح: عنه ثلث من كن فيه: ثلث اجمال ہے یعنی تین چیزیں ایسی ہیں کہ جس میں یہ پائی جائیں وہ ایمان کی حلاوت پالیتا ہے۔

وعنه ای عن انسؓ: یعنی جس طرح گذشتہ روایت کے راوی حضرت انسؓ تھے اس روایت کے راوی بھی وہی ہیں۔

ثلاث: مبتدا ہے ایک جماعت کے نزدیک، اور اگر وجوہ تخصیص میں سے کسی

طریقہ سے تخصیص ہوجائے تو نکرہ مبتدا واقع ہوجاتا ہے لہذا یہاں پر تنوین تعظیم ہے۔ یا مضاف الیہ محذوف کے عوض ہے یا اس کا موصوف محذوف ہے۔

کـــن: حصلن کے معنی میں تامہ ہے، اور روایت میں استعارہ تخیلیہ ہے، کیونکہ مومن فی الایمان کی رغبت کو کسی میٹھی چیز سے تشبیہ دیکر اس کے لازم کو ثابت کر کے ایمان کی جانب اس کی اضافت کی گئی ہے۔ اور اس میں تندرست اور مریض کے قضیہ کی جانب اشارہ ہے کیونکہ اگر صفراوی مریض ہے تو اس کو شہد کا مزہ کڑوا معلوم ہوگا، اور تندرست ہی اس کی حقیقی حلاوت کو چکھتا ہے۔ لیکن جوں جوں اس کی صحت کم ہوتی جائیگی، اس کے ذوق میں بھی کمی واقع ہوتی رہے گی، اسی طرح جو شخص خصائل ایمانی سے کامل طور پر متصف ہے، ایمانی حلاوت سے مالا مال ہوگا اور جس قدر خصائل ایمانی میں کمی ہوگی اسی قدر حلاوت ایمانی سے بے بہرہ ہوگا۔ (فتح الباری: ۱/۸۷، رقم الحدیث: ۱۶)

شیخ محی الدینؒ فرماتے ہیں یہ حدیث عظیم اور اصول دین میں سے ایک اصل ہے اور حلاوۃ ایمان کا مطلب یہ ہے کہ طاعات میں لذت حاصل ہو، دین کے لئے مشقت برداشت کرے اور اغراض دنیویہ پر دینی معاملہ کو ترجیح دے۔ (ایضاً: ۱/۸۶،۸۸)

قاضی بیضاویؒ جو حب سے حب عقلی مراد لیتے ہیں ان کی رائے یہ ہے کہ مراد ان چیزوں کو ترجیح دینا ہے جن کو عقل سلیم راجح قرار دیتی ہے خواہ وہ خواہش نفسانی کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں، جیسا کہ مریض دواء کو ناگوار سمجھ کر طبعاً اس سے متنفر ہوتا ہے اور اس کے فوائد کا لحاظ کر کے بمقتضائے عقل اس کی جانب متوجہ بھی ہوتا ہے ایسے ہی اگر احکام شرع قلبی امراض کی بنا پر طبعاً خراب لگیں لیکن عقل یہ تامل کر کے کہ شارع کے اوامر ونواہی میں دنیوی صلاح اور اخروی فلاح ہے تو عقل امتثال کو ترجیح دے کر اس کا اتباع کرے جس سے ایک لذاذ عقلی کی حالت ہوگی وہ حالت ہی حلاوت ایمان ہے۔ (فتح الباری: ۱/۸۷،۱۶، التنظیم الاشتات: ۱/۴۴)

فرمایا کبھی ایمان چکھا ہے؟ ایمان کی دکانیں دیکھی ہیں؟ یہی مدرسے اور خانقاہیں ایمان کی دکانیں ہیں۔ کبھی کسی پیر سے کہا ہے؟ کہ ایمان چکھا دیجئے۔ سب سے بڑی دکان اس کی حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہے انہوں نے بتلا دیا کہ تم اپنے اندر ان تین چیزوں کو پیدا کرلو تو تم خود ایمان کی حلاوت محسوس کرو گے۔

شئ اول: ان میں سے اول یہ ہے کہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم دنیا وما سوا سے زیادہ محبوب ہو جائیں۔

اور اس کی پہچان یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حکم آجائے تو سب چیزوں کو نظر انداز کردے اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم کے برخلاف کھانے کو چھوڑ دے خواہ کیسا ہی لذیذ ہو، تجارت کو چھوڑ دے خواہ کیسی ہی نفع بخش ہو، سب چیزوں کو لات مار دے ایمان کامل کی یہ اصل پہچان ہے۔

مما سواهما: ما موصولہ کو استعمال کیا گیا نہ کہ "من" کو۔ تا کہ یہ ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں کو شامل ہو۔ (ایضا)

اشکال مع جوابات

اشکال: اس پر اشکال یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور ذات باری کے لئے اس روایت میں ضمیر تثنیہ لائی گئی ہے۔ حالانکہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطیب پر جب اس نے کہا۔ "**من يطع الله ورسوله فقد رشد ومن يعصهما فقد غوى**" رد کیا اور فرمایا: "**بئس الخطيب انت**" کیونکہ اس نے اللہ اور نبی اللہ کے لئے ضمیر تثنیہ استعمال کی تھی۔

جوابات: اس کے شراح نے متعدد جوابات دئے ہیں۔

(۱)...... یہاں یادداشت اور حفظ کرنے کے لئے اختصار پیشِ نظر ہے۔ اور خطبات میں تفصیل وایضاح مقصود ہوتی ہے لہٰذا خطبہ میں اختصار کرنے پر ردفرمایا۔

(۲)...... یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کیونکہ دوسرے کے ایسا کہنے سے خدا اور رسول میں مساوات کا وہم ہوسکتا ہے۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں نہیں ہوسکتا۔

(۳)...... مراد یہ ہے کہ شریعت میں دونوں محبتوں کا مجموعۂ مرکب مراد ہے اگر صرف ایک کی محبت ہوگی بدون دوسرے کی محبت کے۔ تو وہ بیکار ہے اور خطیب کے کلام میں مجموعہ کا نہیں بلکہ کل واحدِ واحد کا اعتبار تھا، کہ دونوں میں سے ہر ایک کی نافرمانی ضلالت ہے، لہٰذا اس پر نکیر فرمائی۔

(۴)...... خطیب نے وقف میں غلطی کی تھی کہ اس نے پڑھا تھا "من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصھما" یہاں وقف کیا تھا، جس سے وہم ہوسکتا ہے کہ "من یعصھما" کا عطف "من یطع" پر ہے، تو دونوں کا حکم ہوگا، فقد رشد اور یہ ظاہر البطلان ہے، وقف کی یہ غلطی چونکہ فسادِ معنی کی موہم ہے اس لئے فرمایا: بئس الخطیب انت الخ۔

(۵)...... بئس الخطیب الخ والی روایت کراہت تنزیہی پر محمول ہے، اور یہ روایت بیان جواز پر محمول ہے، مطلب یہ ہے کہ دونوں کو ایک ضمیر میں جمع کرنا فی نفسہ جائز ہے، لیکن جہاں غلط معنی کا ایہام ہو وہاں خلاف اولیٰ اور مکروہ ہے۔ (فتح الباری۔ ایضاً)

شئ ثانی: دوسری چیز یہ ہے کہ کسی اپنے جیسے انسان سے محبت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی وجہ سے کرے اس میں استاد بھی داخل ہے پیر بھی داخل ہے میاں بھی داخل ہے بیوی بھی داخل ہے ماں باپ بھی داخل ہیں۔ سبق کا تکرار کرانیوالا بھی داخل ہے۔ لیکن یہ محبت

صرف اللہ تعالیٰ ہی کی وجہ سے ہو۔ جوانی کی ترک بھڑک کی وجہ سے نہیں سڑک کا ساتھی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اس وجہ سے ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی باتیں بتلاتا ہے نماز کے لئے اٹھاتا ہے۔ تکرار کراتا ہے یا اس سے کوئی دینی نفع پہونچتا ہے، یا اللہ تعالیٰ نے ان سے محبت کا حکم دیا ہے وغیرہ۔ اور جو محبت اللہ تعالیٰ کی وجہ سے ہو وہ محبت پائیدار ہوتی ہے۔

شئ ثالث: تیسری چیز یہ ہے کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف لوٹنا اس کے لئے ایسا ہو جیسا کہ آگ میں ڈالا جانا۔ اور جب یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو تمام ایمانیات کی محبت اور کفریات سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے، جب یہ بات تمہارے اندر پیدا ہو جائے گی اوران تین اجزاء کا چورن تمہارے پاس ہوگا تو تمہیں ایمان کی حلاوت معلوم ہو جائیگی۔

ایسی حلاوت کہ دنیا کی کسی چیز میں بھی اس جیسی حلاوت نہ آئیگی، جس طرح پیٹ کے ہاضمہ کے لئے مختلف اجزاء سے چورن تیار کیا جاتا ہے، اسی طرح یہ چیزیں ہیں۔

جن لوگوں نے ان تینوں چیزوں کو اپنایا ہے انہوں نے ایمان کی حلاوت محسوس کی ہے جیسے بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ آگ میں ڈالے جارہے ہیں مگر ایمان سے ہٹنا گوارا نہیں لیکن ہمارا حال تو ایسا ہے کہ اللہ والوں سے دشمنیاں ہیں اگر محبت ہے تو کسی کے چہرے سے کسی کی ناک سے کسی کی آنکھ سے کسی کے پیٹ سے اور کسی کی پیٹھ سے۔

زبان سے تو پڑھتے ہیں "**اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم**" اور حال سے ثابت کرتے ہیں۔ **احب الشیطٰن.** شیطان پر لعنت کرتے ہیں اور بغلوں میں کفریات لئے پھرتے ہیں۔

ان یعود فی الکفر بعد ان انقذہ اللہ: **انقاذ** کے معنی چھٹکارے کے ہیں اور اس کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) ابتداءً ہی اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت فرمائی ہو کہ اس کو اسلام پر پیدا فرمایا ہو اور

وہ اسلام پر باقی رہا ہو۔ اس صورت میں "یعود" صیرورت کے معنی میں ہے۔

(۲) اللہ نے ظلمت کفر سے چھٹکارا دلا کر اس کو نور ایمان نصیب فرمایا ہو، اس صورت میں "یعود" اپنے ظاہری معنی پر ہوگا۔ (فتح الباری: ۸۹، ۱/۱۶)

نیز اس روایت میں تحلی بالفضائل والمحاسن اور تخلی عن الرذائل کی جانب اشارہ ہے پہلی دونوں خصلتیں تحلی بالفضائل اور اخیر کی خصلت تخلی عن الرذائل کے قبیل سے ہے لہٰذا دوسرے شمائل کی جانب اس میں ترغیب وتحثیث بھی موجود ہے۔ (فتح الباری: ۱/۸۷، مرقاۃ: ۱/۶۷)

حلاوت سے مراد

بہت سے علمائے کرام کی رائے یہ ہے کہ یہاں حلاوت سے حلاوت معنوی مراد ہے، بعض صوفیاء نے فرمایا کہ حلاوت حسی مراد ہے، لیکن دونوں میں کوئی تعارض نہیں، اس لئے کہ عام طور پر تو حلاوت معنوی ہی نصیب ہوتی ہے لیکن خواص میں جب ان خصائل ثلثہ میں بہت زیادہ ترقی ہو جاتی ہے تو حسی طور پر خود بھی حلاوت اور شیرنی معلوم ہونے لگتی ہے، بہت سے واقعات اس پر شاہد ہیں، لہٰذا حلاوت حسی کے انکار کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ فقط

﴿ایمان کا واقعی لطف﴾

﴿۸﴾ وَعَنِ الْعَبَّاسِ بنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عنه قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاقَ طَعْمَ الْإِيْمَانِ، مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا۔ (رواه مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ص ۱/۴۷، حدیث نمبر: ۳۴، باب الدلیل علی من

رضی باللہ رباً، کتاب الایمان۔

حل لغات: ذاق، الطعام، (ن)ذوقاً، و ذوقانا، ذائقہ چکھنا۔ الطعم، ذائقہ، مزا، طعم (س)طعماً، کھانا، چکھنا۔ رضی بہ، وعلیہ (س)رضاً، و رضاءً، مان لینا، قبول کرنا، پسند کرنا۔

ترجمہ: حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب اسلام کو اپنا دین، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول بخوشی مان لیا، تو اس نے ایمان کا حقیقی مزہ چکھ لیا۔

تشریح: عن العباس رضی اللہ عنہ[1] بن عبد المطلب ذاق طعم الایمان: **طعم** فتحہ وضمہ کے ساتھ۔

جس طرح گذشتہ روایت میں حلاوت کا استعمال کیا گیا تھا اسی طرح اس روایت میں **"ذاق طعم الایمان"** کو استعمال کیا گیا ہے۔

ذوق: امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ تھوڑی سی چیز اگر منھ میں جائے تو اس کو ''ذوق'' (چکھنا) سے تعبیر کرتے ہیں اور اگر زیادہ چیز جائے تو اس کو ''اکل'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

---

[1] **احوال:** حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا، اور عمر میں دو سال بڑے تھے عام الفیل سے ایک سال قبل ولادت ہوئی۔ بہت ذہین وفطین تھے ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا کہ آپ بڑے ہیں یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو فرمایا: ''ھُوَ اَکْبَرُ وَاَنَا اَسَنُّ'' زمانہ جاہلیت میں بڑے رئیس تھے حتیٰ کہ زمانہ جاہلیت میں سقایۃ الحج، [حاجیوں کو پانی پلانا] اور عمارۃ کعبہ [خانہ کعبہ کی حفاظت، اس کی دیکھ بھال اس کی مرمت وغیرہ] انہی کے ذمہ تھا۔ کل مرویات کی تعداد پینتیس (۳۵) ہے جن میں سے ایک متفق علیہ، ایک افراد بخاری اور تین افراد مسلم ہیں۔ آپ کی وفات بروز جمعہ ۱۲ رجب ۳۲ھ عمر اٹھاسی (۸۸) سال ہے اور جنت البقیع میں تدفین عمل میں آئی۔ (مرقاۃ: ۱/۶۶، الاکمال: ۶۰۶)

یہ روایت افراد مسلم میں سے ہے اور افراد مسلم کا مطلب یہ ہے کہ صرف مسلمؒ نے اس کو روایت کیا ہو بخاریؒ نے روایت نہ کیا ہو۔ (نووی: ۲/۳۰)

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ذوق یہاں پر ضرب المثل کے طور پر اس خیر کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو صحابۂ کرام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاصل کرتے تھے۔

ابوبکر انباریؒ کا خیال یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کردہ علم ان کے لئے کھانے پینے کے درجہ میں تھا کہ جس طرح سے طعام جسم کی حفاظت کرتا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ارواح کی حفاظت کرتے تھے۔ (طیبی: ۱/۱۲۱)

اور یہاں پر ذوق سے مراد ذوق معنوی ہے جو کہ کمال ادراک سے کنایہ ہوتا ہے۔ (اُبی مع سنوسی: ۱/۲۱۴)

اسی وجہ سے شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں اس جانب اشارہ ہے کہ جس طرح نفوس کھانوں کی لذتوں سے متنعم ہوتے ہیں اسی طرح جو قلوب امراض غفلت وہوا سے محفوظ ہوں وہ بھی لذائذ معانی کا ذوق حاصل کرتے ہیں اور ان امراض سے حفاظت اس حدیث میں مذکور تین چیزوں کے ذریعہ ہی ہوسکتی ہے۔ اور جو ایسا نہ ہوگا تو حلاوت ایمان اس کو نصیب نہ ہوگی۔ (اشعۃ اللمعات: ۱/۵۲)

اور قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی امر پر راضی ہو وہ اس کے لئے آسان بلکہ لذیذ ہوجاتا ہے اسی طرح مومن جب ان مذکورات ثلاثہ پر راضی ہوگا تو اس سے ثابت ہوگا کہ ایمان اس کے رگ وریشہ میں پیوست ہوگیا ہے، لہٰذا خدا اور رسول کی اطاعت اس کے لئے آسان ہوجائیگی۔ اور لذت چکھنے کا مزہ حاصل ہوگا۔ (تنظیم الاشتات مختصراً: ۴۵،۴۶/۱، نووی: ۲/۳)

فرمایا کہ ایک معجون پہلے ذکر کیا اور ایک معجون یہ ہے کیونکہ معجون کئی قسم کا ہوتا ہے۔

پہلی چیز: اگر انسان اللہ تعالیٰ سے اس اعتبار سے راضی ہے کہ وہ نیست سے ہست کرنے والا اور معدوم کو وجود میں لانے والا ہے تو یہ کافی نہیں۔ یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص

ماں باپ کے متعلق یہ مان لے کہ دنیا میں ماں باپ ہوتے ہیں باپ کا ماں سے نکاح ہو گیا، تو ہم بھی ٹپک پڑے تو ایک یہ جاننا ہے۔

اور ایک یہ ماننا ہے کہ وہ میری پیدائش کا سبب ہیں انہوں نے مجھے پریشانیوں سے بچایا خود تکلیفیں اٹھائیں مگر مجھے تکلیف نہ پہنچنے دی تو بتلایئے جب اس طرح انسان ماں باپ کو مانیگا، تو کیا اس کو ان سے پھر محبت نہ ہوگی؟ ضرور ہوگی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو ایک تو اس اعتبار سے ماننا ہے کہ وہ آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے ٹھیک یہ بھی ہے کہ مگر اس طرح ماننے سے وہ بات پیدا نہ ہوگی۔ جو اس اعتبار سے ماننے سے ہوگی کہ اللہ تعالیٰ میرا رب ہے۔ اس نے مجھ کو وجود بخشا، مجھ پر ہر طرح کے انعامات کئے، علم دیا، کھانا دیا ہر وقت ہر آن کروڑوں احسانات کی بارش برساتا ہے، وغیرہ وغیرہ، تو بتایئے اس اعتبار سے ماننے سے کیوں انسان کو اللہ تعالیٰ سے محبت پیدا نہ ہوگی، ایک تو حضرت جی کے متعلق سمجھیں کہ وہ مدرسہ کے مہتمم ہیں، مدرسہ کا نظام چلاتے ہیں، ٹھیک ہے مدرسوں کے مہتمم ہوتے ہی ہیں۔ لیکن اس اعتبار سے کہ وہ کھانے کا انتظام کرتے ہیں سونے کا انتظام کرتے ہیں رحم کرتے ہیں اور شفقت کرتے ہیں تو بتلایئے اس صورت میں کیا ان سے محبت نہ ہوگی؟ ضرور ہوگی۔

دوسری چیز: ہے اسلام۔ کہ آدمی اسلام سے راضی ہو اس کے دین ہونے کے اعتبار سے یہ نہیں کہ اسلام کو صرف ایک طریقۂ تعبدی سمجھ لیں کہ اس میں نماز کا اور عبادت کا اچھا طریقہ ہے اس اعتبار سے راضی ہونا کافی نہیں۔ بلکہ اس کو زندگی کا پورا دستور العمل سمجھیں بلکہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے متعلق جامع اور مکمل لائحہ اور ضابطۂ حیات سمجھیں، اور اس کے ہر کام میں اسلام کا اثر ہو تو بتلایئے اس صورت میں کیا اس کو اسلام سے محبت نہ ہوگی؟ ضرور ہوگی یہ نہیں کہ مسجد میں تو نمازی اور باہر انگریز (کوٹ پتلون میں) یا ؏

با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام

تیسری چیز: یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اللہ سمجھے۔

یہ نہیں کہ صرف آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک باعظمت متحمل بردبار انسان ہیں، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دنیا سے درندگی کو ختم کردیا، فسق کو ختم کردیا، فتنہ انگیزی ختم کردی، دشمنیاں ختم کردی، سب جھگڑے ختم کردئے، اور محبت پیدا کردی۔

اگر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو صرف ایسا مانا تو کچھ نہ مانا ایسا تو گاندھی جی بھی مانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چھوت چھات کو ختم کردیا اور دنیا میں امن وچین پیدا کردیا۔

نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو رسول ہونے کی حیثیت سے تسلیم کرے کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں من جانب اللہ کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں، رحمت دو عالم ہیں، آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تمام زندگی ہمارے لئے اسوہ اور نمونہ ہے، تو دیکھیں کیوں نہ مزہ آئے گا۔ ضرور مزہ آئیگا۔ اللہ تعالیٰ کو رب ہونے کی حیثیت سے اسلام کو دین ہونے کی حیثیت سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ہونے کی حیثیت سے تسلیم کرے، تب مزہ آئے گا۔ اور ان کی ایک ایک چیز پر مرمٹنے کو جی چاہے گا۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ رضا سے مقصود ظاہری اور باطنی انقیاد ہے اور کمال یہ ہے کہ بلاء پر صابر، نعمتوں پر شاکر، قضاء وقدرت پر راضی، اور امتثال اوامر نیز اجتناب عن النواہی کرکے تمام شرائع پر عمل کرے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل طور پر اتباع کرے۔ (مرقاۃ: ۱/۶۷)

اور امام نوویؒ نے نقل کیا ہے کہ کسی چیز پر راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس چیز پر اس طرح قناعت اور اکتفا کرے کہ اسکے علاوہ کی طلب نہ رہے۔ یعنی ربوبیت میں اللہ تعالیٰ کے

علاوہ کو، دین میں اسلام کے علاوہ کسی شریعت کو، اور نبوت ورسالت کے سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اوران کی شریعت کے علاوہ کی طالب نہ رہے۔ (نووی مع ایضاح: ۲/۳)

فائدہ ذائقہ

حدیث پاک میں ذائقہ سے اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح دنیوی لذائذ کا ذائقہ جب منہ کولگ جاتا ہے تو پھر وہ آسانی سے نہیں چھوٹتا، اسی طرح جب کسی کو ایمان کا ذائقہ حاصل ہو جاتا ہے تو پھر وہ بھی نہیں چھوٹتا، اور بڑے سے بڑا لالچ یا بڑی سے بڑی دھمکی اس کومتزلزل نہیں کرتی، جیسا کہ ساحران فرعون نے جب ایمان کا ذائقہ چکھ لیا پھر فرعون کے قتل اور سولی پر لٹکانے کی دھمکی ان کے پائے استقلال میں جنبش پیدا نہ کرسکی، بلکہ صاف کہدیا "**لن نؤثرک علی ما جائنا من البینات والذی فطرنا فاقض ما انت قاض**" [ہمارے پاس جو واضح دلائل آگئے اس کے اور جس نے ہم کو پیدا کیا اس کے مقابلہ میں ہم تجھ کو ہرگز ترجیح نہ دینگے، تجھ کو جو کرنا ہے کر۔] ہزاروں لاکھوں واقعات اس کے شاہد ہیں شیخ سعدیؒ نے اس کی خوب ترجمانی فرمائی ہے ؎

موحد چہ در پائے ریزی زرش　　چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نہ باشد زکس　　ہمین است بنیاد توحید وبس

[موحد کے پیروں میں خواہ سونا ڈالو خواہ اس کے سر پر ہندی تلوار رکھو نہ اس کو کسی سے امید ہوتی ہے نہ خوف، توحید کی بنیاد یہی ہے اور بس۔]

فائدہ دوم

حدیث پاک میں جن تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے یہ اسلام کی بنیادی چیزوں میں ہیں، یہی وجہ ہے کہ قبر میں ان ہی تین چیزوں کا سوال کیا جائے گا۔ فقط

﴿نجات کا دارومدار محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع میں﴾

﴿۹﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ لَا یَسْمَعُ بِیْ اَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ یَهُوْدِیٌّ وَلَا نَصْرَانِیٌّ ثُمَّ یَمُوْتُ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَّا کَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ۔ (رواه مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ص۸۶/۱، بـاب وجوب الایمان برسالة نبینا صلی اللہ علیہ وسلم، کتاب الایمان، حدیث نمبر: ۱۵۳۔

حل لغات: نَفْسٌ، روح، جان، خَرَجَتْ نَفْسُهٗ اس کی جان نکل گئی، ج اَنْفُسٌ، ونُفُوْسٌ. اُرْسِلْتُ، واحد متکلم، فعل ماضی مجہول، مصدر ارسال (افعال سے) بھیجنا۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ قسم ہے، اس ذات کی جس کے قبضے میں حضرت محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی جان ہے، اس امت میں سے جو بھی شخص خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی میری نبوت کی خبر سنے اور میری لائی ہوئی شریعت پر ایمان لائے بغیر مر جائے تو وہ دوزخی ہے۔

تشریح: والذی نفس محمد بیدہ: اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوگیا کہ اگر کسی اہم کام میں تاکید پیدا کرنی ہو تو قسم کھائی جاسکتی ہے۔ (فتح الباری: ۱/۱۴/۸۴)

اس قسم کے اندر ایہام الوہیت کو دفع کرنا مقصود ہے کہ کوئی آپ کے معجزات دیکھ کر یہ خیال نہ کرنے لگے کہ الوہیت آپ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس قسم کے ذریعہ آپ نے اس ایہام کو دفع کر دیا۔

جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مردوں کو زندہ کرنے کوڑھیوں کو صحت دیدینے کے معجزات دیکھ کر لوگ کہنے لگے کہ یہی اللہ ہیں۔

ایسے ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر اللہ نہیں تو ابن اللہ ہیں اور بعض نے کہا کہ اللہ آپ میں حلول کئے ہوئے ہیں۔

جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ میں اللہ حلول کئے ہوئے تھا نعوذ باللہ من ذلک۔ اسی لئے تو آپ نے تن تنہا درِ خیبر کو ہلا دیا جبکہ اس کو ستر آدمی بھی نہ ہلا سکتے تھے۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چند مردوں کو زندہ کیا، تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تو پوری دنیا ہی کو زندہ کر دیا، کیا آپ نے بڑے بڑے معجزات نہیں دکھلائے؟

بعض معجزات نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

کیا آپ کے فراق میں استوانہ حنانہ نہیں رویا؟

کیا آپ کی مبارک انگلیوں سے پانی کے چشمے نہیں بہے؟

کیا آپ کے واسطے کنکریوں نے کلمہ نہیں پڑھا؟

کیا آپ کی انگشت شہادت کے اشارہ سے چاند کے دوٹکڑے نہیں ہو گئے؟

کیا آپ کے حکم سے ڈوبتا ہوا سورج نہیں پلٹ آیا؟

کیا آپ کی برکت سے چند آدمیوں کا کھانا ہزاروں آدمی کے قافلہ کو کافی نہیں ہو گیا؟

کیا آپ کی برکت سے کھارا پانی میٹھا نہیں ہو گیا؟

کیا آپ کے لعاب دہن سے زہر آلود اور سخت بیمار شفایاب نہیں ہو گئے؟
کیا آپ پر بادل سایہ نہیں کرتے تھے؟
کیا آپ کے حکم سے درخت اپنی جگہ سے اٹھ کر نہیں چلے آتے تھے؟
کیا آپ کے پسینہ مبارک سے مشک سے بہتر خوشبو نہیں آتی تھیں؟
کیا جس راستہ سے آپ گذرتے تھے وہ راستہ خوشبو سے نہیں بھر جاتا تھا؟
اگر ایسے معجزات دیکھ کر لوگ آپ کو خدا سمجھنے لگتے تو کیا یہ ممکن نہ تھا؟ اب بھی بہت سے لوگ نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔ آپ نے دنیا میں توحید کی وہ دعوت دی آج بہت سے کافروں میں بھی توحید موجود ہے اس ایک جملہ میں آپ نے کفر کی تمام جڑیں کاٹ کر پھینک دیں۔

تو محض یہ قسم ہی نہیں بلکہ اس سے بہت سے علوم نکلتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے لئے ثبوت ید اور اس میں اختلاف

نیز یہاں پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے ید کو ثابت کیا ہے جو متشابہات میں سے ہے، جمہور متقدمین کا مسلک اس سلسلہ میں تفویض ہے، جو متشابہات کی حقیقت و کیفیت کو علم الٰہی کے سپرد کرتے ہیں۔ گویا مطلب یہ ہے کہ **"لہ ید علی ما ارادہ لا کید المخلوق"** کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **"ما یعلم تاویلہ الا اللہ"** اور متاخرین کا مسلک اس سلسلہ میں تاویل ہے کیونکہ وہ لوگ **"الراسخون"** پر وقف کرتے ہوئے آیت کو اس طرح پڑھتے ہیں **"وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم"**

متقدمین کا مسلک غلطی سے اسلم ہے اور متاخرین کا مسلک معترضین سے مقابلہ کے لئے محکم ہے، مگر یہ اختلاف زمانہ پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے کیونکہ متقدمین کے زمانہ میں

سلامت طبع تھی اور بدعات وخرافات کا اس قدر ظہور نہ ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ غلط معنی نہیں مراد لیتے تھے مگر متاخرین کے زمانہ میں اہل بدع نے جب ان جیسے الفاظ سے اللہ تعالیٰ کے لئے جسمانیت کو ثابت کیا تو متاخرین نے تاویل کا مسلک اختیار کیا۔ تاکہ ان کا جواب دیا جا سکے۔(مرقاۃ:۶۷/۱،تحفۃ المرأۃ:۱۱۸)

احد: چاہے وہ حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہو یا بعد میں پیدا ہو۔(مرقاۃ)

من هذه الامة: مِن تبعیضیہ یا بیانیہ ہے اور امت دعوت مراد ہے۔(مرقاۃ) اور امت اس جماعت کو کہا جاتا ہے جس کے پاس کوئی پیغمبر بھیجا گیا ہو۔(اشعۃ اللمعات:۱/۵۲)

یهودی ولا نصرانی: یہ احدکم کی صفت، یا بدل بعض ہے، یہودی اور نصرانی کو خاص طور پر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں جماعتوں کے پاس آسمانی کتاب ہونے کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے انکا یہ حال ہے، تو بت پرستوں اور دیگر اقوام کا کیا حال ہوگا، جنکے پاس کوئی کتاب بھی نہیں ہے۔ (طیبی:۱/۱۲۵)

ثم یموت: اس میں ثم ہے جو تراخی کے لئے استعمال ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر ایمان سنتے ہی نہیں لایا بلکہ بعد میں لایا اور حالت غرغرہ سے قبل اس کا ایمان واقع ہو گیا تو اس کا ایمان بھی نفع دیگا۔ اور جہنم میں جانے سے حائل بن جائیگا۔(مرقاۃ مع زیادۃ:۱/۶۷)

جس شخص کو دعوت نہ پہونچی اس کا حکم

البتہ اگر کسی شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نہیں سنا اور اس تک دعوت

نہیں پہنچی، تو اس کا کیا حکم ہے؟ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت سے معلوم ہوا کہ اس پر عذاب بھی نہ ہوگا اور نہ مواخذہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔''وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا. (المفہم:۱/۳۱۸)

امت کی دو قسمیں

پھر امت کی دو قسمیں ہیں ایک امت دعوت، دوسری امت اجابت، امت دعوت ان کو کہا جاتا ہے کہ دعوت ایمان پہنچی اور ایمان نہیں لائے۔ اور امت اجابت وہ لوگ ہیں کہ جن کے پاس حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دعوت پہنچی اور ایمان بھی لائے۔ یہاں امت سے امت دعوت مراد ہے جس قسم کے لوگ کیوں نہ ہوں۔

الا کان من اصحاب النار: یعنی دعوت وتبلیغ پہنچنے کے باوجود اصرار علی الکفر کرتا ہوا مر گیا تو ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل ہوگا، اور اگر سن کر ایمان لے آیا غرغرہ سے قبل تو جہنم میں داخل نہ ہوگا۔ (مرقاۃ:۱/۶۷)

آپ نے فرمایا کہ میری بعثت عام ہے، کسی خاص طبقہ کے لئے نہیں، جب کسی کو میری خبر پہنچ جائیگی اور میری لائی ہوئی کتاب پر ایمان نہ لائیگا، تو وہ دوزخ میں جائیگا۔ بغیر آپ پر ایمان لائے ہوئے کوئی جنت میں نہ جا سکے گا۔

فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرہٗ نے اسکو اشعار میں بیان فرمایا ہے۔

ہے نبوت ہر نبی کی حق مگر اس دور میں
سکۂ دینِ نبی مصطفیٰ کا ہے چلن
باب رحمت دیکھ کر جانا کہیں
ہے ہلسی اس میں جگلت کی اور اپنا ہے مرن

﴿دوہرا اجر پانے والے حضرات﴾

﴿۱۰﴾ وَعَنْ اَبِی مُوسیٰ الْاَشْعَرِی رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالیٰ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَهُمْ اَجْرَانِ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمَنَ بِنَبِیِّهٖ وَاٰمَنَ بِمُحَمَّدٍ وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوكُ اِذَا اَدّٰی حَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ مَوَالِیْهِ وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهٗ اَمَةٌ یَطَأُهَا، تَاَدَّبَهَا فَاَحْسَنَ تَأْدِیْبَهَا، وَعَلَّمَهَا فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمَهَا ثُمَّ اَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا فَلَهٗ اَجْرَانِ۔ (متفق علیه)

حواله: بخاری شریف: ص ۲۰/۱، بـاب تـعـلیـم الرجل امته و اهله کتاب العلم، حدیث نمبر: ۹۷، مسلم شریف: ص ۸۶/۱، حدیث نمبر: ۱۵۴، باب وجوب الایمان برسالة نبینا ﷺ الخ، کتاب الایمان.

حل لغات: اَجْرَان، تثنیہ ہے، واحد، اَجْرٌ، ثواب، کرایہ، جمع اُجُوْرٌ، مَوَالِیْه، واحد مَوْلیٰ، مالک، آقا۔ یَطَأُهَا، وَطِیَ، (س) وَطْئًا، المرأة، عورت سے مباشرت کرنا، اَعْتَقَهَا، (افعال سے) العبد، غلام کو آزاد کرنا۔

تـرجـمـه: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخص ایسے ہیں جن کو دو اجر ملیں گے،

(۱) اس اہل کتاب کو جو اپنے نبی علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا، پھر حضرت نبی پاک محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لایا۔

(۲) اس غلام کو جو اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرے اور اپنے آقاؤں کے حقوق کو بھی ادا کرے۔

(۳) اس شخص کو جس کی کوئی باندی تھی اور وہ اس سے صحبت کرتا تھا، پھر اس کو اچھے طریقے سے ادب سکھایا پھر اس کو خوب اچھی تعلیم دی، اس کے بعد اس کو آزاد کر دیا، پھر اس سے نکاح کر لیا تو اس کو بھی دو اجر ملیں گے۔

تشریح: عن ابی موسی الاشعری[1] ثلثة لهم اجران الخ: حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین شخص ایسے ہیں جن کو دوہرا اور جہ دوہرا ثواب ملتا ہے۔

اور یہ دوہرا ثواب اس ثواب کے علاوہ ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے، "فله عشر امثالها"

اشکالات مع جوابات

اس پر اشکال یہ ہے کہ قرآن پاک میں ازواج مطہرات کا حکم بھی یہی بیان کیا گیا ہے، "ومن يقنت منكن لله ورسوله وتعمل صالحا نؤتها اجرها مرتين" اور

[1] عبد اللہ بن قیس بن سلیم، اپنے نام اور کنیت دونوں سے مشہور ہیں اور بنو الاشعر قبیلہ کی جانب نسبت کرتے ہوئے اشعری کہلاتے ہیں، ہجرت حبشہ سے قبل مکہ میں اسلام لائے اور پھر ہجرت کی یا وطن واپس لوٹے، اس سلسلہ میں اختلاف ہے اکثر علماء کے نزدیک وطن واپس لوٹ گئے تھے اور فتح خیبر کے بعد جعفر بن ابی طالب کے ساتھ ساتھ مدینہ پہنچے تھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو زبید اور عدن کے علاقوں میں عامل بنایا تھا پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں بصرہ کے امیر رہے اور اصفہان واہواز کو فتح کیا حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ میں کوفہ میں امیر رہے، آپ کی آواز بہت عمدہ تھی جس کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے "لقد اوتی مزمارا من مزامير آل داؤد" ابو عثمان مہدی فرماتے ہیں جتنا اچھا وہ قرآن پڑھتے تھے اتنی اچھی آواز نہ میں نے کسی ڈھول اور سارنگی کی سنی اور نہ کسی کو اتنی اچھی آواز والا دیکھا۔ آپ کی وفات کے سال میں اختلاف ہے۔ صاحب مشکوۃ نے ۵۲ھ ذکر کیا ہے نیز یہ بھی مختلف فیہ ہے کہ وفات مکہ میں ہے یا کوفہ میں۔ (الاصابہ:۲/۳۶۰، الاکمال:۶۱۸، مرقاۃ:۱/۶۸)

بعض علماء نے استقراء سے دیگر حضرات کو بھی دوہرے اجر کی فضیلت نقل فرمائی ہے پھر حدیث میں "ثلاثۃ" کی قید کیوں ہے؟

جواب: یہاں تحدید مقصود نہیں بلکہ مقتضی حال کے مناسب تین کا عدد ذکر کیا ہے۔ جو دیگر حضرات کے لئے ثواب کی نفی پر دال نہیں۔ (تحفۃ المرأۃ:۱۱۹)

اشکال دوم: اس روایت پر ایک اشکال یہ ہے کہ ان تینوں کو دوہرا اجر مل رہا ہے کیونکہ یہ دو عمل کررہے ہیں، اور ان کی تخصیص کی کیا وجہ ہے ہر وہ شخص جو دو عمل کریگا اس کو دوہرا اجر ملیگا ہی؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ صرف ان اعمال پر ہی دوہرا اجر ان کو نہیں مل رہا بلکہ یہ جو جو عمل بھی کریں گے جس میں دوسرے لوگوں کو ایک عمل کا ثواب ملتا ہے تب بھی ان کو دوہی اجر ہونگے **ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء**۔ (اشعۃ اللمعات:۵۳/ ۱)

پہلا شخص: ایک وہ شخص ہے جو اہل کتاب میں سے ہو یعنی پہلے اپنے نبی علیہ السلام پر ایمان لایا ہو بعد میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان لایا ہو تو اس کو دوہرا ثواب ملے گا۔ (اس پر اشکال اور اس کا جواب)

اشکال مع جواب

اشکال: یہ ہے کہ اہل کتاب اپنی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رسالت وآمد کی پیش گوئیاں پڑھ چکے تھے تو ان کو کیا دقت ہوئی بلکہ ان کو تو آرام ہوا کہ پہلے سے ان کو معلوم ہو گیا تھا۔ تکلیف تو انہیں ہوئی جن کے پاس علم آیا ہی نہ تھا تو ان کو (اہل کتاب) کو کیوں دوہرا ثواب ملے گا؟

جواب: اس کا یہ ہے کہ اہل کتاب کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا زیادہ محنت کا کام ہے اور اتنا مشکل ہے جتنا مشکل فرہاد کیلئے جوئے شیر کا لانا بھی نہ تھا۔

اس لئے کہ وہ اپنے نبی پر ایمان لا چکے تھے ان پر نذرانے چڑھتے تھے اپنی قوم کے قائد تھے، باعزت تھے مقتدا تھے صاحب اقتدار کے لئے اقتدار رد کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ صاف تختی پر لکھنا مشکل نہیں بخلاف لکھی ہوئی تختی کے کہ اس کو دھونا اور پوتنا پڑیگا، جب اس پر لکھا جائیگا۔

جیسے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ اگر موسیٰ علیہ السلام بھی ہوتے تب بھی ان کو میری اطاعت بغیر چارہ نہ تھا۔

دوسرا شخص: دوسرا وہ شخص ہے جس کو کسی انسان نے خرید لیا ہو اور وہ اس کے حقوق بھی ادا کرے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرے تو اس کو بھی دوہرا ثواب ملتا ہے۔ کیونکہ وہ دہری محنت کرتا ہے، دونوں کی رضا کا خیال رکھنا آسان نہیں۔

حق موالیہ: چونکہ العبد پر الف لام جنسی ہے۔ لہٰذا ''موالیہ'' کو جمع لیکر آئے۔ کیونکہ ہر عبد کے لئے ایک مولیٰ ضرور ہوگا یا اگر عبد مشترک ہو تو اپنے تمام موالی کا حق ادا کرنا ہوگا یا یکے بعد دیگر چند آقاؤں کے پاس رہا ہو تو جس جس کا غلام رہا ہے ان میں سے ہر ایک کا خیال رکھا ہو اور حق ادا کیا ہو۔ (مرقاۃ: ۱/۶۹)

تیسرا شخص: تیسرا وہ شخص ہے جس کے پاس کوئی باندی ہو اور وہ اس کو ادب و علم سکھلائے عالمہ فاضلہ بنادے اور پھر آزاد کردے اور پھر نکاح کر کے اس کو اپنی بیگمات میں داخل کرلے تو اس کو بھی دوہرا ثواب ملیگا۔

ایک اجر اس کے آزاد کرنے پر اور ایک اجر نکاح کرنے پر، بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ''ثم'' کا تقاضہ ترتیب مع التراخی کا ہے لہٰذا تادیب اور تعلیم پر ایک اجر اور عتاق و تزوج پر

دوسرا اجر۔(مرقاۃ:۶۹/۱)

کیونکہ عام طور پر باندیوں کو ذلیل سمجھا جاتا ہے۔یا یوں سمجھو کہ غلام کو اپنی صف میں کھڑا کرلے،تو اس کو دہرا ثواب ملے گا۔کیونکہ پہلے تو وہ صرف مملوک اور باندی تھی اب زندگی کی برابر کی شریک بن گئی یہ بہت بڑا مجاہدہ ہے۔

ایک نماز پڑھو دو کا ثواب،ایک روزہ رکھو دو کا ثواب۔

ان تینوں کی تخصیص مراد نہیں بلکہ اس سے ایک عام کلی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جو عمل ایسے دو متزاحم و متقابل دو جزء سے مرکب ہو کہ ایک کے ساتھ مشغول ہونے سے دوسرے کی طرف خیال بڑا مشکل ہوتا ہے۔اس میں دو اجر ملتے ہیں۔کیونکہ اولاً ایک نبی پر ایمان لاکر اس کی شریعت پر پابندی کے بعد اچانک دوسرے نبی پر ایمان لانا اور اس کی شریعت پر پابند ہونا اور پہلی شریعت کو بالکل ترک کر دینا اپنی طبیعت پر بہت شاق ہوتا ہے۔لہٰذا اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ کر کے اور صبر علی المکارہ کر کے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا۔اس کو دو اجر ملنا چاہئے تو یہاں ان تینوں کی خصوصیت نہیں بلکہ ان کے ذکر سے ایک اصول کی طرف اشارہ کرنا ہے۔اسی طرح بقیہ دونوں کو سمجھ لو۔فلا اشکال۔(مرقاۃ: کتاب الایمان)

﴿کافروں سے قتال کرنے کا حکم﴾

﴿۱۱﴾ وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَ هُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ۔ (متفق علیه) اِلَّا

اَنَّ مُسْلِماً لَمْ یَذْکُرْ "اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ"

حوالہ: بخاری شریف: ص ۱/۸، حدیث نمبر: ۲۵، مسلم شریف: ص ۱/۳۷، باب الامر بقتال الناس حتی یقولوا الخ، کتاب الایمان، حدیث نمبر: ۲۲،

حل لغات: امرت، واحد متکلم، فعل مجہول، امر (ن) فلاناً کذا، وبکذا امراً، وامارۃ، حکم دینا، اقاتل مفاعلت سے، (مضارع واحد متکلم) مقاتلۃ وقتالا، لڑنا، جنگ کرنا، عصموا، (ماضی، جمع مذکر غائب) عصم، (ض) عصماً، الشیئ، حفاظت کرنا، دماءھم، واحد دَمٌ، خون، دَمٌ کی دوسری جمع دَمِیٌّ آتی ہے۔

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں، جب تک وہ اس بات کی گواہی نہ دے دیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ نیز وہ نماز قائم کریں اور زکوۃ کی ادائیگی کریں، اگر انہوں نے ایسا کرلیا، تو انہوں نے مجھ سے اپنی جان و مال کی حفاظت کر لی، لیکن اسلام کا حق باقی رہے گا۔ اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ (بخاری و مسلم) مسلم کی روایت میں ''الا بحق الاسلام'' کے الفاظ نہیں ہیں۔

تشریح: امرت الخ: ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں۔ یہاں تک کہ وہ تین کام نہ کر لیں۔ (۱) شہادتین کا اقرار۔ (۲) اقامت صلوۃ۔ (۳) ایتاء زکوۃ۔

جو لوگ یہ تین کام کرلیں گے یعنی سچے مسلمان ہو جائیں گے، وہ معصوم الدم ہو جائیں گے، اب ہمارے لئے نہ ان لوگوں کی جان سے تعرض کرنا جائز رہیگا، اور نہ ان کے مال سے۔

الناس: میں الف لام عہد خارجی کا ہے، یعنی حربی کافروں سے قتال کا حکم ہے،

سب انسان اس سے مراد نہیں۔

اکثر شراح اسی کے قائل ہیں کہ "النـــاس" سے حربی عبدۃ الاوثان مراد ہیں، اہل کتاب مراد نہیں ہیں۔ کیونکہ اہل کتاب توحید میں ہمارے شریک ہیں اگر وہ رسالت محمدیہ کے بھی قائل ہوجائیں، یا جزیہ ادا کرنے کے لئے راضی ہوں تو ان سے قتال نہیں کیا جائیگا۔ گویا کہ یہ مثال "عام مخصوص منه البعض" ہے کہ "الناس" عام ہے لیکن اس کے بعض افراد یعنی حربی عبدۃ الاوثان مراد ہیں۔ (طیبی: ۱۲۸/۱، مرقاۃ: ۷۰/۱)

اشکال مع جواب

پھر حدیث ہذا میں قتال کی غایت مذکورہ اشیاء ثلثہ کو قرار دیا گیا حالانکہ صلح اور جزیہ سے بھی جان و مال محفوظ ہوجانے کا وعدہ ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ الناس سے صرف اہل عرب مراد ہیں عام لوگ مراد نہیں۔ اور اہل عرب کے حق میں یا اسلام یا قتل یا صلح و جزیہ ان سے قبول نہیں کیا جاتا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث ہذا میں صرف ایمان کا ذکر کیا ہے، دوسری نصوص سے صلح و جزیہ کی صورت کو مستثنی کرلیا گیا۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ حدیث کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارے تابع ہوجائیں، ہمارے ساتھ مقابلہ نہ کریں۔ خواہ اسلام قبول کرکے یا صلح و جزیہ کی صورت اختیار کرکے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث حکم جزیہ نازل ہونے سے پہلے کی ہے، فلا اشکال۔ پھر حدیث ہذا سے بعض حضرات نے تارک صلوۃ کے قتل پر استدلال کیا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں قتال کا ذکر ہے قتل کا نہیں اور دونوں میں بڑا فرق ہے۔ قتل مار ڈالنے کو کہتے ہیں، اور قتال جنگ و لڑائی کا نام ہے، اس سے قتل لازم نہیں ہوتا۔ (مرقاۃ)

لے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو امر کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسری نہیں، خواہ وحی جلی کے ذریعہ امر کیا ہو یا خفی کے۔ اسی طرح جب صحابی "امرت" کا لفظ استعمال کرے تو قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ مطلب یہ ہو "امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم" (فتح الباری: ۱۰۷/۲۵، ۱/ مرقاۃ: ۷۰/۱)

اشـــکـــال: آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو رحمت بنا کر بھیجا ہے، ارشاد ہے: ''وما ارسلناک الا رحمۃ للعلمین'' اور یہاں پر آپ کو قتال کا حکم ہے تو پھر آپ رحمت عالم کیسے ہوئے؟ (رحمت وقتال میں تو تضاد ہے)

جـــواب: یہاں حربی کفار کے ساتھ قتال کا حکم ہے اور ان کے ساتھ قتال کرنا بھی نصیحت وخیر خواہی ہے اور رحمت ہے۔ کیونکہ اگر جسم میں پھوڑے پھنسی ہوں اور مرہم پٹی سے اچھے نہ ہوں اور اندیشہ ہو کہ یہ زخم دوسرے صحیح وسالم اعضاء کو بھی متاثر اور خراب کر دیگا، اور دوسرے اعضاء بھی گل سڑ جائیں گے، تو ایسی صورت میں باقی اعضاء اور باقی بدن کی حفاظت کے لئے اس پھوڑے پھنسی کا آپریشن کرنا ضروری ہو جاتا ہے، اور وہ عین رحمت ہے، پس اسی طرح وہ حربی کفار جو نہ خود اسلام قبول کرتے ہیں نہ صلح کرتے ہیں، بلکہ برابر مسلمانوں سے برسر پیکار رہتے ہیں اور دوسرے لوگوں کیلئے بھی اسلام قبول کرنے سے رکاوٹ بنے ہوئے ہیں، ایسے لوگوں سے قتال کرنا اور ان کا آپریشن کرنا بھی ضروری ہے، اور باقی انسانوں کے لئے رحمت ہے۔

حتی یشھدوا: غایت ہے قتال کی۔ پس یہ قتال برائے علاج ہے۔
یعنی اگر ان امور مذکورہ پر کاربند رہا تو قتال نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ان میں سے کسی کو ترک کیا تو اس سے قتال ہوگا۔ مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ اگر مذکورہ امور کی پابندی کرے لیکن دیگر احکام شرع کا منکر ہو تو کیا وہ بھی معصوم الدم ہوگا؟ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں شہادت بالرسالت کا بھی تذکرہ ہے اور اس کے تحت ''التصدیق بما جاء بہ'' داخل ہے لہذا انکار کی گنجائش نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ روایت میں ''الا بحق الاسلام'' اس میں تمام احکام داخل ہیں لہذا انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ پھر ان تمام احکام میں سے صلوۃ وزکوۃ کو ذکر کیا ہے

کیونکہ یہ دونوں عبادات بدنیہ و مالیہ کی اصل ہیں لہذا اہتماماً ان دونوں کا تذکرہ فرمایا۔(فتح الباری:۱۰۸/۲۵/۱)

ویقیموا الصلوۃ……: اقامت صلوۃ سے مراد ارکان صلوۃ کی تعدیل، اور اس میں کسی قسم کے میل عن الاستقامت سے حفاظت ہے، یا نماز کو مداومۃ بغیر کسی کوتاہی کے مع شرائط ادا کرتے رہنا، اور صلوۃ سے مراد فرض نماز ہے۔(فتح الباری ایضاً)

فاذا فعلوا ذلک: حالانکہ روایت میں بعض چیزیں مثلاً شہادتین کا اقرار قول ہیں فعل نہیں ہیں، مگر پھر بھی فعل سے تعبیر کیا گیا ہے؟ یا تو تغلیباً یا معنی اعم پر محمول کر کے کیونکہ قول بھی تو زبان کا ہی فعل ہے۔

عصموا: عصام اس دھاگے کو کہا جاتا ہے جس سے مشک کا منہ باندھتے ہیں، کیونکہ وہ مشک سے پانی نکلنے سے مانع بن جاتا ہے۔(فتح الباری ایضاً)

اسی طرح یہ مذکورہ چیزیں "جان اور مال" کی حفاظت اور تلف سے مانع بن جاتی ہیں۔

عظیم معجزہ

کونسا جرنل اور کونسا بادشاہ دل کھول کر اتنی بڑی بات کہہ سکتا ہے کہ تمام دنیا سے قتال کرتا رہوں گا، یہاں تک کہ وہ کلمہ طیبہ پڑھ لیں، آپ کے پاس ظاہری قوت ہی کیا چند اصحاب یہ آپ کا کھلا ہوا اعجاز اور عظیم معجزہ ہے، کوئی دوسرا نہیں کر سکتا اور آپ نے کر کے دکھلا دیا۔

بدر سے آپ نے لڑائیاں شروع کی اور برابر لڑتے رہے اپنی عمر کی آخری لڑائی جنگ تبوک لڑی اور ایسی لڑی کہ عیسائیوں کو اپنے گھروں میں گھسا دیا، کسی کو مقابلہ کی جرأت نہیں ہوسکی اور ثابت کر دیا کہ ہمارے مقابلہ کے لئے کوئی طاقت نہیں ہے۔

الا بحق الاسلام: تو اگر یہ ایمان لے آئیں تو ہم قتال نہ کریں گے مگر حق اسلام کی وجہ سے:

حق اسلام سے مراد

ایک: اس وجہ سے کہ کوئی محصن ہونے کے باوجود زنا کرے اور زنا کا ثبوت ہوجائے۔

دوسرے: اس وجہ سے کہ کوئی عادل بادشاہ کی بغاوت کرے۔

تیسرے: وہ انسان جو اسلام سے مرتد ہوجائے وہ بھی قتل کردیا جائیگا۔

چوتھے: وہ جو کسی مومن کو ناحق قتل کرے تو اس کو قتل کردیا جائیگا۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ "**زنی بعد احصان، او کفر بعد ایمان، او قتل النفس التی حرم اللہ** ......" (المفہم شرح مسلم: ۱۸۹/۱، الدارمی: ۱۷۱/۲)

وحسابھم علی اللہ: یعنی ان کے باطن کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے ہم تو ظاہر کو دیکھ کر اسی کے مطابق حکم لگائیں گے۔ (فتح الباری: ۱۰۸/۲۵/۱)

یہ ایک سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص مذکورہ تین کام ظاہری طور پر صرف جان بچانے کے لئے کرے، دل سے مسلمان نہ ہو۔ اس کا جواب دیدیا کہ تم صرف ظاہر کے مکلف ہو باطن کا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔

اور یہ روایت معنی میں ہے ایک آیت "**فان تابوا و اقاموا الصلوۃ و آتوا الزکوۃ فخلوا سبیلھم**" کے، اس وجہ سے کہ امام بخاریؒ نے اس روایت پر مذکورہ آیت کو باب بنایا ہے۔ نیز امام مسلمؒ نے "**الا بحق الاسلام**" ذکر نہیں کیا مگر یہ پھر بھی مراد ہے، نیز دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بھی اس روایت میں "**الا بحق الاسلام**" کا تذکرہ کرتے ہیں۔ (مرقاۃ: ۷۱/۱)

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں اس امر پر صریح دلیل موجود ہے کہ ترتب احکام اور صحت اسلام کیلئے اقرار شرط ہے نیز مرجیہ پر رد بھی ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ ایمان کے ساتھ اعمال کی ضرورت نہیں، اور ساتھ ساتھ ان اہل بدعت کی عدم تکفیر پر دلیل بھی ہے جو اقرار توحید اور احکام شرع کی پابندی کرتے ہیں۔ (مرقاۃ: ۱/۷۱)

﴿استقبال قبلہ کی فضیلت﴾

﴿۱۲﴾ وَعَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّہٗ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰی صَلٰوتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَکَلَ ذَبِیْحَتَنَا فَذٰلِکَ الْمُسْلِمُ الَّذِیْ لَہٗ ذِمَّۃُ اللّٰہِ وَذِمَّۃُ رَسُوْلِہٖ فَلَا تُخْفِرُوا اللّٰہَ فِیْ ذِمَّتِہٖ۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ص ۵۶/۱، باب فضل القبلۃ، کتاب الصلوۃ، حدیث نمبر: ۳۹۱،

حل لغات: استقبل احدا و استقبالاً (استفعال سے) کسی کے سامنے ہونا، القبلۃ، جہت، سمت، رخ، خانۂ کعبہ، توجہ گاہ، ذمۃ، عہد و پیان، ذمہ داری، امان، حفاظت وضمانت، جمع ذِمَمٌ، لا تخفروا، فعل نہی، جمع مذکر حاضر، باب افعال سے، اِفخار، کسی کے ساتھ بے وفائی کرنا۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ، جو شخص ہماری طرح نماز پڑھے، ہمارے قبلے کی طرف رخ کرے، اور ہمارے ذبیحہ کو کھائے تو وہ مسلمان ہے، اور یہ شخص اللہ اور اس کے رسول کی امان میں ہے، تو تم اللہ کے عہد و پیان میں غداری مت کرو۔ (عہد شکنی نہ کرو) (بخاری)

تشریح: اگر کسی شخص میں یہ تینوں علامات پائی جائیں تو وہ مسلمان ہے اس کا قتل کرنا جائز نہیں وہ صرف ان تین چیزوں کا قائل اور معتقد ہو، چاہے عمل نہ کرتا ہو جب نماز پڑھتا ہے تو وہ ہم جیسی نماز پڑھتا ہے عیسائیوں جیسی نہیں۔[1]

جب نماز پڑھے تو قبلہ ہی کی طرف کو رخ کرتا ہو، گنگا جمنا کی طرف نہیں اور صرف ہمارے ہی ذبیحہ کو کھاتا ہو اور کسی کا نہیں ہمارا ذبیحہ چھوڑ کر دوسروں کا ذبیحہ کھانا کفر کی علامت ہے اور حرام ہے۔ جو ایسے لوگ ہیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عہد کیا ہے یعنی مسلمانوں کو جائز نہیں کہ وہ ان میں سے کسی کو قتل کریں، ہاں اس صورت میں جب کہ یہ زنا کریں یا یہ بغاوت کریں اور یا کسی مومن یا ذمی کو ناحق قتل کریں اگر ایسا کیا تو پھر قتل کرنا جائز ہوگا۔

---

[1] کیونکہ ہمارے جیسی نماز پڑھنے والا معترف بالتوحید اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اقرار کرنے والے کے علاوہ نہ ہوگا اور جو ایسا ہوگا وہ ان تمام احکامات اور شرائع کو بھی تسلیم کریگا، جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں اسی وجہ سے نماز کو اسلام کی علامت قرار دیا البتہ شہادتین کا تذکرہ نہیں کیا کیونکہ وہ بھی حکما یا حقیقۃ (جیسا کہ تشہد میں) صلوۃ کا جز ہے البتہ استقبال قبلہ کیونکہ محسوس ہونے کی وجہ سے اعرف ہے اور ہر ایک چاہے اپنی نماز سے واقف نہ ہو اپنے قبلہ سے واقف ہوتا ہے، لہذا اجزء صلاۃ کے باوجود اس کو مستقل ذکر کیا گیا اس وجہ سے کہ ہماری نماز میں بعض احکام ایسے ہیں جو دوسری جمعیتوں میں بھی موجود ہیں لیکن استقبال قبلہ مؤمن کو غیر مؤمن سے ممتاز کر دیتا ہے۔

اس کے بعد اکل ذبیحہ کا تذکرہ ہے، کیونکہ جب مؤمن کو غیر مؤمن سے ممتاز کرنے والی عبادت کا تذکرہ کیا تو اس کے بعد ایک ایسی چیز کا تذکرہ کیا جو عبادت اور عادت دونوں اعتبار سے ما بہ الامتیاز ہو۔

فلا تخفروا اللہ ...... : باب افعال (اخفار) سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے عہد میں خیانت مت کرو، اور اس سے تعرض مت کرو۔ (مرقاۃ: ۱/۷۲)

شیخ عبد الحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ مذکورہ تین چیزوں کو ذکر کیا گیا مگر ارکان اسلام (شہادتین) وغیرہ کو ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ یہ تینوں چیزیں اسلام کی مضبوط نشانیاں اور کافر و مسلم کے درمیان ما بہ الامتیاز ہیں۔ (اشعۃ اللمعات: ۱/۵۴)

مرزائیوں کا اعتراض مع جواب

اس حدیث پاک سے مرزائی وغیرہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ تین کام تو ہم بھی کرتے ہیں پھر ہماری تکفیر کیوں کی جاتی ہے۔

جواب: یہ ہے کہ یہ تین چیزیں ایمان کی ظاہری علامات ہیں، اور ظاہری علامت اس وقت معتبر ہوتی ہے جب کہ اس کا منافی موجود نہ ہو اور ان لوگوں میں منافی ایمان موجود ہے، اور وہ ہے بعض ضروریات دین کا انکار، وہ بہت سی ضروریات دین کا انکار کرتے ہیں، اس لئے منافی ایمان کے ہوتے ہوئے ان چیزوں کے پائے جانے سے ان کو مومن نہیں کہا جائیگا۔

الزامی جواب یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے نہ ماننے والوں کی تکفیر کی ہے حالانکہ ان کے مخالفین یہ تینوں کام کرتے ہیں، کیا یہ اس حدیث کے خلاف نہیں۔

﴿جنت کا مستحق بنانے والے اعمال﴾

﴿۱۳﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ اَتٰی اَعْرَابِیٌّ اَلنَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ دُلَّنِیْ عَلٰی عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُهٗ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ، قَالَ تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَاتُشْرِكُ بِهٖ شَیْئًا، وَتُقِیْمُ الصَّلٰوةَ الْمَكْتُوْبَةَ وَتُؤَدِّیْ الزَّكٰوةَ الْمَفْرُوْضَةَ، وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ، قَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَا اَزِیْدُ عَلٰی هٰذَا شَیْئًا وَلَا اَنْقُصُ مِنْهُ فَلَمَّا وَلّٰی قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یَنْظُرَ اِلٰی رَجُلٍ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ، فَلْیَنْظُرْ اِلٰی هٰذَا۔ (متفق علیه)

حواله: بخاری شریف: ص ۱۸۷/۱، باب وجوب الزکوۃ، کتاب الزکوۃ، حدیث نمبر: ۱۳۹۷، مسلم شریف: ص ۳۱/۱، باب الایمان، الذی یدخل بہ الجنۃ، کتاب الایمان، حدیث نمبر: ۱۴،

حل لغات: دلنی، امر حاضر، دلَّ (ن) علیہ، والیہ دلالۃ، بتانا، اطلاع دینا، ولّٰی ماضی واحد مذکر غائب، رخ موڑ کر جانا، ھاربا، پیٹھ پھیر کر بھاگنا، سرہ، (ن) سرورا، ومسرۃ، خوش کرنا۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ (اے اللہ کے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) مجھ کو کوئی ایسا عمل بتایئے جس پر عمل پیرا ہو کر میں جنت میں چلا جاؤں، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو، فرض نماز ادا کرو، فرض زکوۃ دو، رمضان کے روزے رکھو، دیہاتی نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میں اس میں کچھ بھی کمی بیشی نہیں کروں گا، جب وہ دیہاتی جانے کے لئے مڑا، تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کو کسی جنتی آدمی کو دیکھ کر مسرت حاصل ہوتی ہو، وہ اس شخص کو دیکھ لے۔

تشریح: اتی اعرابی الخ: "اتی اعرابی" ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ، وہ شخص جو جنگل میں رہتا ہو اور اس کی ضد حضری ہے یعنی وہ شخص جو شہر میں رہتا ہو جیسے عربی عجمی کی ضد ہے۔ (اُبی مع سنوسی: ۱/۳۹)

اس اعرابی کے متعلق اختلاف ہے کہ یہ کون تھا بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبیلۂ قیس کے ایک فرد تھے جن کا نام ابن المنتفق تھا اور صیر فی کی رائے یہ ہے کہ ان کا نام لقیط بن صبرہ تھا، جو ابن المنتفق کے نام سے جانے جاتے تھے اور حافظ ابن

حجرؒ نے ذکر کیا ہے کہ ایسا ہی قصہ ایک اور صحابیؓ کا پیش آیا ہے، کہ انہوں نے بھی اسی طرح کے سوال کئے تھے، جن کا نام ''صخر بن القعقاع'' تھا۔ (فتح الباری: ۱۳۹۷/۷/۳، کتاب الزکوۃ)

ایک اعرابی دیہاتی شخص آیا اور اس نے آ کر سوال کیا: **دُلَّنِي عَلٰى عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُهٗ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ الخ.**

حضرت جی ایسا عمل بتا دیجئے کہ میں اس پر عمل کر کے جنت میں داخل ہو جاؤں جنت میں داخل ہونے کا عمل بتا دیجئے۔ دخول جنت سے مراد دخول اولیٰ ہے کہ دخول جنت سے قبل کسی قسم کا عذاب نہ چکھنا پڑے۔ (مرقاۃ: ۱/۷۲)

حدیث پاک سے یہ خاص فائدہ حاصل ہوا کہ آدمی جب کسی کے پاس جائے اپنے مطلب کی ضروری بات عرض کر دینی چاہئے، آجکل کی طرح نہیں کہ ادھر ادھر کی بے ضرورت اور بلا فائدہ باتیں کرتے رہیں گے، اور اصل مقصد پوچھنے پر بھی نہیں بتاتے اور پھر اخیر میں چلتے ہوئے کہیں گے کہ فلاں کام بھی تھا، یا فلاں چیز کے لئے تعویذ چاہئے جس میں وقت بھی ضائع ہوتا ہے، اور مقصد نہ بتانے کی وجہ سے تشویش بھی رہتی ہے کہ اتنی دور سے آیا اور کوئی کام نہیں اور لوگ اس کو تہذیب سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ تہذیب نہیں بلکہ تعذیب ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محنت اور برکت کی وجہ سے اس وقت کیسا پاکیزہ ماحول بن گیا تھا کہ ایک دیہاتی شخص بھی کیسا مؤدب تھا، اور دیہاتی شخص کے سامنے بھی دنیا کے بجائے اپنی آخرت کا مسئلہ تھا کہ جنت میں داخل ہونے کا عمل دریافت کرتا ہے۔

اور آج اچھے دیندار لوگ بھی کوئی دست غیب کا عمل پوچھتا ہے، کوئی تسخیر کا، آخرت کے بننے سنورنے کی کسی کو فکر نہیں، الا ماشاء اللہ۔

تعبد اللہ: یہ جملہ خبریہ بمعنی امر ہے یا مصدر کی تاویل میں ہے 'ان' کے مقدر ہونے کی وجہ سے، لیکن جب 'ان' محذوف ہوگیا تو اس کا عمل باطل ہوگیا، البتہ بعض علماء مقدر کو ملفوظ کے درجہ میں قرار دیکر منصوب پڑھتے ہیں اور اس سے مراد توحید ہے کیونکہ اس پر عبادات کا عطف کیا گیا ہے اور معطوف علیہ کے درمیان اصلاً مغایرت ہوتی ہے۔ (مرقاۃ ایضاً)

وَلاتُشْرِکُ بِہٖ شَیْأً الخ: تعبد اللہ کے بعد ولا تشرک بہ الخ جملہ لانا بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ تعبد اللہ سے توحید مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرنا، اور اسی کی تاکید کے لئے یہ جملہ لائے وَلاتُشْرِکُ بِہٖ شَیْأً الخ. اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، اس میں شرک کی تمام اقسام کی نفی ہوگئی۔ (۱) شرک فی الذات۔ (۲) شرک فی الصفات۔ (۳) شرک فی العبادات وغیرہ۔

مطلب یہ ہوا کہ نہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں کسی کو شریک ٹھہرانا، نہ اس کی صفات میں کسی کو شریک ٹھہرانا، اور نہ اس کی عبادت میں کسی کو شریک ٹھہرانا، معلوم ہوگیا کہ توحید کا پختہ ہونا اور شرک سے حفاظت اصل الاصول اور بنیادی چیز ہے، کہ اس کے بغیر کوئی عبادت بھی معتبر نہیں، توحید کے پختہ ہونے اور شرک سے حفاظت کے بعد عبادات کا نمبر ہے، اس لئے اس کے بعد فرمایا: "وَتُقِیْمُ الصَّلٰوۃَ الْمَکْتُوبَۃَ الخ" فرض نماز ادا کرتے رہنا، پابندیٔ اوقات اور خشوع وخضوع کے ساتھ مگر آج بہت سے لوگ نوافل کا اہتمام کرتے ہیں، فرائض کا اہتمام نہیں کرتے جو بڑی کوتاہی ہے۔

وَتُؤَدِّی الزَّکٰوۃَ الْمَفْرُوضَۃَ الخ: اور ارشاد فرمایا: کہ فرض زکوۃ ادا کرتے رہنا۔

وَتَصُومُ رَمَضَانَ الخ: اور رمضان کے روزے رکھتے رہنا۔

اشکال مع جواب

اس پر اشکال یہ ہے کہ جس طرح نماز کے ساتھ مکتوبہ کی اور زکوۃ کے ساتھ مفروضہ کی قید لگائی۔ اس طرح رمضان کے ساتھ کوئی قید نہیں لگائی بلکہ مطلق "تصوم رمضان" کہا؟

جواب یہ ہے کہ نماز نفلی بھی ہوتی ہے اسی لئے مکتوبہ کے ساتھ مقید کیا۔ اور زکوۃ لغۃ تمام صدقات کو عام ہے لہذا وہاں بھی مفروضہ کی قید لگائی، لیکن رمضان کا روزہ چونکہ فرض ہی ہوتا ہے جس کی بناپر مطلق نیت سے بھی درست ہو جاتا ہے اس لئے فرضیت پر دلالت کرنے والی کسی چیز سے اس کو مقید نہیں کیا۔ (مرقاۃ:۲/۷۲)

نیز نماز کے لئے مکتوب اور زکاۃ کے لئے مفروض کی قید محض تفنن اور ایک عبارت کے بار بار استعمال سے بچنے کے لئے ہے۔ (فتح الباری:۱۳۹۷/۸/۳)

والذی نفسی بیدہ: (**اشکال**) اس پر اشکال یہ ہے کہ "ولاتجعلوا اللہ عرضۃً لایمانکم ان تبروا وتتقوا ......" کے ذریعہ قسم پر نکیر فرمائی گئی ہے پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اعرابی کے قسم کھانے پر تنبیہ کیوں نہیں فرمائی۔

جواب: جواب یہ ہے کہ بسااوقات احوال واشخاص کی وجہ سے احکام متفاوت ہوتے ہیں ممکن ہے یہاں پر بھی خاص آدمی کے لئے خصوصی حالت میں جائز رکھا گیا ہو، بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اس قسم کا صدور اس شخص سے محض تصدیق اور قبول میں مبالغہ کے طور پر تھا اور اسمیں کوئی حرج نہیں۔ (طیبی:۱/۱۳۳، التنظیم الاشتات:۱/۵۰)

لاازید علی ھذا ولا انقص: مطلب یہ ہے کہ

(۱)......آپ کے بیان کردہ احکام میں کمی زیادتی نہیں کرونگا، فرائض کی صفات ورکعات

وغیرہ میں تبدیلی کر کے۔

(۲)...... یا یہ کہ میں چونکہ اپنی قوم کی جانب سے قاصد ہوں لہذا آپ کا یہ فرمان بلا کم وکاست اپنی قوم کو پہنچادونگا۔

(۳)......یا مطلب یہ ہے "**لا ازید علی السوال ولا انقص فی العمل مما قلت**" نہ مزید سوال پر زیادتی کرونگا، اور نہ جو آپ نے ارشاد فرمایا ہے عمل میں کچھ کمی کرونگا۔

(۴)......اصل مقصد "**لا انقص**" ہے اس کی تاکید کے لئے "**لا ازید**" بڑھادیا جیسے ہم کسی چیز کے دام کے بارے میں بائع سے کہتے ہیں کچھ کمی بیشی نہیں ہوگی حالانکہ مقصد کمی ہے بیشی نہیں۔

من سره ان ینظر ......: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ جو شخص کسی جنتی کو دیکھنا چاہے اس کو دیکھ لے۔ ممکن ہے کہ وحی کی بنا پر صادر ہوا ہو کہ وحی کے ذریعہ اس کے جنتی ہونے کا علم ہو گیا ہو، یا غلبہ ظن کی بنا پر آپ نے ایسا فرمایا یا عبارت محذوف ہے کہ اگر اس قول کے مطابق مداومت کی، تو جنت میں داخل ہوگا اور اس کی تائید حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی اسی جیسی روایت سے ہوتی ہے جس کو امام مسلمؒ نے ذکر کیا ہے اس میں ہے۔
"**ان تمسک بما امر به دخل الجنة**"

یہ تینوں احتمال اس وقت ہیں جب کہ فرد حقیقی مراد ہو جس نے آکر سوال کئے تھے اور اگر فردِ جنسی مراد ہو تو مطلب ہوگا کہ ہر وہ شخص جو اس طرح مامورات پر عمل اور محظورات سے اجتناب کریگا۔ وہ جنت میں داخل ہوگا۔ (مرقاۃ ایضا، فتح الباری: ۳/۸)

فائدہ: اس جیسی احادیث کی بنا پر امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ ان سے ترک تطوعات کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ لیکن جو شخص ترکِ سنن پر مداومت کریگا، اس کے دین میں نقصان آئیگا

اور اگر ان سے اعراض کی بنا پر یا ان کو کم تر سمجھ کر ایسا کریگا تو یہ فسق ہوگا، کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔"من رغب عن سنتی فلیس منی......" (فتح الباری ایضاً)

نیز فرائض کی ادائیگی کافی ہے یہ اس وقت ہے جب کہ فرائض کامل ومکمل طور پر ادا ہوں، اور کامل طور پر کون ادا کر سکتا ہے، نیز فرائض کے نقصان کی تکمیل نوافل سے کی جائے گی، اس لئے نوافل کا ذخیرہ بھی ہونا چاہئے اور نوافل کا بھی اہتمام کرنا چاہئے۔

اشکال مع جواب

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حج کا حکم نہیں فرمایا غالباً اس وقت تک حج کا حکم نازل نہ ہوا ہوگا، یا اس لئے کہ وہ حج کے ارادہ سے نکلا تھا اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی، یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ذکر فرمایا تھا جیسا کہ ابن عباسؓ کی روایت میں ہے مگر یہاں راوی سے نسیاناً چھوٹ گیا ہو۔

﴿استقامت﴾

﴿۱۴﴾ وَعَنْ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الثَّقَفِي رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عنه قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ قُلْ لِي فِي الْإِسْلَامِ قَوْلاً لَا اَسْأَلُ عَنْهُ اَحَداً بَعْدَكَ وَفِي رِوَايَةٍ غَيْرَكَ قَالَ قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ۔ (روا۔ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ص ۴۸/۱، حدیث نمبر: ۳۸، باب جامع اوصاف الاسلام، کتاب الایمان،

حل لغات: استقم، امر حاضر ہے، استقام، استقامة، سیدھا ہونا، کہا جاتا ہے

اِسْتَقَمَ له الامر، معاملہ اس کے لئے ٹھیک و درست ہو گیا۔

ترجمہ: حضرت سفیان بن عبداللہ الثقفیؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اسلام کے متعلق ایسی بات بتا دیجئے کہ آپ کے بعد کسی سے دریافت کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ کے علاوہ سے پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ "تم زبان سے اس بات کا اقرار کرو کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا، پھر اسی اعتراف پر قائم رہو"۔

تشریح: قل امنت باللہ ثم استقم: کہ اول ایمان لے آؤ اور اس کے تمام تقاضوں کو پورا کرو اور اس کے مطابق عملی زندگی کو آخری دم تک قائم رکھو۔

اندریں رہ می تراش و می خراش
تادم آخر دمے فارغ مباش

قول وعمل: یہی دو چیزیں ہیں اور کیا ہے؟ یہ ہے استقامت جو سب سے بڑھ کر ہے، رنج وخوشی میں ضعف وشباب میں اجتماعی زندگی میں انفرادی زندگی میں ہر حال میں، ایمان سے پوچھو جس طرح وہ کہے اس طرح عمل کرو اگر اس کی تفصیل تمہارے پاس موجود ہو تو خود اپنے قلب سے پوچھ لو ورنہ اہل علم سے پوچھ کر عمل کرو آپ نے پورے دین کو ان دو جملوں میں بند کر دیا۔

جامعیت حدیث

اس وجہ سے یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے کیونکہ تمام ایمانیات اور تمام طاعات

ل **احوال:** سفیان بن عبد اللہ بن ربیعة الثقفی، الطائفی، قبیلہ ثقیف کی جانب نسبت کر کے ثقفی اور اہل طائف میں شمار ہونے کی بنا پر طائفی کہا جاتا ہے۔ آپ کی کنیت ابو عمرو ہے اور بعض علماء نے ابو عمرہ ذکر فرمائی ہے، حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے طائف کا عامل بنایا تھا اور ان کی کل مرویات کی تعداد پانچ ہے۔
(مرقاۃ: ۱/۱۳۰، اصابہ: ۵۴، ۲/۵۵، الاکمال: ۵۹۷، استیعاب علی ہامش الاصابہ: ۲/۶۶)

کوشامل ہے، امنت باللہ میں ایمانیات کا تذکرہ ہے اور ثم استقم کے ذریعہ ہر قسم کی طاعت مراد ہے کیونکہ استقامت نام ہے ہر مامور کی ادائیگی اور ہر منکر سے پرہیز کا، اسی وجہ سے دین کے کسی عمل سے بھی انحراف استقامت کی ضد ہے اور اسی کو قرآن پاک میں "ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم ولاھم یحزنون" سے ذکر کیا گیا ہے۔(مرقاۃ:۱/۷۳)

وفی روایۃ غیرک: یعنی ایک روایت میں "احدا غیرک" ہے اور دوسری میں "احدا بعدک" اور دونوں کے معنی میں تلازم ہے اس لئے کہ جب آپ کے بعد کسی سے سوال نہیں کریگا تو یہ بات لازمی ہے کہ ان کے علاوہ سے سوال نہیں کریگا۔ (طیبی:۱/۱۳۳، مرقاۃ:۱/۷۳)

معنی استقامت

پھر لفظ آمنت کے اندر جمیع مامورات ومنہیات آگئے، اور استقم سے اس پر مداومت کی تاکید کی گئی، یا آمنت میں صرف ایمان کی تلقین ہے اور استقم سے جمیع اوامر ونواہی کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ استقامت کے معنی ہیں "الامتثال بجمیع المامورات والاجتناب عن جمیع المنھیات" اسی لئے صوفیائے کرام سے منقول ہے کہ الاستقامۃ خیر من الف کرامۃ اسی لئے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ فاستقم کما امرت سے بڑھ کر مشکل کوئی آیت نازل نہیں ہوئی پھر استقامت کے بارے میں حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے کچھ اقوال منقول ہیں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ استقامت کہا جاتا ہے کہ امر ونہی پر اس طرح مضبوط رہنا کہ لومڑی کی طرح ادھر ادھر بالکل میلان نہ ہو، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ

عنہ فرماتے ہیں کہ ''الاستقامۃ ان لا تشرک باللہ شیئاً'' حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ استقامت ہے اخلاص العمل للہ تعالیٰ، حضرت ابن عباس اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے منقول ہے کہ اداء الفرض کا نام استقامت ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت و محبت میں اس طرح مشغول ہو کہ دائیں بائیں بالکل التفات نہ ہو۔ بہر حال یہ مختلف عبارات ہیں اصل مفہوم ایک ہی ہے کہ دین پر مضبوط رہنا۔ (مرقاۃ)

﴿فرائض اسلام کا تذکرہ﴾

﴿۱۵﴾ وَعَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَىٰ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ أَهْلِ نَجْدٍ ثَائِرَ الرَّأْسِ نَسْمَعُ دَوِيَّ صَوْتِهٖ، وَلَا نَفْقَهُ مَا يَقُولُ حَتّٰى دَنَا مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا هُوَ يَسْأَلُ عَنِ الْإِسْلَامِ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُنَّ فَقَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ، قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ، فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهٗ، قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ وَذَكَرَ لَهٗ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الزَّكٰوةَ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا فَقَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ فَأَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُولُ وَاللّٰهِ لَا أَزِيدُ عَلَىٰ هٰذَا وَلَا أَنْقُصُ مِنْهُ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَفْلَحَ الرَّجُلُ إِنْ صَدَقَ۔ (متفق علیه)

حوالہ: بخاری شریف: ص۱۱،۱۲/۱باب الزکوٰۃ من الاسلام، کتاب الایمان، حدیث نمبر:۴۶، مسلم شریف: ص۳۰/۱، باب بیان الصلوات التی ھی احد ارکان

الخ، کتاب الایمان، حدیث نمبر:۱۱،

حل لغات: نجد، عراق وحجاز کے درمیان جزیرۂ عرب کا علاقہ جس کی آب وہوا اور شادابی کی تعریف اکثر شعرائے عرب نے کی ہے، نجد وحجاز اب سعودی حکومت کے دور میں سعودی عرب کہلاتے ہیں (القاموس الوحید:ص۲/۱۶۱۲) ثائر، منتشر بکھرا ہوا، ثائر الرأس، پراگندہ بال، الدوی، مکھی وغیرہ کی بھنبھناہٹ، ہلکی آواز، نفقہ، مضارع جمع متکلم، فقہ (س) الامر، فَقهاً و فِقهاً اچھی طرح سمجھنا، ادراک کرنا، دنا، ماضی، واحد مذکر غائب، منہ والیہ ولہ، دنواً (ن) نزدیک ہونا، قریب ہونا، تطوع، تفعل سے نفل پڑھنا، یعنی غیر مفروضہ عبادت کرنا، افلح، ماضی مذکر غائب، افعال سے، بامراد کامیاب ہونا، آخرت کی نعمت حاصل کرنا،

ترجمہ: حضرت طلحہ[1] بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: کہ ''اہل نجد'' کا ایک پراگندہ بال شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہم اس کی آواز کی بھنبھناہٹ تو سن رہے تھے، لیکن اس کی بات ہمارے سمجھ میں نہیں آرہی تھی، یہاں تک کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوگیا، تو معلوم ہوا کہ وہ اسلامی اعمال کے متعلق کچھ پوچھ رہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ ''دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں'' اس شخص نے کہا کہ میرے اوپر ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ

[1] احوال: طلحہ بن عبید اللہ عثمان القرشی التیمی، ان کی کنیت ابو محمد ہے، عشرہ مبشرہ میں ہیں، اور ان آٹھ لوگوں میں ہیں جو سابقین فی الاسلام ہیں اور ان پانچ لوگوں میں ہیں جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر اسلام لائے نیز ان چھ لوگوں میں ہیں جن کو حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلیفہ چننے کے لئے شوریٰ میں نامزد کیا تھا۔ بدر کے علاوہ تمام غزوات میں شریک رہے لیکن چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عیر قریش کی خبر لانے کے لئے حضرت سعید بن زیدؓ کے ساتھ بھیجا تھا اس وجہ سے ان کا حصہ لگایا گیا تھا، جنگ احد میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں سے بچانے میں انگلیاں شل ہوگئی تھیں، یہاں تک کہ چوبیس اور عند البعض پچھتر زخم لگے تھے، جنگ جمل ۳۶ھ میں شہادت پائی اور بصرہ میں تدفین عمل میں آئی۔ (اصابہ:۲۲۹/۱، اکمال:۶۰۱، مرقاۃ:۷۵/۱)

تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''نہیں، مگر یہ کہ تم نفل ادا کرو'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ ''رمضان کے روزے فرض ہیں'' اس شخص نے کہا کہ میرے اوپر اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، الا یہ کہ تم نفلی روزے رکھو'' حضرت طلحہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوۃ کا بھی ذکر کیا، اس شخص نے کہا کہ کیا میرے اوپر اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں الا یہ کہ تم صدقات ادا کرو'' راوی کہتے ہیں اس نے جانے کے لئے پیٹھ پھیری اور یہ کہتے ہوئے چلدیا کہ ''خدا کی قسم میں نہ تو اس میں زیادہ کروں گا، اور نہ کمی کروں گا'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ ''اگر اس نے سچ کہا ہے تو یہ کامیاب ہو گیا۔''

تشریح: من اہل نجد الخ: بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ان کا نام ضمام بن ثعلبہ تھا، جو بنو سعد بن بکر کی جانب سے آئے تھے۔ (مرقاۃ)

نجد: ایک صوبہ کا نام تھا۔ (اور نجد اصل میں بلند زمین کو کہتے ہیں جو تہامہ بمعنی غور و پست کی ضد ہے، گویا عرب کے دو حصے ہیں ایک بلند جس کو نجد اور دوسرا پست جس کو تہامہ کہتے ہیں اور وہ مکہ اور عراق کے درمیان ہے) (مرقاۃ)

ثائر الراس: یعنی پراگندہ بال یہ صفت بھی ہو سکتی ہے اور حال بھی (الرجل سے) وہ پراگندہ سر تھا، معلوم ہوا کہ طالب علم کو سیدھا سادھا رہنا چاہئے، بناؤ سنگار مانگ پٹی کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ ان چیزوں میں مشغولی کی وجہ سے مقصد فوت ہو جاتا ہے، جو طلباء بناؤ سنگار میں لگے رہتے ہیں، محروم ہو جاتے ہیں۔

اس کی آواز کی بھنبھناہٹ سی آئی معنی کچھ نہ سمجھے۔

چونکہ وہ شخص قوم کا قاصد اور نمائندہ تھا اور قوم نے اسکو سوالات دریافت کرنے کیلئے بھیجا تھا اس لئے وہ ان سوالات کو دہراتا ہوا آ رہا تھا کہ کبھی سوالات میں کمی بیشی ہو جائے۔

دوی: ایسی آواز جس کے معنی سمجھ میں نہ آویں۔(اوراصلاً دویٔ شہد کی مکھی کی گنگناہٹ کو کہتے ہیں، اس سے مراد گنگنی آواز ہے، کیونکہ دوری کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آرہی تھی) جب وہ قریب آ گئے تو سمجھ میں آیا کہ وہ اسلام کے متعلق سوال کررہا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے بڑے ارکان ذکر کردئے۔(کیونکہ اس کا سوال ارکان اسلام کے بارے میں تھا، اسی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادتین کا تذکرہ نہیں کیا، کیونکہ اسلام سے تو وہ پہلے ہی متصف تھا)(مرقاۃ)

اسلام کے پانچ بڑے بڑے رکن ہیں۔

(۱) دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں ہیں۔

اس نے کہا کیاان نمازوں کے علاوہ اور بھی کچھ میرے ذمہ ہے؟

آپ نے فرمایا: نہیں مگر یہ کہ تم نفل پڑھو۔

نفل کے شروع کرنے سے واجب ہونے میں اختلاف

اس استثناء کا اختلاف بہت سے مسائل میں منشأ نزاع ہے شوافع کی رائے یہ ہے کہ استثناء منقطع ہے اور مطلب یہ ہے کہ اور کچھ واجب تو نہیں، لیکن اگر کچھ نفلی طور پر ادا کرنا چاہو تو تمہارے اختیار میں ہے جس سے نوافل کے شروع کرنے کے بعد اتمام واجب ہونا لازم نہیں آتا۔ اور احناف کے یہاں استثناء متصل ہے اور مطلب یہ ہے کہ فرض تو تم پر بقیہ چیزیں نہیں ہیں لیکن اگر تم نے نفلی طور پر شروع کردیا تو اب اتمام واجب ہے۔(فتح الباری:۱۴۸،۱/۴۶)

اور اس کے بہت سے دلائل ہیں، چنانچہ قرآن کریم میں ہے: ولیوفوا نذورھم. اس میں سب کا اتفاق ہے کہ اگر قولاً نذر کر لے تو ایفاء لازم ہے حالانکہ اب تک شروع ہی نہیں کیا۔ تو جب فعلی نذر سے شروع کردے تو بطریق اولیٰ لازم ہونا چاہئے۔

نیز "ولاتبطلوا اعمالکم" سے معلوم ہوتا ہے کہ اعمال کو باطل نہ کرو اور شروع کر کے توڑ دینا ابطال عمل ہے اور اس سے منع کیا گیا تو اتمام واجب ہوگا۔ تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ حج شروع کر کے توڑ دینے سے اس کی قضا واجب ہے حالانکہ اس میں دقت زیادہ ہے۔ تو نماز روزہ شروع کر کے توڑ دینے سے بطریق اولی قضا لازم ہوگی کیونکہ یہ اس سے اسہل ہے۔

قال وصیام شهر رمضان الخ: ارشاد فرمایا: اور رمضان کے روزے، اس نے کہا کہ کیا ان روزوں کے علاوہ اور بھی روزے میرے ذمہ میں ہیں۔

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ نہیں مگر یہ کہ تم نفل روزے رکھو۔

قال وذکر لہ......": قال کا فاعل حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ ہیں، (مرقاۃ/۱/۷۵) اور یہ عبارت اس پر دلالت کرتی ہے کہ راوی نے روایت میں اجمال اختیار کیا ہے۔ کیونکہ بظاہر راوی کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اگر فرائض پر مداومت ہے تو ناجی ہے۔ اگر چہ نوافل نہ ادا کرے۔ (فتح الباری: ۱/۱۴۸/۴۶)

اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اسلام کا ایک شعبہ زکوٰۃ ہے۔

اس نے کہا کیا اس کے علاوہ اور بھی صدقہ مجھ پر فرض ہے؟

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ نہیں مگر یہ کہ تم نفلی طور پر ادا کرو۔

یہ پوچھ کر چلا اور وہ کہہ رہا تھا: وَاللهِ لَا اَزِيْدُ عَلٰى هٰذَا وَلَا اَنْقُصُ الخ.

کہ خدا کی قسم نہ اس پر میں زیادہ کروں گا، نہ کم کروں گا، اس جملہ کی تشریح گذشتہ حدیث کے ذیل میں گذر چکی ہے، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کی مغفرت کو جان لیا، اور مغفرت کی سند دیدی کہ اگر یہ اپنے قول میں سچا ہے تو کامیاب ہو گیا۔ اَفْلَحَ الرَّجُلُ اِنْ صَدَقَ الخ. یہ جملہ دو طرح پڑھا گیا ہے، اِن ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ، اس صورت میں اِن

شرطیہ ہوگا، مطلب یہ ہوگا کہ یہ شخص اگر سچ بول رہا ہے تو کامیاب ہوگیا، اور جملہ شرطیہ ہوگا، دوسری صورت ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے اور اس سے قبل لام تعلیلیہ محذوف ہوگا، لِاَنْ صَدَقَ اس صورت میں یہ افلح کی علت ہوگی، اور مطلب یہ ہوگا کہ یہ شخص کامیاب ہوگیا، اس لئے کہ وہ سچ بول رہا ہے، گویا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جزم ویقین کے ساتھ اس کے کامیاب ہونے کی بشارت سنادی اور اس کی علت بھی بیان فرمادی۔

معنی فلاح

فلاح کے معنی کامیابی اور مقصد کا حصول ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) دنیوی: یعنی دنیاوی زندگی کی آسائش کا حصول۔ (۲) اخروی: ان چیزوں کا حصول جن سے اخروی کامیابی حاصل ہو۔

اور بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اس سے چار چیزیں مراد ہیں۔ (۱) بقاء ہو فنا نہ ہو۔ (۲) مالداری ہو غریبی نہ ہو۔ (۳) عزت ہو ذلت نہ ہو۔ (۴) علم ہو جہل نہ ہو۔ (طیبی: ۱/۱۳۶)

غیر اللہ کی قسم

بعض روایات "افلح و ابیہ" ہے حالانکہ غیر اللہ کی قسم ناجائز ہے اسی وجہ سے امام زرقانی فرماتے ہیں کہ مضاف محذوف ہے اور عبارت ہے "افلح و رب ابیہ" اور علامہ شامیؒ وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ یہ حلف لغوی ہے جس میں محض تزئین کلام مقصود ہے۔ (تنظیم الاشتات: ۱/۵۴)

حج کو ذکر نہ کرنے کی وجہ

اب حدیث ہذا میں حج کا ذکر اس لئے نہیں فرمایا کہ اس شخص پر فرض نہ تھا۔ یا اس لئے

کہ اس وقت حج فرض نہیں ہوا تھا، سب سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں حج کا بھی ذکر ہے۔ یہاں راوی سے نسیاناً چھوٹ گیا ہوگا۔

وجوب وتر پر اشکال مع جوابات

اس حدیث سے شوافع وغیرہ نے وتر کے عدم وجوب پر استدلال کرلیا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صلوٰۃ خمسہ کے علاوہ بقیہ نمازوں کے وجوب کی نفی فرمائی۔ جس سے وتر کے وجوب کی نفی ہوگئی، احناف کے نزدیک صلوٰۃ وتر واجب ہے۔ اصل مسئلہ کی تفصیل کتاب الصلوۃ کے باب الوتر میں آئے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہاں صرف ان کے استدلال حدیث ہذا کا جواب دیا جاتا ہے۔

(۱)......اس وقت وتر واجب نہیں ہوا تھا۔

(۲)...... یہاں فرائض اعتقادیہ کی نفی ہے۔ اور وتر ہمارے نزدیک بھی فرائض اعتقادیہ میں سے نہیں ہے۔

(۳)......عدم ذکر سے عدم وجوب لازم نہیں آتا، کیونکہ ایک حدیث میں تمام احکام کا ذکر ضروری نہیں ہے۔ پس وتر کا ذکر اس میں گرچہ نہیں مگر دوسری حدیث میں مذکور ہے، جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(۴)...... حدیث شریف میں فرائض مستقلہ کی نفی ہے، اور وتر ہمارے نزدیک بھی واجب ہے، نہ کہ فرض۔ اور فرض وواجب میں واضح فرق ہے۔

(۵)......وتر مستقل نماز نہیں، بلکہ عشاء کے تابع ہے، اس لئے عشاء کی نماز میں وتر بھی شامل ہیں، لہٰذا حدیث پاک سے وتر کی نفی نہیں ہوئی۔

﴿وفد عبد القیس کی آمد﴾

﴿۱۶﴾ وَعَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ اِنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَیْسِ لَمَّا اَتَوُا النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: "مَنِ الْقَوْمُ اَوْ مَنِ الْوَفْدُ قَالُوا رَبِیْعَۃُ قَالَ مَرْحَباً بِالْقَوْمِ اَوْ بِالْوَفْدِ غَیْرَ خَزَایَا، وَلَانَدَامٰی قَالُوا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّا لَا نَسْتَطِیْعُ اَنْ نَأْتِیَکَ اِلَّا فِی الشَّھْرِ الْحَرَامِ وَبَیْنَنَا وَبَیْنَکَ ھٰذَا الْحَیُّ مِنْ کُفَّارِ مُضَرَ فَمُرْنَا بِاَمْرٍ فَصْلٍ نُخْبِرْ بِہٖ مَنْ وَرَاءَ نَا، وَنَدْخُلْ بِہِ الْجَنَّۃَ وَسَأَلُوْہُ عَنِ الْاَشْرِبَۃِ فَاَمَرَھُمْ بِاَرْبَعٍ وَنَھَاھُمْ عَنْ اَرْبَعٍ اَمَرَھُمْ بِالْاِیْمَانِ بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا الْاِیْمَانُ بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ؟ قَالُوا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ، قَالَ شَھَادَۃُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ وَاِقَامُ الصَّلٰوۃِ، وَاِیْتَاءُ الزَّکٰوۃِ، وَصِیَامُ رَمَضَانَ، وَاَنْ تُعْطُوا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخُمُسَ، وَنَھَاھُمْ عَنْ اَرْبَعٍ عَنِ الْحَنْتَمِ، وَالدُّبَّاءِ، وَالنَّقِیْرِ، وَالْمُزَفَّتِ، وَقَالَ احْفَظُوْھُنَّ، وَاَخْبِرُوا بِھِنَّ مَنْ وَرَاءَ کُمْ۔ (متفق علیہ) وَلَفْظُہٗ لِلْبُخَارِیِّ۔

حوالہ: بخاری شریف:۱/۱۳، باب بیان الخمس من الایمان، کتاب الایمان، حدیث نمبر:۵۳، مسلم شریف:ص۳۴، ۱/۳۵، باب الامر بالایمان باللہ الخ، کتاب الایمان، حدیث نمبر:۱۷،

حل لغات: وفدٌ، باحیثیت لوگوں کے پاس جانے والی منتخب افراد کی جماعت، جمع وفود، مرحباً خوش آمدید، رحب (س) المکان رحباً، جگہ کا کشادہ ہونا، خزایا، خزیان کی جمع ہے، ذلیل وخواری، خزی (س) خزیً، رسوا ہونا، ندمی، ندمان کی جمع

ہے، شرمندہ، ندم علي الامر، ندماً، ندامةً، (س) کسی بات کے کرنے کے بعد پشیمان ہونا، المغنم، جنگ میں حاصل کیا ہوا مال، ج مغانم، غنم الشيئ غنماً، (س) حاصل کرنا، پالینا، الحنتم، وہ گھڑا جس میں نبیذ تیار کی جاتی ہے، ج حناتم، الدباء، کدو کے اس برتن کو کہتے ہیں جس میں کدو کو بیل پر ہی خشک کرلیا جائے، اور پھر اندر سے خشک گودا نکالکر برتن جیسا بنالیا جائے۔ النقير، پیالہ نما کھودی ہوئی لکڑی، جس میں کھجور کی شراب بنائی جاتی تھی، المزفت، ایک برتن جس کے چاروں طرف تارکول لیپ دیا جاتا تھا۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباس[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب وفد عبدالقیس حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ یا یہ پوچھا کہ یہ کس قبیلے کے افراد ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ قبیلہ ربیعہ کے لوگ ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''خوش آمدید، نہ تمہارے لئے دنیا میں رسوائی ہے، نہ آخرت میں شرمندگی ہے'' اہل وفد نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر کا قبیلہ پڑتا ہے، اس وجہ سے ہم آپ کی خدمت میں صرف ان مہینوں میں حاضری دے سکتے ہیں جن میں جنگ کرنا حرام ہے، لہٰذا آپ ایسے واضح احکام ہم کو بتا دیجئے، جن سے ہم اپنے پیچھے کے لوگوں کو مطلع

---

[1] **احوال:** عبداللہ بن العباس بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف القرشی، الہاشمی، آپ کی کنیت ابو العباس ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں اور آپ کی والدہ لبابہ بنت الحارث، حضرت میمونہؓ (جو ازواج مطہراتؓ میں ہیں) کی بہن ہیں ہجرت سے تین سال قبل پیدا ہوئے جب بنو ہاشم کو شعب ابی طالب میں محصور کیا ہوا تھا، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت آپ کی عمر تیرہ سال تھی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے حکمت، فقہ اور تاویل کی دعا فرمائی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کو رئیس المفسرین کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اور حضرت جبرئیل کو دو مرتبہ دیکھنے کی سعادت آپکو حاصل ہے، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت کے زمانہ میں سن ۶۸ ہجری میں ۷۱ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (الاصابہ: ۲/۳۴۰، مرقاۃ: ۶:۷۶/۱، اکمال: ۶۵)

کردیں، اوران پر عمل کر کے ہم خود بھی جنت میں داخل ہوجائیں، اورانہوں نے شراب کے برتنوں کے متعلق بھی دریافت کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا اور چار باتوں سے منع فرمایا، ان کو ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا حکم دیا، اور فرمایا: کہ "ایک اللہ پر ایمان لانے کا مطلب جانتے ہو؟" انہوں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، پابندی سے نماز ادا کرنا، زکوٰۃ دینا، اور رمضان کے روزے رکھنا، اور مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ ادا کرنا اور چار برتنوں: حنتم، دبّا، نقیر، اور مزفت (ان کے معنی لغوی تحقیق میں دیکھ لیں) کے استعمال سے منع فرمایا" اور فرمایا: کہ "ان باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو اور جن کو پیچھے چھوڑ آئے ہو ان کو بھی اس سے مطلع کردو۔

تشریح: وفد: جمع ہے وافد کی۔ (جس طرح صَحْبٌ جمع ہے صَاحِبٌ کی)۔ (طیبی)

وافد ایسے شخص کو کہتے ہیں جو کسی قوم کی طرف سے کوئی پیغام لے کر جائے۔

عبد القیس: ایک قبیلہ تھا، یہ کسی شخص کا نام تھا اس کی اولاد زیادہ ہوگئی تو اسی طرف منسوب ہونے لگے۔ اسی قبیلہ نے اپنا وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔

وفد کا تعارف

اور اس وفد میں چودہ آدمی تھے جن کا رئیس اشج عصری تھا اور جس کا نام منذر بن عائذ تھا، اور بعض کے نزدیک سترہ آدمی تھے، اور اس وفد کی آمد ۸ھ میں عام الفتح میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ کے لئے کوچ کرنے سے قبل ہوئی تھی، اور اس وفد کے آنے کی وجہ یہ ہوئی کہ منقذ بن حیان جو بنوغنم کا ایک تاجر تھا، زمانۂ جاہلیت میں تجارت کے لئے مدینہ آیا

کرتا تھا ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے ملاقات ہوئی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی قوم کے اشراف میں سے ایک ایک کا نام لیکر حال دریافت کیا جس سے منقذ اسلام لے آئے اور سورۂ فاتحہ سورۂ اقرأ، وغیرہ پڑھ کر واپس چلے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان کی قوم کے لئے خط دیا، انہوں نے اس کو کچھ دن چھپایا اور نماز وغیرہ پڑھتے رہے، جس کا ان کی بیوی کو علم ہوگیا تو اس نے اپنے والد اشج منذر بن عائذ سے تذکرہ کیا، اشج نے جب ان سے بات چیت کی تو وہ بھی اسلام لے آئے اور اس خط کو لے جا کر اپنی قوم کے لوگوں کو سنایا تو ان کے دلوں میں بھی اسلام کی عظمت بیٹھ گئی، اور انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کا عزم کیا۔ نیز ان لوگوں کے مکہ کے قریب پہنچتے ہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو ان کے آنے کی اطلاع دیدی تھی۔ (نووی: ۱۶۲/۱، اُبی: ۱/۱۴۷)

یہ کتنے آدمی تھے، تو بعض روایت میں آتا ہے چودہ آدمی تھے اور بعض روایت میں ہے کہ چالیس تھے، اور وجہ تطبیق یوں ہے کہ یہ دو مرتبہ آئے تھے۔ ایک مرتبہ ۶ھ میں، اس وقت چودہ تھے، اور ایک مرتبہ ۸ھ میں آئے تھے، اس وقت چالیس تھے، یا یوں کہا جائے کہ چودہ آدمی سردار تھے اور بقیہ تابع تھے۔ (مرقاۃ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً یہ دریافت کیا، من القوم او من الوفد (او شک راوی کے لئے ہے اور ایسے مقام پر او کے بعد قال محذوف ہوتا ہے)

آنے والے کا تعارف

فائدہ: معلوم ہوا کہ جب کوئی آدمی یا قوم کسی کے پاس آوے تو اول اس کا تعارف معلوم کریں۔ اول تو آنے والوں کو چاہئے، کہ خود اپنا تعارف کرادیں، اور اگر آنے

والے تعارف نہ کرا سکیں تو میزبان کو چاہئے کہ آنے والوں سے دریافت کرے کہ آپ حضرات کون ہیں؟ اور کہاں سے آئے ہیں اور کیوں آئے ہیں؟

ربیعه یعنی نحن ربیعه، ربیعه سے قبیلہ مراد ہے اور اس عبارت میں کل بولکر بعض مراد ہے کیونکہ ربیعہ اصل تھا اور اس کی چند شاخیں تھی جن میں ایک عبدالقیس بھی تھی۔ (فتح الباری:۱/۱۷۹، رقم الحدیث:۵۳)

مرحباً: مصدر مفعول مطلق ہے، اس کا عامل محذوف ہے۔ ای رحبکم الله مرحباً، جس کا ترجمہ فارسی میں خوش آمدید سے ہوتا ہے۔ اور اردو میں "آیئے آیئے تشریف لائیے۔

رُحب فراخی اور وسعت کو کہتے ہیں۔ (اگر راء کے ضمہ کے ساتھ ہو اور اگر راء کے فتحہ کے ساتھ ہو تو کشادہ شی کے معنی ہوتے ہیں) (فتح الباری)

آپ نے فراخی کی دعا دی کہ آنیوالی قوم کو خوب فراخی ہو خوب وسعت ہو۔ ہمیشہ ہمیش۔ (حافظ ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے مرحبا سیف بن ذی الیزن نے کہا تھا) (فتح الباری)

مہمان کو خوش آمدید کہنا

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ آنیوالوں کو خوش آمدید کہنا چاہئے، اور اس کے آنے پر خوشی کا اظہار کرنا چاہئے، یہ آنے والے کا حق ہے اور پھر آنے والا بے تکلف اپنا مقصد بیان کرسکتا ہے، اور آج یہ حال ہے کہ جب دیکھا کہ کوئی مہمان آرہا ہے تو چہرے پر شکن پڑ جاتی ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اسی پر بس نہیں فرمایا، بلکہ اور بھی دعاؤں سے نوازا۔

غیر خزایا و لاندامی[1]: خزایا جمع ہے خزیان کی، خزی رسوا ہونا اور

[1] لفظ غیر منصوب ہے حال ہونے کی بنا پر وفد سے البتہ اگر ماقبل کی صفت مانیں تو مکسور پڑھنا بھی جائز ہے۔

ندامیٰ جمع ہے ندمان کی سکاری کے وزن پر یعنی تم نہ شرمندہ ہو اور نہ رسوا[1] یعنی گویا تم اپنے گھر آئے ہو اور اپنے اہل تعلق میں آئے ہو، اور اس حالت میں آئے ہو کہ تم کو نہ کسی قسم کی ذلت ورسوائی ہے اور نہ ندامت وشرمندگی۔ اس لئے کہ اپنے گھر اور اپنے دوستوں میں آنے والے کو نہ ذلت ہوا کرتی ہے، نہ ندامت وشرمندگی، اور یہ جملہ دعائیہ بھی ہوسکتا ہے، اس وقت اس کا ترجمہ یہ ہوگا، کہ اللہ تمہیں کامیاب کرے بامراد کرے۔

چونکہ اگر انسان کسی کے پاس آوے اور اس کا کام پورا نہ ہو تو وہ ایک طرح شرمندہ ہوتا ہے، اور اس کی رسوائی بھی ہوتی ہے تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ خدا تمہیں رسوا وشرمندہ نہ کرے بامراد یہاں سے لوٹو۔ تو معلوم ہوا کہ اپنے پاس آنے والوں سے اجمالی

---

[1] علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ ندمان تو محفل شراب کے ساتھی کو کہتے ہیں جس کی جمع ندامیٰ آتی ہے۔ (اور یہ معنی یہاں مناسب نہیں) لہٰذا یا دم بمعنی شرمندہ کی جمع ہے اور خلاف قیاس نادمین کے بجائے ندامیٰ لیکر آئے ہیں تاکہ "خزایا" کے ساتھ عبارت با ربط رہے۔

اور بعض اہل لغت کی رائے یہ ہے کہ نادم اور ندمان دونوں ایک معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں اس صورت میں یہ جمع اصل کے مطابق ہے خلاف قیاس نہیں۔

اور مطلب یہ ہے کہ یہ جماعت بخوشی ورغبت اسلام لائی، انہوں نے جنگ یا قید کی مشقت برداشت نہیں کی جس کی وجہ سے ان کو شرمندگی یا رسوائی اٹھانی پڑتی۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ خزایا کا تعلق تو دنیا سے ہے اور ندامیٰ کا تعلق آخرت سے ہے مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ذلت ورسوائی سے بھی بچ گئے، اور آخرت کی ندامت اور شرمندگی سے بھی بچ گئے، گویا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خیر عاجل وآجل کی خوشخبری دی، کیونکہ جب خزایا اور ندامیٰ کی نفی ہوئی تو اس کی ضد یعنی دنیاوی اور اخروی خیر کا اثبات ہوگیا۔ (فتح الباری: ۱/۱۷۹، رقم الحدیث: ۵۳)

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر کسی کی منہ پر تعریف کی جائے تو کوئی حرج نہیں جب کہ اس کے فتنہ میں مبتلا ہوجانے کا خدشہ نہ ہو۔ (ایضاً)

من کفار مضر: ربیعہ اور مضر دونوں نزار بن معد بن عدنان کی اولاد تھے ان کی ہی جانب نسبت کرتے ہوئے یہ قبائل کے نام پڑ گئے تھے، اہل ربیعہ بحرین میں رہتے تھے اور مدینہ اور بحرین کے درمیان قبیلۂ مضر آباد تھا۔ (سنوسی شرح مسلم: ۱/۱۴۷)

تعارف کے لئے سوال کرنا اور دعائیں دینا طریق سنت ہے۔

تو پھر ان آنے والوں نے اپنا مقصد ظاہر کر دیا کہ حضرت ہر مرتبہ ہم آپ کے پاس نہیں آسکتے ہیں، درمیان میں دشمن قبیلہ حائل ہے، جو آنے نہیں دیتا صرف ہم اشہر حرم میں آسکتے ہیں کیونکہ ان میں وہ مزاحمت نہیں کرتے، کیونکہ ان مہینوں کی حرمت کا کفار بھی لحاظ کرتے تھے۔

ان عدة الشهور عند الله اثنا عشر شهرا. الآية. اللہ تعالیٰ نے بتلایا کہ سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں، تو یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے[1]۔

اشکال وجواب

سوال: اللہ تعالیٰ کو یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی یہ بات تو بچہ بچہ جانتا ہے۔ کہ سال میں بارہ مہینے ہوتے ہیں۔

جواب: یہ ہے کہ اس میں ایک خاص بات بتانی مقصود ہے کہ لوگوں نے اس میں گڑبڑی مچا رکھی تھی سال میں کبھی آٹھ مہینے ہوگئے، کبھی زائد کبھی ردوبدل کر لی۔

اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ان عدة الشهور عند الله اثنا عشر شهراً"

جس طرح زمین کا حرم تبدیل نہیں ہوسکتا کہ عرب سے کچھ پتھر ہندوستان اٹھالائیں اور اعلان

[1] حرم اشہر چار ماہ کہلاتے ہیں، رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ، اور محرم، زمانۂ جاہلیت میں چونکہ بے راہ روی کا دور دورہ تھا ہر طرف قتل وغارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا اس لئے بیت اللہ کے زائرین کی حفاظت وسلامتی کے پیش نظر وہ ان چار ماہ میں قتل وغارت گری اور جنگ وجدل بند کر دیتے تھے۔ اور قبیلۂ مضر کے کفار بھی ان چار ماہ کا بہت احترام کرتے تھے، اور خاص کر رجب کا، اسی وجہ سے رجب مضر مشہور ہوگیا تھا۔ (مرقاۃ: ۱/۷۷، فتح الباری ایضا)

کسی شاعر نے ان چاروں ماہ کو آسانی کی غرض سے ایک شعر میں جمع کیا ہے۔ ؎

حرم اشہر چہار ست ومکرم
رجب ذیقعدہ ذی الحجہ محرم

کردیں کہ ہم نے کعبہ یہیں بنادیا ہے تو وہ بنے گا نہیں۔

ٹھیک اسی طرح زمانہ کے احترام کو بدل نہیں سکتے، جو مہینہ جہاں آتا ہے وہیں رہیگا۔ بدل نہیں سکتا محرم پہلے آجائے یا بعد میں ایسا نہیں ہوسکتا ہے، جیسے انسان کے اعضاء کو مثلاً منھ کی جگہ سرین اور سرین کی جگہ منھ کردیں جس طرح یہ ناممکن ہے اسی طرح زمانہ کے مہینوں کو نہیں بدل سکتے۔

تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم اشہر حرم میں تو آسکتے ہیں، چونکہ کفار اس مہینہ میں کچھ نہیں کہتے۔ دوسرے مہینوں میں نہیں آسکتے۔

مطلب یہ تھا ان کا کہ حضرت وقت کم ہے آپ کورس کم کردیجئے، اتنا وقت نہیں ہے، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا بہت اچھا، تو کورس کم کردینا بھی سنت ہے۔

اگر کوئی ایک دن کے لئے بھی آئے تو اس کو ناامید نہ کروا سے پڑھادو کوئی چھ مہینے کے لئے کہے تو اسی میں پڑھادو، یعنی جو شخص جتنے وقت کے لئے آئے اس میں اس کو جتنا پڑھایا جا سکتا ہے، اسے اس وقت میں اتنا ہی پڑھادینا چاہئے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تو صرف ایک دن کے لئے آئے اور پڑھ کر سندیں لے کر چلے گئے، اور صرف پانچ منٹ کے لئے آئے اور بامراد ہو کر گئے۔

طالب علم اور استاد کا ایک ادب

فائدہ: معلوم ہوا کہ طالب علم کے پاس جتنا وقت فارغ ہو مدرسہ والوں کو بتادے، اور عرض کردے کہ میں اتنا وقت دے سکتا ہوں، مدرسہ والوں کو چاہئے کہ اس کے وقت کے لحاظ سے ہی اس کے لئے دین سیکھنے کا انتظام کردیں، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

تو انہوں نے کہا کہ گودا گودا بتلا دیجئے۔

بامر فصل[1] کہتے ہیں کہ مبادی وغیرہ کچھ نہوں صرف اصلی مقصد بتلا دیجئے اور وہ بھی بہت واضح اور صاف۔

طالب علم اور استاد کا ایک دوسرا ادب

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ طلباء اساتذہ سے درخواست کرسکتے ہیں کہ حضرت ہم کو صاف اور واضح طریقہ پر آسان طریقہ پر سبق پڑھایا کریں، اور اساتذہ کو چاہئے کہ طلباء کی اس قسم کی درخواست پر برا نہ مانیں، بلکہ انکے ذہن کی رعایت کرتے ہوئے سبق پڑھائیں۔

نُخْبِرُ بِهٖ مَنْ وَرَاءَنَا، وَنَدْخُلُ بِهِ الْجَنَّةَ الخ: جس پر ہم عمل کریں اور جنت میں داخل ہوجائیں اور دوسروں کو بھی بتلادیں۔ یہ نہیں کہ مولوی بنیں گے اتنی تنخواہ ملے گی وغیرہ وغیرہ۔

تحصیل علم کا مقصد

فائدہ: اس سے معلوم ہوگیا کہ علم حاصل کرنے کا مقصد دو چیزیں ہونی چاہیں۔ (۱) اول اس پر عمل کرکے جنت میں داخل ہونا۔ (۲) دوم دوسروں کو بھی ان چیزوں کی تعلیم اور دعوت دینا۔

اشکال مع جواب

اشکال: اشکال یہ ہوتا ہے کہ خود عمل کرکے جنت میں داخل ہونا تو اول درجہ ہے، دوسروں

---

[1] بامر فصل: دونوں تنوین کے ساتھ موصوف صفت ہیں اور فصل فاصل کے معنی میں ہے یعنی ایسی بات جو اٹل اور فیصل کن ہو حق وباطل کے درمیان مفصول کے معنی میں ہے۔ (مرقاۃ: ۱/۷۷)
کیونکہ فصل مصدر ہے اور مصدر کبھی فاعل کے معنی میں ہوتا ہے کبھی مفعول کے معنی میں ہوتا ہے، دونوں صورتوں میں مطلب ایک ہی ہے کہ مجھ کو واضح اور صاف صاف باتوں کا حکم فرمادیجئے۔

کی تعلیم وتبلیغ دوسرا درجہ ہے اس لئے "وَنَدْخُلُ بِهِ الْجَنَّةَ الخ" کومقدم کرنا چاہئے تھا، اور نُخْبِرُ بِهِ مَنْ وَرَاءَ نَا الخ کو مؤخر، اس کا عکس کیوں کیا؟

جواب: اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ دعوت وتبلیغ کی اہمیت کے اظہار کے لئے ایسا کیا، اس لئے کہ دعوت وتبلیغ کو ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

جواب دوم: دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ حضرات قوم کے نمائندے تھے، اور نمائندہ کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ جو پیغام ملے وہ قوم کو پہونچادیں، اس لئے یہاں اس کو مقدم کیا اور ساتھ ساتھ اپنی طلب کا اظہار بھی کر دیا کہ ہم خود بھی عمل کریں گے، اور عمل کر کے جنت میں داخل ہونگے، ایسا نہیں کہ قوم کو پیغام پہونچانے پر ہی اکتفاء کریں گے۔

آج مولوی صاحبان کام کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں حالانکہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے کبھی عار نہیں سمجھی، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ گورنر ہیں اور اس خدمت کا کوئی پیسہ نہیں لیتے تھے لکڑیوں کا گٹھر لا رہے ہیں، اور راستہ میں بچے ہیں تو کہتے ہیں، بھائی اپنے گورنر کو راستہ دیدو، نہ پولس کا انتظام ہے نہ اور کچھ ہٹو بچو ہے۔

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً اجمال سے بیان کیا پھر تفصیل سے بیان فرمایا۔

طریقۂ تدریس

فائدہ: معلوم ہوا کہ تدریس کا طریقہ یہ ہے کہ اول اجمال سے مقصد ذکر کیا جائے، پھر اس کی تفصیل کی جائے، اس طرح مضمون اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

وسألوه عن الاشربة: اشربہ شراب بمعنی مشروب کی جمع ہے اور یہاں پر مضاف محذوف ہے یعنی "عن حکم ظروف الاشربة" یا اشربہ موصوف ہے اور اس کی صفت محذوف ہے اور مطلب یہ ہے "الاشربة التی تکون فی الاوانی المختلفة" (مرقاۃ:۱/۷۸)

اور راجح یہ ہے کہ چونکہ وفد عبدالقیس کو حرمت خمر پہلے سے معلوم تھی اس لئے یہاں پر ظروف اشربہ ہی مراد ہیں اور انہیں کے متعلق وہ دریافت کرنا چاہتے تھے۔ (تحفۃ المرأۃ مع زیادۃ:۱۲۵)

قولہ فامرھم باربع الخ: یہاں اجمال قبل التفصیل کے طور پر بیان کیا تا کہ تفصیل کا شوق پیدا ہو اور یاد کرنے میں سہولت ہو۔

امرھم بالایمان باللہ وحدہ الخ: آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو صرف ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا حکم فرمایا: اور پھر ارشاد فرمایا:

اتدرون ما الایمان باللہ وحدہ: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سوال اس لئے تھا تا کہ ان کے ذہن جواب کے لئے فارغ ہو جائیں اور بات ان کے دل میں بیٹھ جائے۔ (مرقاۃ:۱/۷۸)

استاد کی ذمہ داری

فائدہ: اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ استاذ کو چاہئے کہ سبق کے دوران طلبہ سے بھی کسی چیز کا سوال کر لیا کرے، تا کہ طلباء کے ذہن بالکل فارغ اور حاضر رہیں، ورنہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ طلباء کے جسم تو درسگاہ میں ہیں، اور ذہن کہیں اور گھوم رہا ہے، اسے معلوم ہی نہیں کہ استاذ نے کیا بتایا اور کیا پڑھایا۔

قالو اللہ ورسولہ اعلم الخ: یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مبارک عادت تھی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی چیز کے بارے میں دریافت فرماتے وہ یہی جواب دیا کرتے تھے کہ اللہ ورسولہ اعلم کہ حضرت ہم کچھ نہیں جانتے، ہم تو بالکل خالی الذہن ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی زیادہ جاننے والے ہیں۔

طالب علم کا ایک ادب

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ طلباء کو درس میں استاذ کے سامنے خالی الذہن ہو کر ہی جانا چاہئے تا کہ استاذ کا بتانے کو اچھی طرح جی چاہے، اور اگر استاذ کو معلوم ہوتا ہے کہ طالب علم کا ذہن پہلے سے دوسرے تفکرات اور خیالات سے بھرا ہوا ہے تو پھر استاذ کے دل میں وہ انشراح پیدا نہیں ہوتا، بلکہ طبیعت بجھ جاتی ہے۔

قال شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله: ان لوگوں نے جب ایمان کے معنی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایمان کے معنی بیان فرمائے کہ ایمان اس کو کہتے ہیں کہ اس چیز کی گواہی دی جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سواء کوئی عبادت کے لائق نہیں اور حضرت محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

مطلب شہادت

شهادة: مرفوع ہے مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بناپر، اور شہادت کہتے ہیں ایسی خبر دینے اور اقرار کرنے کو جس کا ایسا یقین ہو جیسا کہ محسوسات اور مشاہدہ کی باتوں کا یقین ہوتا ہے۔

ایسا یقین ہونا کم از کم ضروری ہے جب اس درجہ کا یقین ہوگا تو نافرمانی اور معاصی سے نفرت ہوگی اور طاعات میں مزہ آئیگا، اور آج جو نافرمانیاں ہورہی ہیں وہ اسی وجہ سے ہورہی ہیں کہ مشاہدہ کے درجہ کا یقین نہیں رہا۔

اگر مشاہدہ کے درجہ کا یقین ہوتا تو کبھی بھی جرأت نہ ہوتی کہ ایسا گناہ کریں، یہ

نافرمانیاں خود دلالت کرتی ہیں اس بات پر کہ آج یقین نہیں ہے صرف سنی سنائی باتیں ہیں۔

اور حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اللہ تعالیٰ کے رسول ہونے کی شہادت دے اور رسول اللہ ہونے کا یقین کرے، جب آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو رسول اللہ سمجھیں گے اور اس کا دل سے یقین کریں گے، تو بتایئے پھر ان کے طریق اور سنت کے خلاف کوئی کام ہوگا؟ ہرگز نہیں۔

ایسا نہیں جیسا کہ آج بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ داڑھی رکھتے تھے، دستور کے موافق کہ اس وقت عرب میں داڑھی رکھنے کا دستور تھا، اور آج اس کا یہاں بھی دستور نہیں اور وہاں بھی دستور نہیں لہٰذا داڑھی رکھنی ضروری نہیں، دیکھئے اگر اللہ تعالیٰ کے رسول ہونے کا یقین ہوتا تو کیا یہ کہا جاتا اور ایسا کیا جاتا ہرگز نہیں۔

(۲) واقام الصلوة [اور نماز قائم کرنا۔]

(۳) وایتاء الذکوة [اور زکوۃ ادا کرنا۔]

(۴) وصیام رمضان [اور رمضان کے روزے رکھنا۔]

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مختصر طور پر کتاب الصلوۃ، کتاب الزکوۃ، کتاب الصوم پڑھادی اور فرمادیا کہ تفصیل پھر وقتاً فوقتاً معلوم کرتے رہنا ورنہ تو اس پر عمل کرتے رہنا یہ بھی کافی ہے۔

اور چونکہ اس وقت جہاد ہوتا تھا اور جہاد میں مال غنیمت بھی حاصل ہوتا ہے، اس لئے ساتھ ہی اس کا حکم بھی بتادیا، کہ مال غنیمت میں خمس دینا بھی ضروری ہے۔

جہاد کا مال اطیب المال ہے تمام مالوں میں بہتر ہوتا ہے۔ اور اس کے ہر ہر لقمے سے توحید نکلتی ہے مال غنیمت کے بعد تجارت ہے پھر حرفت، پھر ملازمت ہے۔

(۵) قوله وَأَنْ تُعْطُوا مِنَ الْمَغْنَمِ الْخُمُسَ الخ: اور مال

غنیمت میں سے خمس ادا کیا کرو۔

مال غنیمت اطیب المال ہے مگر خمس نکال کرورنہ نا جائز ہے جیسے کہ بکرا حلال ہے مگر دم مسفوح نکال کر اگر ذبح ہوتے ہوئے خون نکلتے وقت منہ لگا کر کے پینا شروع کر دے۔ تو اس کو بے وقوف کہا جائے گا۔

مال جائز ہے مگر زکاۃ نکال کر، اگر نہ نکالے تو وہی نا جائز ہو جائیگا۔ ایسے ہی مال غنیمت اچھا مال ہے مگر خمس نکال کر۔

اشکال: یہاں اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ اجمال میں تو چار چیزیں تھیں اور تفصیل میں پانچ ہو گئیں تو اجمال و تفصیل میں مطابقت نہ رہی۔

جواب: اس کا یہ ہے کہ چار ہی چیزیں اجمال میں ہیں اور چار ہی تفصیل میں اور یہ پانچویں چیز علیحدہ حکم ہے۔

اسی وجہ سے یہاں عنوان بدل گیا ہے ان چاروں کا عنوان کچھ اور تھا اور اس کا عنوان کچھ اور ہے۔ یہی رائے ہے علامہ ابن بطالؒ کی اور ان کی اتباع میں قاضی عیاضؒ کی کہ خمس غنیمت کا تذکرہ علی اسلوب الحکیم ان کی ضرورت کے لئے مزید ہے کیونکہ ان کو کفار سے جنگ کرنا پڑتی تھی، یا یہ کہ **ان تعطوا** کا عطف ہے **"باربع"** پر اور مطلب یہ ہے کہ ان چار چیزوں کا حکم دیا اور اداء خمس کا حکم دیا۔ (فتح الباری)

اس کے علاوہ اور بھی جوابات دیے گئے ہیں۔

(۱)...... چونکہ یہ لوگ مسلمان تھے اسلئے شہادتین شمار میں داخل نہیں ہے، صرف تاکید کیلئے یا تبرک کے لئے بیان کیا۔

(۲)...... چونکہ یہ لوگ کفار مضر کے جوار میں رہتے تھے، ان سے قتل وقتال کی نوبت آ سکتی ہے اور غنیمت بھی مل سکتی ہے، بناء بریں اصل چار چیزوں کو بیان کرنیکے بعد انکی ضرورت کی

بناء پر زائد اور ایک امر بیان فرمادیا۔

(۳)......**وان تعطوا من الغنم** زکوۃ کی جنس میں ہونے کی بناپر اسی میں شامل کرلیا۔

(۴)......یا صلوۃ وزکوۃ کو ایک شمار کریں، چونکہ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر دونوں کو ایک جگہ ذکر کیا گیا ہے۔

(۵)......قاضی بیضاوی نے فرمایا کہ آپ نے چار چیزوں کو بیان کیا۔ راوی نے یہاں انکو بیان نہیں کیا۔ یہاں جن چیزوں کا بیان ہے وہ سب ایمان کی تفصیل ہے۔

اشکال مع جواب

البتہ اس روایت میں حج کا تذکرہ نہیں، علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے لئے حج کرنے کی کوئی سبیل درمیان میں کفار مضر کے حائل ہونے کی وجہ سے نہیں تھی۔ یا اس وجہ سے کہ حج کا وجوب علی الفور نہیں بلکہ علی التراخی ہے۔ (المفہم: ۱/۱۷۵)

اور قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ وفد عبد قیس کی آمد سن آٹھ ہجری میں ہے اور فرضیت حج مشہور قول کے مطابق ۹ھ میں ہے لہذا جب اس وقت تک حج فرض ہی نہیں ہوا تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا تذکرہ بھی نہیں فرمایا۔ (مرقاۃ: ۱/۷۸)

قولہ ونهاهم عن اربع الخ: اور انکو چار چیزوں سے منع فرمایا۔

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس وفد کو چار چیزوں کا حکم کیا اور چار چیزوں سے منع کردیا۔ جن کا حکم کیا وہ ذکر ہو چکیں اور جن سے منع کیا وہ یہ ہے۔

الحنتم: یہ ٹھلیا یعنی چھوٹی گھڑیا ہوتی ہے۔ (بفتح المهملة وسكون النون وفتح المثناة من فوق)

رنگ دار گھڑا یا روغنی مرتبان خواہ کسی بھی رنگ کا ہو بعض نے سبز رنگ کی تخصیص کی

ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ ہر رنگ کے روغنی گھڑے کو یا مرتبان حنتم کہتے ہیں، لیکن اس زمانہ میں عموماً شراب کے لئے سبز رنگ کیا کرتے تھے، اس لئے بعض نے اس کی تخصیص کردی۔

الـدبـاء: یہ کدو ہوتا ہے جس کا گودا نکال کر اس کے خول کا لوگ کشکول بنا لیتے ہیں، لوگ ان میں یعنی دباو کدو میں شراب رکھتے تھے۔ (بالدال المھملۃ وتشدید الموحدۃ والمد)

الـنـقیر: یہ درخت کی جڑ کی لکڑی ہوتی ہے جو بہت مضبوط ہوتی ہے یہ لوگ اس کو کھوکھلا کر کے اس میں شراب رکھتے تھے۔ (بفتح النون وکسر القاف)

المزفت: ہر وہ برتن جو رنگا ہوا ہو چاہے وہ نقیر ہو یا ٹھلیا وغیرہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان چیزوں سے منع فرمادیا۔ (بالزای والفاء)

وجہ ممانعت: (۱) اول اس وجہ سے کہ ان میں چیزیں جلدی خراب ہو جاتی ہیں۔

(۲)......اور ثانیاً اس وجہ سے کہ اس سے ایہام ہوتا تھا شراب کا، اس لئے کہ ان میں شراب بنائی جاتی تھی۔ اور اپنے آپ کو ناجائز چیز کے ایہام سے بھی بچانا ضروری ہے۔

اس ایہام کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان برتنوں سے منع فرمادیا وہ ان برتنوں کو استعمال کرتے تھے، اور چونکہ خمر حرام ہو چکی تھی تو خمر سے بالکل اجتناب کے لئے ان برتنوں سے بھی انقطاع ہو جائے، تا کہ خمر سے مکمل طور پر اجتناب ہو جائے۔

(۳)......نیز یہاں مطلقاً ان برتنوں کے استعمال کی ممانعت مقصود نہیں ہے بلکہ محل بول کر حال مراد لیا ہے۔ (بالفاظ دیگر ظرف بول کر مظروف مراد ہے) یعنی اصل ممانعت ان ظروف میں نبیذ بنانے کی تھی جیسا کہ نسائی کی روایت میں صراحۃ "مـاینتبذ فی الحنتم" واقع ہوا ہے اور خاص طور سے ان چیزوں کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں اسکار جلدی پیدا ہو جاتا تھا، اور ممکن تھا کہ ایسا شخص اس کو

پی لیتا جس کو اس میں سکر کا احساس نہ ہوتا۔ (فتح الباری: ۱۸۳،۵۳/۱)

(۴)...... شاربین خمر کے ساتھ تشبہ سے روکنا مقصود تھا۔

(۵)...... شراب سے نفرت ذہنوں میں بیٹھانے کے لئے ان برتنوں سے بھی ممانعت فرمادی جن میں شراب بنائی جاتی تھی۔

(۶)...... ان برتنوں میں شراب بنائی اور رکھی جاتی تھی، شراب کے آثار کچھ نہ کچھ ان میں سرایت کر گئے ہوں گے اس لئے احتیاطاً ممانعت فرمائی۔

(۷)...... ان برتنوں کو دیکھ کر پرانا تلذذ کا دور یاد آ کر شراب پینے کی تحریک دل میں پیدا نہ ہو جائے، اس لئے ممانعت فرمادی۔

(۸)...... سداً للذرائع وسداً لباب الفتنة کے طور پر ممانعت فرمائی کہ کہیں بہانہ ساز لوگ ان برتنوں میں شراب نہ رکھنے لگیں اس لئے ممانعت فرمادی۔

حکم ممانعت

البتہ اس میں اختلاف ہے کہ ممانعت کا حکم اب بھی باقی ہے یا نہیں؟

امام مالکؒ امام احمدؒ کے نزدیک حکم ممانعت اب بھی باقی ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جو ممانعت کی حدیث کے راوی ہیں ان سے مسئلہ دریافت کیا گیا تھا کہ ان برتنوں کا کیا حکم ہے، تو انہوں نے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا تھا، یہ دلیل ہے کہ یہ حکم منسوخ نہیں۔

حنفیہ اور جمہور علماء کے نزدیک یہ ممانعت منسوخ ہے اور اب ان برتنوں کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں، اور دلیل مسلم شریف کی حدیث ہے: ونهيتكم عن النبيذ الا في اسقاء فاشربوا في الاسقية كلها ولاتشربوا سكرا. (مشكوة

المصابیح: ۱۵۴، باب زیارۃ القبور)

قولہ احفظوھن الخ: آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بعد میں فرمایا کہ انہیں یاد کر لینا اس سے معلوم ہوا کہ سبق پڑھا کر طلبہ سے کہہ دینا چاہئے کہ اسے یاد کرلو۔

قولہ واخبروھن من وراءکم الخ: اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اخبروا الخ بھی فرمایا کہ ان لوگوں کو بھی ان چیزوں کی خبر دیدو جو تم سے پیچھے رہ گئے اور وہ آ نہ سکے۔

اس سے معلوم ہوا کہ طلبہ کو یہ بھی کہہ دینا چاہئے کہ جو کچھ پڑھا ہے اس کو دوسروں کو پڑھادو، مشکوٰۃ شریف دوسروں کو بھی پڑھادو یعنی اس طرح پڑھو کہ دوسروں کو پڑھا بھی سکو۔

ولفظہ للبخاری.

ولفظہ للبخاری: مطلب یہ ہے کہ بخاریؒ نے اس روایت کو بلفظہ ذکر کیا ہے اور امام مسلمؒ نے اس روایت کے معنی کو ذکر کیا ہے اس اعتبار سے یہ روایت متفق علیہ ہوگئی ہے۔(مرقاۃ: ۱/۷۹)

استاد کی ایک ذمہ داری

فائدہ: چونکہ وہ لوگ قوم کے نمائندے تھے، اس لئے خاص طور پر تاکید فرمائی کہ ان چیزوں کو اچھی طرح یاد بھی کرلو اور قوم کو بھی پہونچادو اور طلباء بھی قوم کے نمائندے ہوتے ہیں، اس لئے اساتذہ کو چاہئے کہ طلباء کو وقتاً فوقتاً یاد دہانی کرتے رہیں اور فارغ ہونے پر خاص طور پر تاکید کردیں کہ اپنی قوم کی خبر گیری کرنی ہے اور اپنے یہاں جا کر تعلیم اور دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینا ہے ایسا نہیں کہ صرف روزی کمانے کے چکر میں ہی لگ جائیں، جیسا کہ عامۃً ذہن بنتا جارہا ہے۔

﴿حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا بیعت فرمانا﴾

﴿۱۷﴾ وَعَنْ عُبَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَوْلَهُ عِصَابَةٌ مِنْ اَصْحَابِهٖ بَايِعُونِي عَلٰى اَنْ لَا تُشْرِكُوا بِاللّٰهِ شَيْئًا، وَلَا تَسْرِقُوا وَلَا تَزْنُوا، وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ وَلَا تَأْتُوا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُونَهٗ بَيْنَ اَيْدِيكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوا فِي مَعْرُوفٍ فَمَنْ وَفٰى مِنْكُمْ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ بِهٖ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهٗ، وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ فَهُوَ اِلَى اللّٰهِ اِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَاِنْ شَاءَ عَاقَبَهٗ فَبَايَعْنَاهُ عَلٰى ذٰلِكَ۔ (متفق علیه)

حوالہ: بخاری شریف: ص ۱/۷، باب بایعونی علی ان لاتشرکوا الخ، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۱۸، مسلم شریف: ص ۲/۷۳، حدیث نمبر: ۱۷۰۹، باب الحدود کفارات لاهلها، کتاب الحدود.

حل لغات: عصابة، جماعت، گروہ، ج عصائب، بایعونی، بایع فلانا علی کذا، کسی سے کسی بات کا معاہدہ کرنا، بیعت کرنا، لاتسرقوا، نہی حاضر، سرق مالا (ض) سرقا وسرقة خفیہ طریقہ پر کسی کا مال چرالینا، لاتزنوا، نہی حاضر، زنی، (ض) زنی وزناء، زنا کرنا، عورت کے ساتھ بلاعقد شرعی جنسی خواہش پوری کرنا، تفترونه، جمع مذکر حاضر مضارع، القول، بات گھڑنا، مجرد میں فری (س) فری، ششدر رہ جانا، ستره، فعل ماضی، سترا (ن) چھپانا، ڈھانکنا۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی ایک جماعت کے درمیان ارشاد فرمایا: کہ تم مجھ سے ان باتوں پر بیعت کرو کہ (۱) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے۔ (۲) چوری نہیں کرو گے۔ (۳) اور نہ ہی زنا کرو گے۔ (۴) اور نہ اپنی اولاد کو قتل کرو گے۔ (۵) اور نہ تم اپنے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان گھڑ کر بہتان تراشی کرو گے۔ (۷) اور نیک کاموں میں نافرمانی نہیں کرو گے۔ تو جو شخص تم میں سے اپنا عہد پورا کریگا تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے، اور جو کوئی ان چیزوں میں کسی چیز کا ارتکاب کرے، اور پھر اس دنیا میں اس کو سزا بھی مل جائے، تو یہ اس کے لئے کفارہ ہو گیا، اور اگر کسی نے ان میں سے کسی چیز کا ارتکاب کیا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی فرمائی، تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے خواہ معاف فرمادے، خواہ سزا دے، حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان باتوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرلی۔

تشریح: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ[1] وَحَوْلَهُ عِصَابَةٌ مِنْ أَصْحَابِهِ الخ: اس حال میں (وحولہ میں واو حالیہ ہے) کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی ایک جماعت تھی، حول سے مراد پاس ہے، ویسے تو اس کے معنی ارد گرد کے آتے ہیں۔

---

[1] عبادۃ بن الصامت بن قیس بن اصرم الخزرجی، الانصاری، آپ کی کنیت ابو الولید ہے، ہجرت سے قبل ہی اسلام لا چکے تھے، اور بیعت عقبہ اولی اور ثانیہ میں شریک تھے، نیز بدر اور دیگر تمام غزوات میں بھی شریک رہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ابو مرثد غنوی کے ساتھ مواخات فرمائی تھی، خوبصورت، دراز قد اور فربہ جسم والے تھے۔ مدائنی، خلیفہ بن خیاط اور دیگر علماء نے سن وفات ۳۴ھ ذکر کیا ہے، لیکن ابن عساکر نے ان کے ترجمہ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ان کے بعض ایسے واقعات کا تذکرہ کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے بعد تک زندہ رہے اس کے قائل ہیثم بن عدی ہیں اور بعض علماء کے نزدیک آپ کی وفات ۴۵ھ میں ہے۔ (الاصابہ: ۲/۲۶۸، مرقاۃ: ۱/۷۹)

عِصَابَۃ[1]: عصبۃ مضبوط شیٔ کو کہا جاتا ہے۔

عصبہ لوگوں کے خاندان والوں کو بھی کہتے ہیں، اس وجہ سے کہ وہ بھی قوت دیتے ہیں، اعصاب پٹھوں کو کہتے ہیں اس لئے کہ انہیں سے انسان بیٹھتا اٹھتا ہے، اگر یہ کمزور ہو جائیں تو پھر وہ پیچھی ہو جائے۔

عصبہ پٹی کو کہتے ہیں جس کو زخم پر باندھتے ہیں، چونکہ اس سے بھی قوت حاصل ہوتی ہے یہاں پر جماعت مراد ہے۔

بیعت کا ثبوت

بایعونی : ایک طریقۂ مخصوص کا نام بیعت ہے، جو مشائخ میں رائج ہے، ''بیع'' کے معنی بیچ دینا یعنی بیعت میں بھی اپنے نفس کو کسی مردِ کامل کے ہاتھ پر بیچ دینا ہی ہوتا ہے کہ کوئی کام ہم آپ کی اجازت کے بغیر نہ کریں گے۔ اس لئے اس کو بیعت کہتے ہیں۔

ویسے تو یہ معاہدہ پہلے ہی ہو چکا ہے ارشاد خداوندی ہے: "ان اللہ اشترٰی من المؤمنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ" کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کے نفوس کو خرید لیا ہے، جنت کے بدلہ میں اسی کا نام بیعت ہے، مراد یہاں بیعت سے یہ ہے کہ جو معاہدہ اور بیعت ہم سے کی گئی تھی روز ازل میں۔ اور ایمان لا کر جس کا ہم نے عہد کیا ہے۔

یہاں آپ نے اس کی تجدید فرمائی۔ اور موٹی موٹی چند چیزیں آپ نے ذکر فرمادیں، کہ ان سے پابندی کے ساتھ بچتے رہنا۔

اس حدیث شریف سے مشائخ کے یہاں جو بیعت رائج ہے اس کا ثبوت نکل آیا، اور

---

[1] عصابہ کے معنی جماعت کے آتے ہیں، اور یہ ایسی جماعت پر بولا جاتا ہے جس میں دس سے چالیس تک فرد ہوں۔ (فتح الباری: ۱/۱۸،۹۲)

معلوم ہو گیا کہ یہ سنت ہے، نیز یہ بھی کہ شیخ خود بھی کسی کو بیعت کی ترغیب دے سکتا ہے، کہ تم مجھ سے بیعت ہو جاؤ، چونکہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، "**بایعونی**" مجھ سے بیعت کرو۔

منکرین بیعت کی تردید

منکرین بیعت کی تردید بھی اس حدیث شریف سے ہوگئی، منکرین بیعت کہتے ہیں کہ یہ بیعت جو آج مشائخ میں رائج ہے ثابت نہیں، حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بیعت ثابت ہے وہ یا تو بیعت علی الاسلام ہے کہ کوئی اسلام قبول کرتا اس کو بیعت فرماتے تھے یا بیعت علی الجہاد، کہ جہاد کے لئے بیعت فرمایا کرتے تھے، بیعت علی الاعمال ثابت نہیں، مگر حدیث مذکور سے معلوم ہو گیا کہ یہ بیعت علی الاعمال ہی تھی یہ بیعت نہ بیعت علی الجہاد تھی نہ بیعت علی الاسلام، بلکہ بیعت علی الاعمال ہی تھی جس کو بیعت طریقت بھی کہتے ہیں، چونکہ وہ حضرات مسلمان پہلے سے تھے کہ یہ سب حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے پس منکرین کی غلطی بخوبی واضح ہوگئی۔

اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جب حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کے محتاج تھے تو ہم اس سے کیسے مستغنی ہو سکتے ہیں۔

بیعت کی صورت اور حقیقت

بیعت کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت۔ صورت تو شیخ کامل کے ہاتھ میں ہاتھ دیدے۔ اور اس کی حقیقت التزام طاعت اور اعمال ظاہرہ و باطنہ کی پابندی کا معاہدہ کرنا ہے، صورت بھی حدیث سے ثابت ہے، اس لئے یقیناً باعث برکت ہے، لیکن زیادہ تر توجہ معنی اور

حقیقت اور مقصود کی طرف ہونی چاہئے اور وہ مقصود معلوم ہو چکا کہ شیخ کامل کی اتباع کر کے اپنے ظاہر اور باطن کی تعمیر و اصلاح ہے، اس لئے صورت کے ساتھ اصل مقصد اور حقیقت کو اہمیت دینی چاہئے۔

قولہ لاتشرکوا باللہ شیأ الخ:

شئ اول: شرک[1]

شرک اور اس کے اقسام

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا اگرچہ حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے شرک کا شائبہ بھی نہ ہو سکتا تھا، مگر دوسروں کی تعلیم کے لئے آپ نے اس کا ذکر فرما دیا، یا اس وجہ سے ذکر کیا کہ شرک کی دو قسمیں ہیں۔

(۱)......شعوری (۲)......غیر شعوری

شرک شعوری: یہ ہے کہ آدمی سب کچھ جانتا ہے مگر پھر بھی شرک کرتا ہے، یہ قسم شرک کی حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی شانِ ایمانی سے بہت بعید ہے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

شرک غیر شعوری: لاپروائی اور غیر شعوری طور پر کلمات کفر و شرک زبان سے نکل جائیں تو یہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے ممکن تھا کیونکہ مشرکانہ ماحول میں رہ رہے تھے اور اسی سے نکل کر آئے تھے، چاروں طرف ہر شعبۂ زندگی پر شرک و کفر کا تسلط تھا۔

---

[1] قرآن پاک میں ہے "ان اللہ لایغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذلک لمن یشاء" اور قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ شرک اعظم انواع ضلالت ہے اور درستگی اور استقامت سے سب سے زیادہ بعید ہے۔ (بیضاوی:۲/۳۵۳، تفسیر سورۃ النساء)

اس لئے آنجناب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شرک نہ کرنا یعنی غیر شعوری طور پر بھی شرک کا صدور نہ ہو۔

شرک خفی

ریا: بعض لوگ آج بھی لوگوں کو دیکھ کر ایسی نمازیں پڑھتے ہیں کہ شاید اتنے اطمینان وسکون سے حسن بصریؒ بھی نہ پڑھ سکتے ہوں، کانہ ھو.

اور گھر جا کر پڑھتے ہیں تو شروع کرتے ہی ختم کر دیتے ہیں تو یہ ریا ہے اور ریا بھی ایک شعبہ ہے شرک کا جس کو شرک خفی کہتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمادیا، جلی اور خفی شرک کی ہر قسم سے روکدیا۔

مقررین کے لئے تنبیہ

مقررین حضرات اگر مجمع زیادہ دیکھتے ہیں تو خوب لمبی چوڑی اور جوشیلی تقریر کرتے ہیں کہ سب پر دھاک بیٹھ جائے اور چاہتے ہیں کہ لوگ مصافحہ کریں ہاتھ چومیں، اور جب کم لوگ ہوں تو ویسے ہی ٹرخا دیتے ہیں، اگر وہ اندرونی کیفیت سے معذور ہیں تب تو مجبور ہیں ورنہ تو یہ بھی شرک خفی ہے۔ اس سے بھی منع فرمادیا کہ یہ بھی نہ ہونا چاہئے۔

اسی طرح شرک کی دیگر اقسام شرک فی الذات شرک فی الصفات، شرک فی العبادت وغیرہ سب اس میں داخل ہیں، شرک کی کسی قسم کی بھی اجازت نہیں، شرک کی تفصیل کے لئے حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تقویۃ الایمان کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

قولہ ولا تسرقوا الخ:

شئ ثانی: چوری[1]۔

چوری کی اقسام

فرمایا کہ تم چوری نہ کرنا۔ چوری مال روپیہ پیسہ اور دیگر سامان کی بھی ہوتی ہے، اسی طرح دوسری چیزوں کی بھی چوری ہوتی ہے۔

نماز میں ادھر ادھر دیکھنا بھی چوری ہے نماز کے سنن و آداب کو چھوڑ دینا بھی چوری ہے، مفتی لوگ فتوی کی چوری کرتے ہیں کسی بڑے مفتی صاحب کے فتوی کو اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں تو یہ بھی چوری ہے۔

اسی طرح کسی کے مضمون کو اپنی طرف منسوب کرنا بھی چوری ہے۔

لوگوں کو شعر سناتے ہیں تو غالب کے جگر کے اور فلاں فلاں کے مگر منسوب کر دیتے ہیں اپنی طرف، دوسرے شاعروں کے اشعار اپنی طرف منسوب کرنا بھی چوری ہے، مزدور وملازم آدمی کا کام پورا نہ کرنا یہ بھی چوری ہے۔

قولہ ولا تزنوا الخ:

شئ ثالث: زنا۔

زنا کے اقسام

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زنا بھی نہ کرنا۔ زنا جس طرح حقیقی زنا ہے، اسی طرح اور بھی زنا کی اقسام ہیں، جن کو حدیث شریف میں بیان کیا گیا ہے، ہاتھ کا زنا چھونا ہے، پیروں کا زنا غیر محرم کی طرف چلنا ہے، آنکھوں کا زنا غیر محرم کو دیکھنا اور زبان کا زنا غیر محرم

---

[1] قرآن پاک میں ہے: "السارق والسارقة فاقطعوا ايديهما جزاء بما كسبا نكالا من الله" اور چوری کہا جاتا ہے کہ غیر کے مال محفوظ کو خفیہ طریقہ پر لے لینا۔ بیضاوی ج ص ۳۸، سورہ مائدہ)

سے میٹھی میٹھی باتیں کرنا ہے، ان چیزوں میں ابتلاء عام ہو رہا ہے، اچھے دین دار اور پڑھے لکھے حضرات بھی انمیں مبتلا ہیں۔

ابتلائے عام

بالخصوص بدنظری اور بے پردگی میں بہت ابتلا ہے، چچا زاد خالہ زاد، پھوپی زاد بہن اور سالی بھابھی وغیرہ سے بے پردگی تو بالکل عام ہے، اور اس کو گناہ بھی نہیں سمجھا جاتا جو اور زیادہ خطرناک ہے، اور اس کے نتائج بد بھی آئے دن سامنے آرہے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے کہا ہے۔ ؎

آج کل پردہ دری کا یہ نتیجہ نکلا
جسکو سمجھے تھے کہ بیٹا ہے بھتیجہ نکلا

قولہ ولاتقتلوا اولادکم الخ: اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا۔

شئی رابع: اولاد کا قتل۔

قتل اولاد

جیسا کہ عرب میں دستور تھا کہ فقر و فاقہ کے ڈر سے اپنی اولاد کو زندہ درگور کردیا کرتے تھے، جیسا کہ آج بھی کہتے ہیں، کہ نسبندی کراؤ، اگر مخلوق زیادہ ہوگئی تو روٹیاں کہاں سے کھائیں گے۔

خاص طور پر قتل بالأ والاد کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں قتل کے ساتھ ساتھ قطع رحمی بھی ہے، لہٰذا یہی زیادہ مؤکد ہے، اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ قتل اولاد ان میں شائع تھا، جہاں وہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرتے تھے، عار اور عیب سمجھ کر، اسی طرح لڑکوں کو بھی فقر کے خیال سے قتل کردیتے تھے، جس کو قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ "**ولا تقتلوا اولادکم**

خشیة املاق" (فتح الباری مع زیادۃ:۹۲،۱۸/۱)

فرمایا ارے تم اب کہاں سے کھارہے ہو؟ اپنے باپ کے گھر سے۔

کون کسی کو کھلا سکتا ہے؟

حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ: جنات وشیاطین بھی آپ کے تابع تھے، آپ اتنے بڑے بادشاہ ہیں کہ آپ سہارا لگائے کھڑے ہیں اور بڑے بڑے جن آپ کے سامنے بھاری بھاری چٹانیں بغیر مشین کے خود اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں۔

آپ نے کہا کہ اللہ میاں سے میں بھی ایک وقت کی ان کی دعوت کردوں، ان کے اصرار پر انکو ایک وقت دعوت کرنے کی اجازت مل گئی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں کو حکم دیا کہ کھانا تیار کریں، اور ہواؤں کو حکم دیدیا کہ خوب تیز چلیں تاکہ کھانا خراب نہونے پائے، چھ مہینے تک کھانے تیار ہوتے رہے۔مگر ایک مچھلی نکلی جس نے ایک ہی مرتبہ میں وہ سارا کھانا ختم کردیا، اور کہا کہ اتنا تو روزانہ تین لقمے ناشتے میں کھاتی ہوں، آج تو بھوکی رہ گئی ایک ہی لقمہ ملا ہے۔

تو دیکھئے کوئی انسان اپنے اوپر دعوت کی ذمہ داری لے سکتا ہے؟

حالانکہ چاول اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے، جانور اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے، نمک اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا، پانی اس کا بنایا ہوا اور سب چیزیں اس کی بنائی ہوئی، آج تک تو کوئی ایسی مشین تیار ہوئی نہیں جس سے چاول بننے لگیں، تو ذرا سی ذمہ داری میں کتنی خرابیاں اور الجھنیں پیدا ہوگئیں۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اور اس کی مخلوق کے درمیان ایک انسان حائل ہوگیا ہے، تو کیا کوئی انسان کسی کی روزی کی ذمہ داری لے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، پس روزی دینے والی ذات تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، والدین روزی کیا دیتے خود ان کو بھی اللہ تعالیٰ روزی دیتے ہیں، اس

لئے روزی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرنا بہت بڑی حماقت ہے، اس خیال سے نسبندی کروانا بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

اسقاط حمل

اور آج ایک سلسلہ اور چلا ہے، زمانہ حمل میں مشین کے ذریعہ معلوم ہوا کہ پیٹ میں لڑکی ہے تو حمل کو ضائع کرا دیا جاتا ہے، وہ بھی اسی حکم میں شامل ہے۔

قولہ ولاتاتوا ببهتان الخ:

شئ خامس: بہتان۔

بہتان کی تعریف

بهتان: اس جھوٹ کو کہتے ہیں جس کا سننے والا مبہوت رہ جائے، "أیدی وأرجل" کو خاص طور پر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ معظم افعال کا وقوع ان سے ہی ہوتا ہے، لہذا لفظ "نفس یا ذات" استعمال کرنے کے بجائے "أیدی وأرجل" کو استعمال کیا۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ وہ چیز مراد ہے جو "أیدی وأرجل" کے مابین ہے، یعنی قلب، کیونکہ زبان قلب ہی کی ترجمانی کرتی ہے اسی وجہ سے افتراء سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دیگر بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ اصلاً بیعۃ النساء کے ہیں، اور یہ کنایہ ہے اس بات سے کہ عورت زنا کرے اور اولادِ زنا کو شوہر کے حوالہ کرے، لیکن چونکہ مردوں کی بیعت میں یہ معنی مراد نہیں لئے جا سکتے لہذا قلب یا ذات وغیرہ مراد لینا پڑا۔ (فتح الباری: ۹۳، ۱/۱۸)

آپ نے فرمایا کہ کسی کو بہتان نہ لگاؤ۔ بلکہ اگر کھلی آنکھوں دیکھ بھی لو تو پھر بھی خیال کرو کہ میری آنکھیں غلطی کر رہی ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ

جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے چور کو چوری کرتے دیکھا تو اس نے قسم کھائی کہ میں نے چوری نہیں کی، تو آپ نے فرمایا کہ: "فکذبت عینی" میری آنکھوں نے غلط دیکھا، میری آنکھوں کی غلطی ہے۔ ایسا ہی واقعہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی ہے۔

اگر چاہو کہ لوگ تمہاری عزت کریں تو تم لوگوں کی عزت کرو۔ اگر کوئی کسی پر بہتان لگاتا ہے تو اس پر بھی ضرور بہتان لگایا جائیگا۔ چاہے کتنا ہی بڑا بزرگ کیوں نہ ہو، اگر تم نے کسی کی بے عزتی کی ہے تو تمہاری بھی بے عزتی کی جائیگی۔

اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہیں سلام کریں تو خود دوسروں کو سلام کرو۔

شئ سادس: "لاتعصوا فی معروف" کسی اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرو۔ "فی معروفٍ" سے مراد امر خداوندی ہے۔

ولا تعصوا: ص کے ضمہ کے ساتھ ہے، اور بعض روایات میں "لاتعصونی" وارد ہوا ہے، امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ نہ میری نافرمانی کرو اور نہ اولوالامر کی کسی معروف چیز میں نافرمانی کرو۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اس کے ذریعہ اس امر پر تنبیہ فرمادی کہ مخلوق کی اطاعت صرف اس وقت ہوتی ہے، جب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم نہ آئے۔ (فتح الباری: ۱/۱۸،۹۳)

جو چیزیں جو احکام خداوندی تمہیں معلوم ہیں، چاہے وہ اوامر کے قبیل سے ہوں یا نواہی کے قبیل سے ان پر عمل کرو ان کی نافرمانی نہ کرو، تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ چند چیزیں ارشاد فرمادیں۔

فاجرہ علی اللہ الخ: اور فرمایا کہ جو ان چیزوں کو اپنے اندر پیدا کریگا تو

اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر حسبِ وعدہ ضروری ہے۔

معتزلہ: کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اچھے برے عمل کا اجر و بدلہ ٹھیک اسی طرح واجب ہے، جیسے انسانوں پر واجب ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمالیا ہے، (اور ایفاء عہد واجب ہے)

معتزلہ کی دلیل

معتزلہ اجرہ علی اللہ الخ سے استدلال کرتے ہیں کہ علی لزوم کے لئے آتا ہے، یہاں علی کا لانا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، اس قسم کے اور دیگر جملے کتاب وسنت میں آتے ہیں ان سے معتزلہ استدلال کرتے ہیں۔

اہل سنت والجماعت کا مذہب ودلیل

اور اہل سنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے، اور یہاں پر "علی" اپنے اصلی معنی میں نہیں ہے، صرف مبالغہ کے طور پر اس بات کو بتانے کے لئے ہے کہ جس طرح واجبات کا وقوع یقینی ہے اسی طرح "اجر بالجنة" کا وقوع بھی یقینی ہے۔ (فتح الباری ایضاً)

(۲) وجوب کی دو قسمیں ہیں: (۱) وجوب استحقاقی۔ (۲) وجوب تفضیلی۔

یہاں وجوب تفضیلی مراد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے اپنے اوپر جنت کا دینا لازم کرلیا ہے۔

(۳) لزوم کی دو قسمیں ہیں: (۱) لزوم عقلی۔ (۲) لزوم شرعی۔

اہل سنت والجماعت لزوم عقلی کے نافی ہیں لزوم شرعی کے نہیں، اور یہاں لزوم شرعی

مراد ہے۔فلا اشکال.

وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْأً فَعُوقِبَ بِهٖ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهٗ: ان مذکورہ چیزوں میں سے اگر کوئی کسی فعل کا ارتکاب کرے اور اس کو دنیا میں سزا دیدی جائے تو یہ سزا اس کا کفارہ ہو جائیگی۔

اور اگر سزا نہ دی گئی تو اللہ تعالیٰ پر موقوف ہے وہ چاہے سزا دیں یا معاف فرمادیں۔

"فعوقب به في الدنيا فهو كفارة له" کیونکہ شوافع کے نزدیک حدود کفارات ہیں یعنی دنیوی سزا کے ذریعہ اخروی عذاب بھی معاف ہو جاتا ہے۔"فهو كفارة له" اسی پر دال ہے، اور بقول علامہ ابن نجیم اور جیسا کہ مشہور بھی ہے کہ حدود عندالاحناف سواتر للذنوب ہیں، کفارات نہیں ہیں، بلکہ حدود سیاسی و انتظامی معاملہ قائم رکھنے کے لئے محض زواجر ہیں۔(تنظیم الاشتات:۱/۵۷)

حدود کفارات ہیں یا نہیں؟

امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے درمیان اختلاف

حضرت امام شافعی اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہیں۔وہ فرماتے ہیں کہ اگر زانی اور شرابی وغیرہ کو دنیا میں سزا دیدی گئی تو اس پر آخرت میں مواخذہ نہ ہوگا۔

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ اگر زانی اور شرابی وغیرہ کو دنیا میں سزا دیدی گئی تو وہ آخرت کے مواخذہ سے بری نہ ہوگا بلکہ آخرت کا ذمہ اس پر علیحدہ رہے گا، ظاہراً یہ حدیث امام اعظمؒ کے مسلک کے خلاف ہے اور امام شافعیؒ کے موافق اور مؤید۔

جواب: امام اعظمؒ اس کا جواب دیتے ہیں کہ جس طرح ہمارے سامنے یہ حدیث شریف ہے اسی طرح کلام اللہ شریف کی نص قطعی بھی ہمارے سامنے ہے، جہاں اللہ تعالیٰ نے

زانیوں شرابیوں اور چوروں کی سزاؤں کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد ان کے متعلق فرمایا گیا ہے، "ذلک لهم خزی فی الدنیا"[1] کہ یہ تو دنیوی رسوائی ہے اور آخرت کا عذاب شدید مستقل الگ چیز ہے، آخرت کے مواخذہ سے بچنے کے لئے توبہ ضروری ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الا الذین تابوا من بعد ذلک واصلحوا فان اللہ غفور الرحیم.

حدیث شریف اور کتاب اللہ میں موافقت: کہ یہاں کفارہ سے مراد سبب کفارہ ہے یعنی یہ سزا کفارہ کا سبب اور توبہ کا سبب بن جاتی ہے۔

حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک یہ آیت مجاز پر محمول ہے حقیقت پر نہیں۔ اس لئے کہ عام طور پر دنیا کی سزا توبہ کو شامل ہوتی ہے یا توبہ کا سبب بن جاتی ہے۔

امام اعظمؒ کے نزدیک جو انسان جری علی المعصیۃ ہو اس کے لئے یہ سزا سبب کفارہ اور سبب توبہ نہیں بنے گی۔ جیسے ڈاکو جیل میں چولہے کو سالم رکھتا تھا کہ میں پھر آرہا ہوں۔

اور یہ آیت اس روایت کی بھی مؤید ہے جس کو حاکمؒ نے مستدرک میں سند صحیح کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں "لا ادری الحدود کفارة لاهلها ام لا". (فتح الباری ایضاً)

کتب احناف حدود کے زواجر اور عدم زواجر ہونے میں مختلف ہیں، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ حدود کفارہ ہیں، اور بعض سے عدم کفارہ ہونا معلوم ہوتا ہے، اس لئے حضرت علامہ انور شاہ صاحبؒ سے یہ منقول ہے کہ اقامۃ الحدود کے بعد تین حالات ہیں۔

---

[1] انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسوله ویسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیهم وارجلهم من خلاف او ینفوا من الارض. ذلک لهم خزی فی الدنیا ولهم فی الآخرة عذاب عظیم. الا الذین تابوا من بعد ذلک واصلحوا فان اللہ غفور رحیم. (سورة المائدة آیت: ٣٣، ٣٤)

(۱)......اگر حد کے بعد توبہ بھی کی ہے تو وہ حد بلا اختلاف کفارہ ہوگی۔

(۲)......اور اگر حد کے بعد توبہ نہیں کی۔تو پھر دو صورتیں ہیں،یا تو اس گناہ سے رک گیا ہوگا، اور اس کا اعادہ پھر نہیں کیا ہوگا تو اب وہ کفارہ ہوگی۔

(۳)......اور اگر اس حد کی کوئی پرواہ نہیں کی بلکہ اس گناہ میں ہمیشہ منہمک رہا تو وہ حد کفارہ نہ بنے گی، اور جب اسلام مشتمل بر توبہ ہو تو ماقبل کے معاصی معاف ہو جائیں گے ورنہ اول آخر تمام معاصی پر گرفت ہوگی۔تو غور کرنے کا مقام ہے کہ اسلام (جو مکفر اعظم ہے) اس کا یہ حال ہے تو حدود جن کے کفارہ ہونے میں اختلاف ہے ان کا کیا حال ہوگا۔(تنظیم الاشتات:۱/۵۹)

حضرت شیخ الہندؒ کی رائے

حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حنفیہ اور شافعیہ کا کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے، فریقین کے نزدیک حد زجر کا بھی فائدہ دیتی ہے اور ستر کا بھی۔اختلاف صرف نظر کا ہے کہ حدود کے قائم کرنے سے مقصد اصلی کیا ہے؟ حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ حد گو ستر کا بھی فائدہ دیتی ہے لیکن اس کے قائم کرنے کا اصل مقصد زجر ہے اس لئے انہوں نے حدود کو زواجر کہا۔ شافعیہ کے نزدیک معاملہ برعکس ہے وہ کہتے ہیں کہ گو حد زاجر ہے لیکن اس کے قائم کرنے سے اصل مقصد ستر ہے اس لئے وہ حدود کو سواتر کہدیتے ہیں۔خلاصہ یہ کہ حدود میں زجر و ستر دونوں تاثیریں فریقین کے نزدیک مسلم ہیں،صرف نظر کا اتنا اختلاف ہے کہ یہ بالذات سواتر ہیں یا زواجر۔(اشرف التوضیح)

یا یہ کلام مراحم خسروانہ پر محمول ہے۔جس طرح بادشاہ مراحم خسروانہ کی وجہ سے مجرموں کو چھوڑ دیتے ہیں، ایسے ہی اللہ تعالیٰ بھی ان کو چھوڑ دیں گے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں جب سب کو بخش دیں گے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تمام مسلمانوں کی شفاعت فرمائیں گے، تو بعد میں اللہ تعالیٰ مراحم خسروانہ کی وجہ سے اور لوگوں کو جہنم سے نکالیں گے۔ اور ان نکلنے والوں کے گلوں میں تختیاں پڑی ہونگی، جن پر لکھا ہوگا: "**هٰؤلاء عتقاء الله**" اور ان کا بڑا اعزاز ہوگا کہ اوروں کو نبیوں نے بخشوایا ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے بخشا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو مؤمن ہی ہوں گے مگر ان کا ایمان اتنا خفی ہوگا کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہوگا دوسرے انبیاء اور ملائکہ کو بھی ان کے ایمان کی خبر نہ ہوگی۔ اسی لئے حدیث شریف کا یہ جملہ مراحم خسروانہ سے یہ توقع نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دنیا میں بھی سزا دے اور آخرت میں بھی۔ تو محض اللہ تعالیٰ کے مراحم خسروانہ سے یہ امید ہے کہ صرف دنیاوی سزا سے اللہ تعالیٰ ان کی بخشش فرمادیں گے۔

کیونکہ مراحم خسروانہ کا اللہ تعالیٰ کے یہاں جب دروازہ کھلے گا تو اللہ تعالیٰ ایک گنہگار آدمی کو بخشیں گے اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمائیں گے، تو نے فلاں وقت یہ گناہ اور فلاں وقت یہ گناہ کیا تھا یہ انسان گھبرا جائیگا اور پوچھے گا، یا اللہ تعالیٰ کیا تو نے مجھے بخش نہیں دیا ہے اللہ فرمائیں گے کہ تیرے فلاں گناہ کی وجہ سے فلاں محل اور فلاں گناہ کی وجہ سے فلاں محل تجھ کو دیا گیا ہے تو وہ کہے گا کہ اللہ اس سے بڑے بڑے گناہ بھی میں نے کئے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ کو ہنسی آجائیگی۔ اس حدیث پاک میں اللہ تعالیٰ کے مراحم خسروانہ کا ذکر ہے۔ اور قرآن پاک میں ضابطہ کا۔

مگر معلوم ہونا چاہئے کہ ضابطہ پر صاحب ضابطہ کو عمل کرنا ضروری نہیں ہوتا، اگر مدرسہ میں آج قوانین پر عمل نہیں ہورہا ہے تو اس کا امتحان نہ کرنے لگ جائیو۔ بڑوں کا کبھی امتحان نہ کرنا چاہئے، ورنہ نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے۔ جیسے

واقعۂ عبرت: کسی محدث نے اللہ میاں کا امتحان لیا کہ اگر کوئی امام سے پہلے سجدہ سے اٹھ جائے تو اس کی صورت مسخ کردی جاتی ہے۔ اس نے ایسا کیا تو اس کی صورت مسخ کردی گئی اب بیچارے رہتے ہیں چلمن اوڑھے ہوئے۔

تو ایسے ہی کوئی مدرسہ والوں کا امتحان نہ لینے لگے، کہ کچھ عمل وِمل تو قوانین پر ہوتا ہی نہیں، جب ضوابط پر عمل ہوتا ہے تو نانی یاد آ جاتی ہے۔ اسی طرح کبھی حق تعالیٰ شانہ کا امتحان نہیں لینا چاہئے۔

معتزلہ اور خوارج پر رد

فائدہ الی اللہ: حافظ ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے کہ اس جملہ کے ذریعہ خوارج ومعتزلہ دونوں جماعتوں پر رد ہے کیونکہ خوارج یہ کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے، اور معتزلہ اس کو فاسق قرار دیکر اللہ تعالیٰ کے اوپر اس کو سزا دینا واجب قرار دیتے ہیں۔

اور یہاں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیان فرمادیا کہ ان کا معاملہ تحت المشیت ہے، اگر چاہے تو عذاب دیگا، اور اگر چاہے گا تو معاف کردیگا، اس کے اوپر عذاب دینا واجب نہیں ہے۔

ان شاء عفا عنہ: کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر سابق ہے لہذا اس جملہ کو مقدم کیا "وان شاء عاقبہ" سے۔

ایک جماعت کی رائے تو یہی ہے کہ چاہے وہ توبہ کرے یا نہ کرے اس کا معاملہ تحت المشیئۃ ہے، اور جمہور فرماتے ہیں کہ تائب پر مواخذہ نہ ہوگا، لیکن پھر بھی بندہ کو ڈرتے رہنا چاہئے، کیونکہ معلوم نہیں کہ اس کی توبہ قبول ہوئی یا نہیں۔ (فتح الباری ایضاً)

﴿رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عورتوں کو نصیحت﴾

﴿۱۸﴾ وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ اَضْحٰى اَوْ فِطْرٍ اِلَى الْمُصَلّٰى فَمَرَّ عَلَى النِّسَاءِ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ فَاِنِّيْ اُرِيْتُكُنَّ اَكْثَرَ اَهْلِ النَّارِ، فَقُلْنَ وَبِمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ، وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ، مَارَاَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ اَوْ دِيْنٍ اَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحْدَاكُنَّ قُلْنَ وَمَا نُقْصَانُ دِيْنِنَا وَعَقْلِنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْاَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ قُلْنَ بَلٰى قَالَ فَذٰلِكَ مِنْ نُقْصَانِ عَقْلِهَا، قَالَ اَلَيْسَ اِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ قُلْنَ بَلٰى فَذٰلِكَ مِنْ نُقْصَانِ دِيْنِهَا۔ (متفق علیه)

حواله: بخاری شریف: ص۴۴/۱، حدیث نمبر: ۳۰۴، باب ترک الحائض الصوم، کتاب الحیض، مسلم شریف: ص۶۰/۱، حدیث نمبر: ۸۰، باب بیان نقصان الایمان الخ، کتاب الایمان،

حل لغات: معشر، ایک طرز کے لوگ، جماعت، جس کے مشاغل و احوال ایک جیسے ہوں، ج معاشر، عشیر، شوہر دوست، جمع عُشَرَاءُ، اللب، ہر چیز کا خالص و منتخب حصہ ج اَلْبَابُ، الحازم، دور اندیش محتاط، جمع حَزَمَةٌ، حَزُمَ (ن) حزامةً، محتاط و دور اندیش ہونا، حاضت، المرأۃ حیضاً (ض) حیض آنا، حائض و حائضۃ، ج حوائض، حیض کی عمر کو پہنچنا۔

ترجمه: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید یا بقرعید کی نماز کے لئے عیدگاہ تشریف لائے، تو عورتوں کی ایک جماعت کے

پاس تشریف لے گئے، اور ان سے فرمایا: ''اے عورتوں کی جماعت! تم صدقہ دیا کرو، اس وجہ سے کہ میں نے تم میں سے اکثر کو جہنم میں دیکھا ہے'' عورتوں نے دریافت کیا کہ ایسا کس وجہ سے ہے اے اللہ کے رسول؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وجہ سے کہ تم لوگ بہت زیادہ لعن طعن، اور شوہروں کی ناشکری کرتی ہو، میں نے عقل و دین کے اعتبار سے ناقص ہونے کے باوجود ہوشیار رہا اک مرد کو بے وقوف بنا دینے میں تم سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا، ان عورتوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہماری عقل اور ہمارے دین میں کیا کمی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا ایک عورت کی گواہی مرد کی آدھی گواہی کے برابر نہیں؟ انہوں نے کہا کہ بالکل ایسا ہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ عورت کی عقل کی کمی کی وجہ سے ہے، پھر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا ایسا نہیں ہے کہ جس وقت عورت حائضہ ہوتی ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے۔ انہوں نے کہا جی ہاں ایسا ہی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اس کے دین کے نقصان کی وجہ سے ہے۔

تشریح: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ [1] خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ فِیْ اَضْحٰی اَوْ فِطْرٍ الخ: انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ یا عید الفطر میں عید گاہ کی طرف تشریف لے گئے۔

اس زمانہ کی عید گاہوں کی طرح عید گاہ نہیں تھی، وہاں تو صرف ایک میدان تھا، جہاں نماز عید پڑھی جاتی تھی۔

[1] ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ: آپ کا اسم گرامی سعد بن مالک بن سنان بن عبید ہے اور اپنی کنیت ''ابو سعید'' سے زیادہ مشہور ہیں، آپ کے والد صاحب غزوۂ احد میں لیکر گئے تھے، مگر کم عمری کی وجہ سے اس میں شرکت نہ کر سکے۔ البتہ بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ کثیر الروایۃ صحابی ہیں متعدد صحابۂ کرام اور تابعین کی ایک بڑی جماعت ان سے روایت کرتی ہے آپ کی وفات کے بارے میں سخت اختلاف ہے۔ واقدی نے کہا کہ سن وفات ۷۴ھ اور بعض نے ۷۳ھ بعض نے ۶۵ھ ذکر کیا ہے۔ (اصابہ: ۱/۳۵)
ملا علی قاریؒ نے نقل کیا ہے کہ جنت البقیع میں تدفین عمل میں آئی۔ (مرقاۃ: ۱/۴۰)

اس زمانہ میں پیسہ ان عمارتوں اور محلات میں خرچ نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ انسان بنائے جاتے تھے۔

اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بنایا تو صداقت کا پہاڑ بنا دیا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شجاعت کا محل بنا دیا، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حیا کا محل بنا دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو علم وحکمت اور قضاء کی کان بنا دیا، وہاں تو ایسے ایسے محل بنائے جاتے تھے، ان ہی چیزوں پر پیسہ خرچ کیا جاتا تھا، تعمیرات زائدہ میں پیسہ خرچ نہیں کیا جاتا تھا۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ تشریف لے گئے اور وہاں لوگوں کو وعظ فرمایا اور چونکہ عورتوں کو آواز نہ پہنچ سکی تھی اس لئے آپ بذات خود عورتوں کے پاس تشریف لے گئے، کیونکہ آپ جس طرح مردوں کے نبی تھے، اسی طرح عورتوں کے بھی نبی تھے۔

بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ عورتوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مرد ہم سے ہر چیز میں آگے ہیں، آپ ایک دن ہم عورتوں کو وعظ ونصیحت کے لئے مقرر فرما دیجئے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست منظور فرمائی۔ اور ان سے ایک دن وعظ ونصیحت کا وعدہ فرمالیا۔ (فتح الباری: ۱/۲۴۶، رقم: ۱۰۱)

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست کو اس موقعہ پر پورا فرمایا، اور اس دن ان کو وعظ ونصیحت فرمائی۔ (فتح الباری: ۵۳۹/۱/۳۰۴)

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خطاب فرمایا:

خطاب کا ایک ادب

یا معشر النساء: اس سے معلوم ہوا کہ جب خطاب کرو تو مخاطبین کے وصف عنوانی سے خطاب کرو۔ اگر طلباء سے خطاب ہے تو اسی وصف کو اختیار کرو[1]۔ اس لئے کہ

[1] البتہ خطاب عام ہے مگر چونکہ عورتیں حاضر تھیں اس لئے مخصوص الفاظ استعمال فرمائے۔ (مرقاۃ: ۱/۸۰)

مخاطبین پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے۔

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

تصدقن الخ: تم صدقہ دیا کرو، اس لئے کہ میں نے جہنم میں اکثر عورتیں ہی دیکھی ہیں۔یعنی جب حالت کشف یا مشاہدہ یا عالمِ خواب یا لیلۃ المعراج میں جنت وجہنم کو دیکھا، اور جہنم میں دیکھا تو اکثر عورتوں کو پایا۔

صلوۃ کسوف کے وقت بھی آپ کو جنت ودوزخ نظر آرہی تھیں، بعد میں آپ نے فرمایا کہ آج جیسا منظر کبھی نہیں دیکھا۔اور فرمایا کہ اس دیوار پر جنت کو اور دوزخ کو دیکھا۔اور دوزخ میں زیادہ تر عورتوں کو دیکھا۔

اشکال مع جواب

اشکال ہوتا ہے کہ جنت وجہنم اتنی بڑی ہیں اور اتنی دور ہیں پھر ان کو ایک دیوار میں کیسے دیکھا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں تو اس پر اشکال ہو سکتا تھا مگر اس نئی ایجادات کے دور میں اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں، کمپیوٹر، ٹیلی ویژن کے ذرا سے ڈبہ میں ہزاروں میل دور دراز کے ملکوں اور شہروں کو دیکھا جا سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو ایک دیوار میں جنت وجہنم کو دکھانا کیا مشکل ہے۔فقط

أُرِيتكن: ہمزہ کے ضمہ اور را کے کسرہ کے ساتھ فعل مجہول ہے۔البتہ اس اراءت کے سلسلہ میں حافظ ابن حجرؒ کی رائے یہ نقل کی ہے کہ یہ اراءت شب معراج میں ہوئی۔

اور ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ اراءت یا تو بطور کشف ہوئی یا بذریعہ وحی لیکن خود حافظ ابن حجرؒ نے ہی ذکر کیا ہے کہ بخاری شریف کتاب العلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ

عنہ کی روایت میں صراحت ہے کہ "اریت النار فرأیت اکثر اهلها النساء" اور چونکہ یہ معاملہ صلوۃ کسوف میں پیش آیا تھا لہذا معلوم ہوا کہ یہ اراءت صلوۃ کسوف میں ہوئی ہے۔ (فتح الباری: ١/٥٤٠، ٣٠٤، کتاب الحیض)

عورتوں نے دریافت کیا اس کی کیا وجہ ہے یا رسول اللہ؟ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) یعنی جہنم میں عورتوں کے زیادہ ہونے کی کیا وجہ ہے۔

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

تکثرن اللعن وتکفرن العشیر الخ: کہ تم لعنت ملامت زیادہ کرتی ہو اور عشیر کی نافرمانی کرتی ہو۔

عشیر: ساتھی کو کہا جاتا ہے۔

یہاں اس سے مراد شوہر ہے، ذرا ذرا سی باتوں پر لعنت و پھٹکار عورتوں کا سب سے بڑا شعار ہے، گھر میں کسی کو نہیں چھوڑتی ہیں، اپنی اولاد کو نہیں بخشتیں۔ شوہر اگر زندگی بھر احسانات کرتا رہے، اگر ذرا سی بات مزاج کے خلاف ہو جائے، اگر ذرا سی نوک جھونک ہو جائے تو پھر دیکھو میں نے اس اجڑے گھر میں دو کپڑے دو چیتھڑے نہیں دیکھے، دو لیتر ے نہیں دیکھے۔

اگر مرغی آٹے میں ذرا سی چونچ مار دے تو نہ اسے بخشیں جس سے وہ پھٹکار اس کے بیضہ پر پڑی، اور بالواسطہ جس نے اسے کھایا تو وہ بھی تو گویا پھٹکارا گیا۔

تکثرن اللعن: لعنت کے لغوی معنی ہیں "ابعاد عن الرحمة" (رحمت سے دور کرنا)

اور انسان کی جانب سے اس کے معنی ہوتے ہیں رحمتِ الٰہیہ سے دوری اور غضب کی بد دعاء کرنا۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت غضب سے بہت وسیع ہے اس لئے کسی پر بھی لعنت کرنا

درست نہیں ہے۔ سوائے اس کافر کے جس کی موت کفر پر یقینی ہو اور وحی سے معلوم ہو، جیسے ابوجہل، ابلیس وغیرہ، البتہ غیر معین طریقہ پر لعنت درست ہے، مثلاً "لعنة الله على الكفرين، لعنة الله على الكاذبين" (تحفۃ المرأۃ:۱۲۳)

تکفرن: کفران اور کفر دونوں لغۃً کسی چیز کو چھپانے کے معنی میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ البتہ کفر کا اطلاق عموماً وحدانیت، ربوبیت، نبوت اور شریعت وغیرہ کے انکار کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور کفران کا استعمال عام طور پر نعمت کی ناقدری کے لئے استعمال ہوتا ہے یہ چھوٹا کفر ہے اور یہاں پر یہی مراد ہے، اور اسی مناسبت کی وجہ سے روایت کو کتاب الایمان میں مصنفؒ نے ذکر کیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ عورت شوہر کی جانب سے عطا شدہ نعمتوں کا ذرا سی ناراضگی کی وجہ سے انکار کردیتی ہیں۔ یا یہ کہ نعمت کا شکر ادا نہیں کرتیں، حالانکہ حدیث میں ہے۔"من لم يشكر الناس لم يشكر الله" (طیبی:۱۴۲/۱، مرقاۃ:۸۰/۱، مع زیادۃ)

تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تم صدقہ زیادہ دیا کرو کیونکہ اکثر تم ہی کو میں نے دوزخ میں دیکھا ہے۔

اشکال و جواب

لعن و کفران یہ دونوں تو حقوق العباد میں سے ہیں، نیز کبائر میں سے ہیں جو بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے، لیکن آپ نے جوان کو صدقہ کرنے کا حکم فرمایا ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صدقہ ان گناہوں کا کفارہ ہوگا۔ حالانکہ یہ کلیات کے خلاف ہے، تو جواب یہ ہے کہ صدقہ کا حکم کفارہ کی حیثیت سے نہیں دیا گیا بلکہ صدقہ کے ذریعہ توبہ کی توفیق ہوگی، یا صدقہ کے ذریعہ یہ بری عادت زائل ہوجائے گی، یا اس لئے صدقہ دینے کو فرمایا تاکہ اتنا صدقہ

کریں کہ اس کا ثواب ان گناہوں سے وزن میں بڑھ جائے۔(مرقاۃ)

تکثرن: مجرد و مزید فیہ دونوں جائز ہیں۔مگر یہاں مزید "تُکْثِرن" ہی پڑھنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ مقام تعدی ہے۔

بِمَ: جب ما استفہامیہ پر حرفِ جر داخل ہوتا ہے تو ما کا الف لکھنے میں بھی گر جاتا ہے اور پڑھنے میں بھی۔[1]

ما رأیت من ناقصات عقل ودین میں مِنْ زائد ہے، اور یہ کلام موجب میں زائد آ جاتا ہے۔

ناقصات عقل ودین "رأیت" کا مفعول بہ ہے۔

"اذھب" اسم تفضیل ہے اور یہ "رأیت" کا مفعول ثانی ہے۔

للب الرجل: متعلق ہے "اذھب" کا۔[2]

ترجمہ: نہیں دیکھا میں نے عقل مند کی عقل کو زیادہ لیجانے والا عورتوں سے زیادہ کسی کو۔

تو عورتیں بڑے بڑے عقل مندوں کی عقل کو ختم کر دیتی ہیں۔جیسے

---

[1] **وبم:** واو استینافیہ ہے، با تعلیلیہ اور میم کی اصل ما استفہامیہ ہے جس سے الف کو حذف کر دیا گیا ہے۔(فتح الباری:۱/۵۴۰،۴۰۶)

[2] **للب:** عقل کے مقابلہ اس میں زیادہ خصوصیت ہے، اور عقل خالص اس سے مراد ہے۔

الحازم: حافظ الامر کے لئے یہ استعمال کیا جاتا ہے اور مبالغہ کے طور پر یہ بات بتائی جاتی ہے کہ جب ضابط الامر تک بھی ان کا فرمانبردار و مطیع ہو جاتا ہے تو جو شخص اس درجہ کا نہ ہو وہ تو بدرجۂ اولیٰ ان کا فرمانبردار و مطیع ہو جائیگا۔(فتح الباری ایضا)

من احداکن: اذھب کے متعلق ہے، اور اس کے بجائے "منکن" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔اس لئے کہ ایک جب اس صفت ذمیمہ کے ساتھ متصف ہوگا، تو اگر ایک سے زائد ہوں تو بدرجۂ اولیٰ وہ اس صفت ذمیمہ کے ساتھ متصف ہوں گی۔(فتح الباری ایضا)

واقعہ جاحظ

جاحظ ایک بہت بڑے عالم ہیں مگر تھے بدصورت ان کا واقعہ ہے کہ ایک عورت ان کے پاس آئی اور کہا کہ ذرا تم سے کام ہے، یہ اخلاقاً اس کے ساتھ ہو لئے، اور ایک فوٹوگر کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا اور ھکذا کہہ کر چلدی، یہ کھڑے رہے، بعد میں فوٹوگر سے پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ یہ روز آ کر مجھے کہا کرتی تھی کہ شیطان کی تصویر بنادو، میں نے عذر کیا کہ میں نے کبھی شیطان کو دیکھا نہیں تو یہ تمہیں دکھانے کے لئے لیکر آئی ہے، کہ ایسا بنادو۔

تو دیکھا کہ کتنے عقل مند کی عقل کو ختم کر دیا، اسی طرح بڑے بڑے عقلمند کی جب کسی عورت سے نظر لڑ جاتی ہے تو اس کی تمام عقل خاک میں مل جاتی ہے، اور بالکل اندھا بہرا ہو کر اس کے دام فریب میں پھنس جاتا ہے۔ الا ماشاء اللہ

عورتیں کہنے لگیں کہ یارسول اللہ! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) ہمارے دین وعقل کی کمی کی کیا بات ہے، اور ہمارے دین وعقل میں کیا نقصان ہے۔

طالب علم کا استاذ سے سوال کرنا

فائدہ: اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے وہ طالب علم استاذ سے دوبارہ معلوم کر لے نہ طالب علم کو شرمانا چاہئے نہ استاذ کو سوال سے ناراض ہونا چاہئے اور یہ ان عورتوں کی انتہائی رغبت کی بات ہے کہ جو بات سمجھ میں نہیں آئی اس کو فوراً دریافت کر لیا، اسی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مدح فرمائی ہے۔ ”نعم النساء نساء الانصار، لم یمنعهن الحياء ان یتفقهن في الدين“ (مرقاة: ۱:۸۱)

البتہ اشکال یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ”من ناقصات عقل

و دین"" فرمایا تھا اورانہوں نے سوال میں ترتیب کو بدل کر "وما نقصان دیننا ......"
کیوں فرمایا؟

بعض علماء کی رائے تو یہ ہے کہ یہ بھی ان کے نقص عقل کی وجہ سے ہے کہ ان کے سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ نقص عقل امر جبلی ہے اور نقص دین امر حادث ہے، جس کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نقصان عقل کو مقدم فرمایا تھا۔ (مرقاۃ:۱/۸۱)

نقصان عقل کی دلیل

حضورا کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ایک مرد کی شہادت برابر ہے دوعورتوں کے، تو معلوم ہوا کہ مردوں کے اعتبار سے عورتوں کی عقل کم ہے۔ (اور یہ اشارہ ہے "واستشهدوا شهيدين من رجالكم فان لم يكونا رجلين فرجل و امرأتان ممن ترضون من الشهداء" (فتح الباری:۱/۵۴۰/۳۰۴)

اشکال مع جواب

پھر یہاں آپ نے عورتوں کو جنس کے اعتبار سے ناقصات عقل فرمایا۔ لہٰذا بعض افراد کے کامل ہونے سے کوئی اشکال وارد نہ ہوگا۔ جیسے حضرت مریم، حضرت آسیہؑ، حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں آتا ہے کہ یہ کامل عقل والی ہیں۔

پھر یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ ہم بہت سی عورتوں کو دیکھتے ہیں کہ مردوں سے بہت زیادہ عقلمند ہیں، حکومت چلا رہی ہیں، تو کیسے مرد سے کم عقل کہا گیا، تو جواب یہ ہے کہ ایک ہی خاندان کے ایک مرد اور ایک عورت کو لیا جائے جو ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں اور

ایک قسم کی غذا کھاتے ہیں، ایک ہی عمر کے ہوں تو تجربہ شاہد ہے کہ وہ عورت اس مرد کی آدھی ہوتی ہے، ہر اعتبار سے عقل میں، دیکھنے میں، سننے میں، چلنے دوڑنے میں وغیرہ۔ اور اگر تم نے عورت لی اونچے خاندان کی، شہر میں رہنے والی جو اچھی اچھی غذا کھاتی ہے، اور مرد لیا نچلے خاندان کا جو دیہات میں رہتا ہے، غذا بھی مقوی نہیں ہے تو ان دونوں میں تو ضرور فرق ہوگا۔ (مرقاۃ)

نقصان دین کی دلیل

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب تم حائضہ ہو جاتی ہو تو نہ نماز پڑھتی ہو نہ روزہ رکھتی ہو، یہ دین کا نقصان ہے، عورتوں نے اس کا اعتراف کیا۔

فائدہ: لیکن ان سب باتوں سے مقصود عورتوں پر ملامت کرنا نہیں ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں (نقص عقل ودین) اصل خلقت سے ہیں، جو غیر اختیاری ہیں، اسی وجہ سے عذاب بھی ان دونوں پر مرتب نہیں ہوتا، چونکہ غیر اختیاری چیز پر نہ گناہ ہوتا ہے نہ عذاب جبکہ کفران عشیر وغیرہ پر عذاب ہوتا ہے۔ چونکہ کفران عشیر اور لعنت وملامت کی کثرت دونوں چیزیں اختیاری ہیں، اس لئے دونوں گناہ بھی ہیں اور ان پر عذاب بھی ہوتا ہے۔

زمانۂ حیض کی فوت شدہ نمازوں پر ثواب

رہی یہ بات کہ حائضہ عورت کی بوقت حیض جو نماز فوت ہوئی اس کو اس کا ثواب ملے گا یا نہیں۔ جس طرح کوئی شخص اگر مرض یا سفر کی وجہ سے اپنے معمولات کے نوافل نہ ادا کر سکے تو اس کو ادا نہ کرنے کے باوجود ادائیگی کا ثواب منجانب اللہ عطا کیا جاتا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ عورت کو اس کا ثواب نہیں ملیگا، اور مریض ومسافر وعورت کے درمیان فرق یہ ہے کہ مریض ومسافر دوام کی نیت رکھتا ہے، اور اس میں اہلیت بھی موجود

ہےاور حائضہ عورت کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس فرق کی وجہ سے یہ کہنا کہ عورت کو ثواب نہیں دیا جائیگا، میرے نزدیک یہ محل نظر ہے۔(فتح الباری:۱/۵۴۱/۳۰۴)

واعظین کی ذمہ داری

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ جب وعظ وتقریر کرو تو مخاطبوں کے عیوب اور کمزوریاں ان کے سامنے بیان کرو، اوران کے علاج کا طریقہ بیان کرو، یہ نہیں کہ صرف لطیفے چھوڑ آئے اور بس۔

جیسے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیان فرمادیا کہ تمہارے اندر دو کمزوریاں ہیں۔

ایک اختیاری، دوسری غیر اختیاری

عقل کی کمی عورتوں کی غیر اختیاری کمزوری ہے۔ اگر انہیں اختیار دیدیا جاتا تو یہ تو ساری عقل کو سمیٹ لیتیں، جیسے زیورات اور کپڑے وغیرہ سمیٹتی ہیں۔

اور اگر انہیں اختیار دیدیا جاتا تو یہ کبھی بھی حیض کو پسند نہ کرتیں۔ بلکہ یوں چاہتیں کہ حیض تو صرف مردوں ہی کو آیا کرے۔

مگر چونکہ انہیں کی طبیعت اس کا تحمل کرسکتی تھی اسلئے اللہ تعالیٰ نے انہیں میں حیض کو رکھا۔

اختیاری کمزوری عورتوں کی یہ ہے کہ شوہروں کی نافرمانی بہت کرتی ہیں، اس کا علاج بھی آنحضرت نے بتلادیا کہ صدقہ زیادہ کیا کرو۔

عورتوں کا اجتماع

فائدہ: اس حدیث شریف سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورتوں کا اجتماع درست ہے مگر اسطرح کہ مردوں سے اختلاط نہ ہو، اور کسی قسم کے فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔

﴿خدا کی تکذیب اور گالی﴾

﴿۱۹﴾ وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی "کَذَّبَنِی ابْنُ آدَمَ وَلَمْ یَکُنْ لَهُ ذٰلِکَ وَشَتَمَنِی، وَلَمْ یَکُنْ لَهُ ذٰلِکَ فَاَمَّا تَکْذِیْبُهُ اِیَّایَ فَقَوْلُهُ لَنْ یُعِیْدَنِی کَمَا بَدَاَنِی وَلَیْسَ اَوَّلُ الْخَلْقِ بِاَهْوَنَ عَلَیَّ مِنْ اِعَادَتِهِ وَاَمَّا شَتْمُهُ اِیَّایَ فَقَوْلُهُ اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا وَاَنَا الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِی لَمْ اَلِدْ وَلَمْ اُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لِی کُفُوًا اَحَدٌ وَفِی رِوَایَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَاَمَّا شَتْمُهُ اِیَّایَ فَقَوْلُهُ لِی وَلَدٌ وَسُبْحَانِی اَنْ اَتَّخِذَ صَاحِبَةً اَوْ وَلَدًا۔ (رواہ البخاری)

حوالہ: بخاری شریف: ص ۶۴۴/۲، تفسیر سورۂ بقرہ، حدیث نمبر: ۴۲۹۷، عالمی حدیث نمبر: ۴۹۷۴۔

حل لغات: کذبنی، کذب تکذیباً، بالامر، (تفعیل) کسی بات کا انکار کرنا، تسلیم نہ کرنا، شتمنی، شتم، احداً ــ شتماً (ن ض) گالی دینا، کوسنا، برا بھلا کہنا، بدأنی، بدأ ــ بدء أ، (ض) پیدا کرنا، اھون، اسم تفضیل، ھان الشیء (ن) علیہ ھوناً، آسان ہونا، حقیر ہونا۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان مجھ کو جھٹلاتا ہے حالانکہ یہ بات اس کو زیب نہیں دیتی ہے، اور وہ مجھ کو برا بھلا کہتا ہے، حالانکہ یہ اس کے لئے مناسب نہیں ہے، اس کا مجھ کو جھٹلانا تو یہ کہ وہ کہتا ہے کہ "میں نے جس طرح اس کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہوں اور زیادہ آسان نہیں ہے اول مرتبہ پیدا کرنا دوبارہ پیدا کرنے سے" اور اس کا

مجھ کو برا بھلا کہنا یہ ہے کہ ''وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنالیا ہے حالانکہ میں تنہا اور بے نیاز ہوں، نہ میں نے کسی کو جنا ہے اور نہ مجھ کو کسی نے جنا اور نہ کوئی میرا ہمسر ہے، اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ''انسان کا مجھ کو برا بھلا کہنا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میرے لئے لڑکا ہے، حالانکہ میں اس سے پاک ہوں کہ کسی کو بیوی بناؤں یا بیٹا بناؤں۔

تشریح: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی کَذَّبَنِیْ الخ: یہ حدیث قدسی ہے۔

حدیث قدسی: اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں قول کی اسناد اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، جیسا کہ اس حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ابن آدم اولاد آدم نے میری تکذیب کی، حالانکہ اس کے لئے یہ مناسب نہ تھا، اس نے مجھے گالی دی اور اسے یہ مناسب نہ تھا۔

قرآن پاک اور حدیث قدسی میں فرق

البتہ حدیث قدسی اور قرآن پاک کے درمیان فرق یہ ہے کہ قرآن پاک متواتر ہے اور اس کو حضرت جبرئیل علیہ السلام لیکر آئے تھے اور جن الفاظ میں وہ لاتے تھے انہی الفاظ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یاد کرتے اور امت کو بتاتے تھے، اور حدیث قدسی کبھی الہام، کبھی خواب اور کبھی فرشتہ کے ذریعہ معنیٰ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتے تھے جس کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے الفاظ میں امت کو بتا کر اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کرتے تھے۔ (مرقاۃ:۱/۸۲)

اور حدیث قدسی کا متواتر ہونا شرط نہیں بلکہ خبر واحد کے درجہ میں ہو اس کو بھی حدیث قدسی کہہ سکتے ہیں۔

دوم: قرآن پاک وحی متلو ہے، جس کی نماز میں تلاوت کیجاتی ہے، اور حدیث قدسی کی تلاوت نماز میں جائز نہیں۔

سوم: وحی تین طرح کی ہوتی ہے، ایک تو یہ ہے کہ الفاظ و معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی جلی کے ساتھ ہوتے ہیں، اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، تو اسی کو کلام اللہ اور القرآن کہا جاتا ہے۔ اور اگر معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوں اور نسبت بھی اس کی اللہ تعالیٰ کی طرف ہو لیکن الفاظ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہوں تو یہ حدیث قدسی ہے۔ اور اگر معانی و مضمون اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اور الفاظ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہوں اور نسبت بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف ہو تو یہ حدیث نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے۔

فاما: سے تفصیل ہے اجمال کی۔

اولاً اجمال ذکر کیا پھر تفصیل شروع کی کہ چونکہ تفصیل بعد الاجمال اوقع فی النفس ہوتی ہے۔

اس کا تکذیب کرنا یہ ہے کہ یوں کہتا پھرے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کیسے زندہ کریگا، جیسا کہ پہلی مرتبہ پیدا کیا، اور کہتا پھرے "من یحی العظام وھی رمیم" وغیرہ۔ اور چونکہ اس میں ان تمام آیات کی تردید ہوگئی جن میں اللہ تعالیٰ نے حشر و نشر کا اثبات کیا ہے اس وجہ سے اس کو تکذیب قرار دیا گیا۔ (مرقاۃ)

مگر اللہ تعالیٰ تو چونکہ قادر مطلق ہے اس لئے جس طرح اس نے ابتداءً پیدا کیا ہے اسی طرح وہ ثانیاً بھی پیدا کر سکتا ہے اور یہ اس کے لئے زیادہ مشکل نہیں اور دنیاوی اور عقلی اعتبار سے تو پہلی مرتبہ پیدا کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے، دوبارہ پیدا کرنے سے۔

الیس اول الخلق اھون من اعادتہ: کیا نہیں ہے؟ زیادہ

آسان اول مرتبہ پیدا کرنا دوبارہ پیدا کرنے سے۔

یعنی ہمیں تو اول مرتبہ بھی پیدا کرنا آسان ہے اور دوبارہ پیدا کرنا بھی آسان ہے، ہمارا کام تو صرف لفظ کن سے چل جاتا ہے۔ اور لفظ کن کی بھی ضرورت نہیں صرف اس کا ارادہ کافی ہے۔

اور یہ پیدا کرنا تو اللہ تعالیٰ کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ (یہ محاورہ ہے آسان ہونے سے)

اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ محبت بھرا شکوہ کہ یہ اولاد آدم ہماری زمین کے اوپر اور ہمارے آسمانوں کے نیچے رہتی ہے اور ہماری نعمتوں سے سرشار رہتی ہے۔ اور روزانہ ٹنوں پانی پی جاتی ہے اور نہ معلوم روزانہ کتنی کتنی اور کیسی کیسی نعمتیں ہم اس پر نازل کرتے ہیں اور پھر بھی یہ ہماری تکذیب کرتی ہے۔

اور یہ تکذیب تو اس کے لئے ہرگز مناسب نہ تھی۔ کیونکہ اس کی یہ تکذیب تو ''جس ہانڈی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں'' کا مصداق ہے۔

اگر انسان چاہے اور دنیا کے تمام انسان تمام حکومتیں مل کر تمام تدابیر کر کے تمام مشینوں کے ذریعہ قیامت تک زمین سے نباتات وغیرہ نہیں اگا سکتے۔ نہ پانی کا کوئی قطرہ اتار سکتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے جہاں ذرا سی بارش کی تو ہزاروں لاکھوں کروڑوں اربوں کھربوں بلکہ لاتعداد و لاتحصیٰ پودے نکال دیئے تو جو ذات اس پر قادر ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ تمام انسانوں کو زمین میں ملا دینے کے بعد پھر دوبارہ پیدا کر دے۔

اللہ تعالیٰ نے کتنے محبت بھرے عنوان سے بیان فرمایا ہے کہ اسے مناسب نہ تھا۔

قولہ وشتمنی الخ: اور وہ مجھے گالی دیتا ہے حالانکہ اس کے لئے مناسب نہ تھا۔

اور مجھے گالی دینا یہ ہے کہ میری طرف اولاد کی نسبت کرے کہ اللہ تعالیٰ نے تو اولاد بنائی ہے کوئی کہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔کوئی عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بتاتا ہے۔**العیاذ باللہ.**

گالی کی تعریف: شرم کی بات کو ذکر کرنا گالی کہلاتا ہے، جس طرح ماں بہن کے اعضاء مستورہ کو ذکر کرنا گالی کہلاتا ہے، یا جس چیز میں حقارت ونقص ہو اس کو کسی جانب منسوب کرنا گالی کہلاتا ہے۔(مرقاۃ)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اولاد بناتا پھرے یہ تو بڑی شرم کی بات ہے اولاد اور پھر وہ بھی ایسی جو اس کی کفو بھی نہیں، ذرا سوچئے تو سہی، اگر کسی انسان کے کتیا پیدا ہو جائے یا سانپ پیدا ہو جائے تو اس کو کتنی شرم ہوتی ہے، حالانکہ یہ دونوں حیوانیت میں شریک ہیں۔

اور وہ بیان کریں کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے۔یہود کہیں کہ عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔

اور نصاریٰ کہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔

ذرا سوچو تو سہی کہ جو کھاتے ہیں پیتے ہیں پاخانہ کرتے ہیں، اور سراپا احتیاج ہیں وہ اس ذات کی اولاد کیسے ہو سکتے ہیں، جو نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے، حی وقیوم ہے بے نیاز ہے۔غیر محتاج ہے، وہ ان چیزوں سے بری ہے۔

اور دوسری بات اس میں یہ لازم آتی ہے کہ جب اولاد ہوگی تو وہ صاحب اولاد کی قائم مقام بھی بنی چاہئے، کیونکہ تولد کی غرض ہی بقاء نوع ہے لہذا ذات باری کا فنا کے ساتھ متصف ہونا لازم آئیگا۔(مرقاۃ)

پھر ولد ممکن ہوگا بعد میں ہونے کی بناء پر اور ولد ووالد میں مماثلت ہوا کرتی ہے۔لہذا

خدا کا ممکن ہونا لازم آ ئیگا۔ جو شان خداوندی کے خلاف ہے۔ اور جس طرح کسی انسان کو گدھا کہنا گالی ہے حالانکہ انسان اور گدھا دونوں ممکن اور حادث ہونے میں مساوی ہیں، صرف نوع کا فرق ہے، اور مخلوق کو خالق کے ساتھ کسی قسم کی مساوات کا سوال ہی نہیں، پس اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد ثابت کرنا اس سے بہت زیادہ بڑھ کر گالی ہے۔

اشکال: اولاد کا ہونا تو کمال کی بات ہے نہ کہ عیب کی بات، اس کی تو انبیاء علیہم السلام نے دعائیں مانگی ہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرنا کیوں گالی ہے اور کیوں عیب ہے؟

جواب: جو اولاد کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کے واسطے تو اولاد کا ہونا کمال ہے، اور جو صلاحیت نہیں رکھتے، اور جن کی شان کے خلاف ہے تو ان کے لئے وہ عیب ہی ہے، نہ کہ کمال، مثلاً اگر کسی بوڑھی عورت کو اماں کہہ دیا جائے تو وہ خوش ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اس معیار پر ہے جہاں اولاد ہونا کمال اور شایان شان ہے۔ اور اگر پندرہ سالہ کنواری لڑکی کو اماں کہہ دیں تو وہ ایسا جوتہ اٹھا کر مار یگی کہ عمر بھر یاد رہے گا۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہے اس کی طرف اولاد کی نسبت بہت بری ہے۔

انا الاحد الصمد: احد جو ذات وصفات کے اعتبار سے یکتا ہو۔ صمد جو کسی کا محتاج نہ ہو اور سب اس کے محتاج ہوں۔ (مرقاۃ)

الذی لم الد ولم اولد: جو نہ کسی کا والد ہے اور نہ کسی کی اولاد ہے کیونکہ وہ تو قدیم بلا ابتداء ہے۔ جس طرح سے وہ آخر بلا انتہاء ہے۔ (نہ تو اس پر کبھی فنا آئی اور نہ کبھی اس پر فنا آئے گی) (مرقاۃ)

ولم یکن لی کفوا: لفظ کفو میں تین لغات ہیں۔ (۱) کاف وفاء کے ضمہ اور ہمزہ کے ساتھ کُفُؤاً. (۲) کاف کے ضمہ سکون فاء اور ہمزہ کے ساتھ کُفْؤاً. (۳)

کاف و فاء کے ضمہ اور واو کے ساتھ کُفُواً. اور کفوٗ کی نفی والدیت، ولدیت، زوجیت وغیرہ تمام کو عام ہے۔

صاحبۃ او ولدا: بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ "او" شک راوی کے لئے ہے یعنی راوی کے یہ یاد نہیں رہا کہ صاحبۃ فرمایا تھا یا ولدا. لہٰذا اس نے "او" کے ساتھ دونوں کو ذکر کر دیا۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ "او" تنویع کے لئے ہے، اور بتانا یہ ہے کہ میری ذات منزہ اور مبرا ہے بیوی سے بھی اور اولاد سے بھی۔ اور اس کی تائید دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں "ولا ولداً" واو کے ساتھ آیا ہے۔ (مرقاۃ: ۱/۸۳)

﴿زمانے کو برا کہنا﴾

﴿۲۰﴾ وَعَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالیٰ یُؤْذِیْنِی ابْنُ آدَمَ یَسُبُّ الدَّهْرَ وَاَنَا الدَّهْرُ بِیَدِیَ الْاَمْرُ اُقَلِّبُ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ۔ (متفق علیه)

حوالہ: بخاری شریف تفسیر سورۂ جاثیہ۔ کتاب التفسیر صفحہ: ۲/۷۱۵، حدیث نمبر: ۴۸۲۶، مسلم شریف: ص ۲/۲۳۷، کتاب الالفاظ من الادب، باب النهی عن سب الدهر.

حل لغات: آذاہ. ایذاء، افعال، تکلیف دینا، زحمت دینا، یسب، سبَّ احداً (ن) سباً، گالی دینا، برا بھلا کہنا، الدھر، زمانہ دراز، اَدْهُرٌ، وَدُهُور. اُقَلِّبُ، واحد متکلم فعل مضارع، قَلَّبَ الشَّیْءَ (تفعیل) اچھی طرح الٹنا پلٹنا۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے انسان مجھے بایں طور تکلیف دیتا ہے کہ وہ زمانے کو برا بھلا کہتا ہے، حالانکہ زمانہ تو میں ہی ہوں، تمام تصرفات میرے قبضے میں ہیں اور شب و روز کی گردش میرے ہی حکم سے ہوتی ہے۔

تشریح: یہ بھی حدیث قدسی ہے۔

حکم حدیث قدسی

جس کا حکم یہ ہے کہ اس میں تبدیلی اور روایت بالمعنی درست نہیں، حدیث نبوی کے برخلاف، اور اس کے الفاظ کا انکار موجب کفر نہیں برخلاف الفاظ قرآنیہ کے۔ (تحفۃ المرأۃ: ۱۲۵)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ[1] سے روایت ہے کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ ستاتا ہے مجھ کو آدم کا بیٹا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کو کوایذا نہیں پہنچتی وہ منفعل نہیں ہوتا۔ پس اس کا مطلب یہ ہے کہ ابن آدم ایذا رسانی کا کام کرتا ہے، اسی وجہ سے فرمایا کہ وہ ستاتا ہے۔ اور یوں نہیں فرمایا کہ مجھے تکلیف ہوتی ہے یا دکھ ہوتا ہے، آدم کا بیٹا ستانیکا کام کرتا ہے[2]۔

آگے اس کی تفصیل ہے کہ وہ زمانہ کو گالی دیتا ہے۔

---

[1] پہلی حدیث کا عنوان بھی یہی تھا اور راوی بھی حضرت ابوہریرہؓ ہی تھے لہذا وعنہ کہنا چاہئے تھا، لیکن چونکہ ماقبل میں حضرت ابن عباسؓ کا تذکرہ ہے جس کی وجہ سے احتمال تھا کہ قریب کی بنا پر ضمیر کا مرجع ابن عباسؓ کو بنالیا جائے لہذا نام کی صراحت کردی۔ (مرقاۃ)

[2] علماء کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ یہ حدیث متشابہات میں سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ستانا محال ہے۔ لہذا یا تو متقدمین کے مسلک کے مطابق تفویض کا مسلک اختیار کیا جائے، یا تاویل کی جائے۔

اور ایذاء کہا جاتا ہے کسی امر مکروہ کو غیر تک پہنچانا (قولاً ہو یا فعلاً) اس غیر میں تاثیر کرے یا نہ کرے۔ اور اللہ تعالیٰ کو ایذاء دینے کا مطلب یہ ہے کہ ان امور کو اختیار کرنا جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے "ان الذین یؤذون اللہ و رسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا و الآخرۃ" (مرقاۃ: ۱/۸۳)

اس کے دو مطلب ہیں۔

پہلا مطلب: تو یہ ہے کہ زمانہ ایسا ہے، اس نے ایسا کردیا، زمانہ ایسا برا ہے وغیرہ، گویا کہ زمانہ کو متصرف سمجھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ فائدہ ونقصان، تکلیف وآرام مصائب وآسائش زمانہ کی طرف سے ہیں۔ (مرقاۃ)

دوسرا مطلب: یہ ہے کہ زمانہ کو تو کچھ نہیں کہتا مگر زمانہ والوں کو زمانے میں رہنے والوں کو برا بھلا کہتا ہے گالیاں دیتا ہے کہ فلاں ایسا ہے فلاں ایسا ہے اس سے انہیں تو کچھ تکلیف نہیں ہوتی مگر اللہ تعالیٰ کی ایذاء کا کام کرتا ہے، یعنی ان چیزوں سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ کیونکہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔

یہ لوگوں کو ایذا رسانی سے بچانیکا بلیغ ترین قانون ہے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایذاء کی نسبت اپنی طرف کی ہے کہ لوگوں کو گالیاں دینا برا بھلا کہنا یہ مجھے ہی تکلیف پہنچانا ہے۔

زمانہ تمام مخلوق ہے زمین سے لیکر آسمان تک اور آسمان کے اوپر تک مگر وہاں کا نظام بدلا ہوا ہے۔ وہاں تاریخیں نہیں وہاں کی حرکتیں اور ہیں یہاں کی حرکتیں اور ہیں۔ جیسے ہوا چلی تو مولانا کی لنگی اڑنے لگی اب یہ لگے گالی دینے کہ تجھے ابھی وقت ملا تھا؟ اور زمانہ کو گالی دیتا ہے، بھلا یہ ہوا اپنے اختیار میں کہاں ہے اس پر تو فرشتے مؤکل ہیں۔

اور فرشتے بھی خود مختار نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیدیا کہ اتنے پونڈ ہوا چلا دو تو انہوں نے چلا دی، لوگ کتنا ہی شور کریں کہ حبس ہو رہا ہے، ہوا اور چلنی چاہئے، وہ تو اتنی ہی چلے گی، جتنا حکم ہوا ہے۔

جیسے کوئی طالب علم مطبخ کے طباخ منشی کو برا بھلا کہتا ہے اساتذہ کو برا بھلا کہتا ہے اس سے ان کا تو کچھ بگڑیگا نہیں۔ مگر حضرت جی کی ناراضگی کا سامان ہو ہی جائیگا تو ان حضرات کو برا بھلا کہنا گویا حضرت جی کو برا کہنا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی ہوا کو آگ کو پانی کو یا اور دوسری چیزوں کو گالی دیتا ہے تو ان بے حقیقت چیزوں کا تو اس سے کچھ بگڑیگا نہیں، مگر اللہ تعالیٰ ضرور ناراض ہوجائیں گے۔ تو بے اختیار حقیقتوں کو گالی دینا اللہ تعالیٰ ہی کو گالی دینا ہے۔

انا الدھر : فرمایا کہ میں ہی زمانہ ہوں۔

اس سے لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ اور زمانہ دونوں متحد ہیں۔ (کیونکہ یہ مصرف الدہر یا مقلب الدہر کے معنی میں ہے) جس کی تفصیل آگے ہے، "اقلب الدھر" کہ زمانہ کو میں ہی تو الٹ پلٹ کرتا ہوں، اس کو میں ہی چلاتا ہوں۔

یعنی تمام امور میرے قبضۂ تصرف میں ہیں چاہے وہ خیر ہوں یا شر ہوں، پسند ہوں یا ناپسند ہوں۔ (مرقاۃ)

تو جو شخص سورج کو ہوا وغیرہ کو گالی دیتا ہے تو یہ گالیاں ان تک نہیں پہنچتیں، کیونکہ وہ اس کے مستحق نہیں ہیں، بلکہ اس کا گناہ اور عذاب تو گالی دینے والوں کو ہوتا ہے۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے بڑی محبت سے لوگوں کو ایذارسانی سے روکا ہے کہ کوئی کسی کو ایذا نہ پہونچائے۔

اسی قانون پر عمل کرنے سے پوری دنیا میں امن وامان قائم ہوسکتا ہے۔

﴿اللہ تعالیٰ کی بردباری اور صبر وتحمل﴾

﴿۲۱﴾ وَعَنْ اَبِی مُوسٰی الْاَشْعَرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَحَدٌ اَصْبَرَ عَلٰی اَذًی یَسْمَعُہُ مِنَ اللّٰہِ یَدْعُونَ لَہُ الْوَلَدَ ثُمَّ یُعَافِیْھِمْ وَیَرْزُقُھُمْ۔ (متفق علیہ)

حوالہ: بخاری شریف صفحہ:۲/۱۰۹۷، باب قول الله تعالیٰ ان الله هو الرزاق الخ، کتاب التوحید، حدیث نمبر:۷۳۷۸، مسلم شریف صفحہ:۲/۲۷، باب ما احد اصبر علی اذی من الله عزوجل، کتاب صفات المنافقین، حدیث نمبر:۲۸۰۴۔

حل لغات: اصبر، اسم تفضیل، صَبَرَ، (ض) صَبراً ہمت سے کام لینا، علی الامر، برداشت سے کام لینا، یعافیهم، عافاه الله معافاة وعفاءً، امراض وآفات سے محفوظ رکھنا۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تکلیف دہ کلمات سن کر اللہ تعالیٰ سے زیادہ صبر کرنے والا کوئی نہیں ہے، لوگ اس کے لئے بیٹا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، پھر بھی وہ ان کو عافیت سے رکھتا ہے اور ان کو رزق عطا کرتا ہے۔

تشریح: وَعَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ مَا أَحَدٌ الخ: اس حدیث شریف میں "ما" کا تعلق 'اصبر' سے ہے اور "یسمعهٗ" کا فاعل ''احدٌ'' ہے۔

مطلب حدیث پاک کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ صبر کرنے والا کوئی نہیں ایسی ایذا پر ایسی بات پر جس کو وہ سنتا ہے کوئی شخص کتنا ہی متحمل مزاج ہو پھر بھی وہ جواب شروع کر ہی دیتا ہے[1]۔

شیخ سعدی صاحبؒ اگر سو گالیاں سن لیں تو سو گالیوں کا ایک گالا سنا ہی دیتے ہیں۔

---

[1] صبر کے معنی ہیں "حبس النفس علی ماتشتهیه او علی ما تکره" یعنی نفس کی پسندیدہ یا ناپسند چیزوں سے رک جانا، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفت کے طور پر جب یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد مستحق عذاب سے عذاب کو مؤخر کرنا ہوتا ہے۔

اذی: مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، اور اسکا موصوف محذوف ہے، اصل عبارت ہے "کلام موذ" (مرقاۃ:۱/۸۴)

واقعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کسی نے گالیاں دیں برا بھلا کہا، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاموش سنتے رہے اور حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسکراتے رہے۔ جب کافی دیر ہوگئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دینا شروع کر دیا، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اٹھ کر چلدئے انہوں نے وجہ پوچھی تو آپ نے جواب دیا کہ جب تک تم خاموش تھے تو فرشتے جواب دے رہے تھے، اور جب تم نے جواب دینا شروع کر دیا تو فرشتے رو کدئے گئے، اور وہ اُٹھکر چلے گئے اس لئے میں بھی اٹھ گیا۔

اور اگر دنیا میں کسی کو برا بھلا کہیں تو وہ تو اس کو سن بھی نہیں سکتا، مگر اللہ تعالیٰ تو سب کچھ سنتا ہے۔

اگر ان کو شمار کیا جاوے تو روزانہ کی لاکھوں کروڑوں گالیاں ہوں، مگر اللہ تعالیٰ کچھ نہیں کہتے، اگر ذرا بھی کچھ کہدیں تو سب ملیا میٹ ہو جائے۔

مگر لوگوں نے کیا کیا کہا؟ کسی نے عزیر ابن اللہ کسی نے مسیح ابن اللہ کسی نے الملائکة بنات اللہ سب نے دیکھا دیکھی کہنا شروع کر دیا۔

واقعہ بنی اسرائیل

بنی اسرائیل چلے جارہے تھے راستے میں لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے اپنے معبودوں کو بغلوں میں دبائے اور گودوں میں لئے بیٹھے ہیں ان کو کھلاتے اور چمکارتے پوجتے اور پچکارتے ہیں، اس منظر کو دیکھ کر کہنے لگے کاش ہمارے معبود بھی ایسے ہی بت ہوتے جن کو ہم چومتے اور پیار کرتے۔

نکتہ نواز بھی نکتہ گیر بھی

اللہ تعالیٰ جس طرح نکتہ نواز ہیں ویسے ہی نکتہ گیر بھی ہیں۔

ایک شخص ایک مرتبہ پان کھا کر راستہ میں چلا جارہا تھا، یہ ہولی کا دن تھا ایک گدھے کو دیکھا تو اس کو تھوک سے رنگ دیا کہ تجھے کسی نے نہیں رنگا؟ اا تجھے میں رنگ دوں پس اسی پر پکڑ ہوگئی۔

تو اللہ میاں نکتہ پکڑ بھی ہیں۔

اگر یہودیوں اور نصرانیوں نے اپنے نبیوں کو ابن اللہ کہا تو بعض مسلمانوں نے بھی اپنے پیروں کو اس سے کچھ کم نہیں کہا اور سمجھا۔

بڑے پیر صاحب کی من گھڑت حکایت

پیر پرستوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ ہمارے بڑے پیر جی کے پاس ایک بڑھیا گئی روتی ہوئی کہ بیٹا مر گیا بڑے پیر جی جارہے تھے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام مل گئے اور مردوں کی ارواح کا تھیلا بھی ان کے پاس تھا اس دن جتنے مرے تھے ان سب کی ارواح اس میں موجود تھیں حضرت پیر نے کہا کہ فلاں بڑھیا کے لڑکے کی روح واپس کردو انہوں نے انکار کیا تو آپس میں جھگڑا ہوگیا، آخر پیر صاحب نے تھیلا چھین کر کھولدیا، سب روحیں اپنے اجسام میں واپس ہوگئیں۔ اور جتنے اس دن مرے تھے سب زندہ ہوگئے۔

حضرت عزرائیل علیہ السلام نے اس واقعہ کی اللہ تعالیٰ سے شکایت کی کہ ایک ایسا ایسا شخص مل گیا تھا جس کے سامنے ہماری بھی کچھ نہ چلی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عزرائیل صبر کرو وہ تو ہم سے بھی جھگڑنے لگتا ہے اس کی بات تو مجھے بھی ماننی پڑتی ہے۔

یہ سب پیر پرستوں کی گھڑی ہوئی بے بنیاد بیہودہ باتیں ہیں۔

تو لوگ اللہ تعالیٰ کو کتنی ایذا پہچانے کا کام کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کچھ نہیں کہتے بلکہ صبر

کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے یہ خطاب کرتے ہیں کہ "اے لوگو! ایسی عادتیں اپنے اندر پیدا کرو" اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا ہے مگر کچھ نہیں کہتا۔

ثم یعافیھم: بلکہ ان سے مضرتوں کو دور کر کے ان کو عافیت دیتا ہے۔

ویرزقھم: اوران کو نفع پہنچانے کے طور پر رزق مرحمت فرماتا ہے۔(مرقاۃ:۱/۸۴)

فائدہ: اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ ایک تو زمانہ اور اہل زمانہ کو برا نہیں کہنا چاہئے، دوسرے اگر کوئی خود کو برا کہے تو اسپر صبر کرنا چاہئے، برداشت کرنا چاہئے، اور اسکو معاف اور درگذر کر کے اسکے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا چاہئے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ لوگوں کی ان کی بے ہودہ باتوں کو سنتا ہے اور درگذر کرتا ہے، نہ کسی کو سزا دیتا ہے نہ کسی کا کھانا یا پانی بند کرتا ہے۔ پس بندوں کو بھی یہ چیزیں اختیار کرنا چاہئے۔ کہ مشقت برداشت کریں، برائی کا بدلہ بھلائی سے دیں، اور تخلق با خلاق اللہ تعالیٰ اختیار کریں۔(مرقاۃ)

﴿کلمۂ توحید جنت کا مستحق بنادیتا ہے﴾

﴿۲۲﴾ وَعَنْ مُعَاذٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ كُنْتُ رِدْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلىٰ حِمَارٍ لَيْسَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ إِلَّا مُؤَخِّرَةُ الرَّحْلِ فَقَالَ يَا مُعَاذُ هَلْ تَدْرِيْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلىٰ عِبَادِهِ وَمَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ؟ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ، قَالَ فَإِنَّ حَقَّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ أَنْ يَعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهِ شَيْئًا، وَحَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ أَنْ لَا يُعَذِّبَ مَنْ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَفَلَا أُبَشِّرُ بِهِ النَّاسَ قَالَ لَا تُبَشِّرْهُمْ فَيَتَّكِلُوْا۔ (متفق علیه)

حوالہ: بخاری شریف:ص۴۰۰/۱،باب اسم الفرس والحمار، کتاب

الجهاد، حدیث نمبر:۲۸۵۶، مسلم شریف:ص ۴۴/۱، بـاب الدلیل علی من مات علی التوحید الخ، کتاب الایمان، حدیث نمبر:۳۰۔

حل لغات: المؤخرة، پچھلا حصہ، اخر تاخیراً، مؤخر ہونا پیچھے ہونا، الشئی پیچھے کرنا، الرحل، کجاوہ، ج اَرْحُلُ وَرِحَال، بشر بکذا، (تفعیل) کسی کو خوش خبری دینا، فیتکلوا، افتعال سے، علی الشیء، بھروسہ کرنا۔

ترجمہ: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے گدھے پر سوار تھا، میرے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف کجاوے کا پچھلا حصہ حائل تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اے معاذ! کیا تم اس بات سے واقف ہو کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر کیا حق ہے، اور بندوں کا اس پر کیا حق ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ اللہ کا بندوں پر یہ حق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور اللہ تعالیٰ پر بندوں کا یہ حق ہے کہ جس نے کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں ٹھہرایا اسے عذاب نہ دے'' میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میں یہ خوشخبری لوگوں کو سنادوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لوگوں کو یہ خوش خبری مت سناؤ، کیوں کہ لوگ اسی پر بھروسہ کرلیں گے''۔

تشریح: عن معاذؓ قال کنت الخ:[1] حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے

---

[1] یہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں جن کی کنیت ابو عبداللہ ہے، قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ ان ستر افراد میں تھے، جو بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک ہوئے، اس وقت آپ کی عمر اٹھارہ سال تھی، بدر اور دیگر تمام غزوات میں شرکت کا شرف آپ کو حاصل ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تھا جس کا قصہ روایات صحیحہ میں مشہور ہے اور حضرت عمر بن الخطابؓ نے ابو عبیدہ بن الجراحؓ کے بعد شام کا عامل بنایا تھا، لیکن اسی سال شام میں طاعون کی وبا پھیلی، جو تاریخ میں طاعون عمواس کے نام سے مشہور ہے، اسی زمانہ میں ۱۸ھ میں بعمر ۳۸ر سال وفات پائی۔ آپ سے حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی جماعت نے روایت کی ہے۔ (اکمال:۶۱۶)

مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ردیف تھا گدھے پر۔

ردیف کہتے ہیں پیچھے بیٹھنے والے کو۔[۱]

سواری کا ادب

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ اپنے سے بڑے کو آگے جگہ دے اور کم درجہ والے پیچھے بیٹھیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جب سفر میں جاؤ تو کسی ساتھی کو ساتھ لے لو، اور اسے اپنی سواری پر ہی سوار کر لو یہ نہیں کہ وہ تو پیدل ہو، اور آپ سوار ہوں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم از حد متواضع تھے، یہاں تک کہ گدھے پر بیٹھنے کو برا نہ سمجھتے تھے۔

جب کہ آپ کے واسطے براق بھی تیار تھا، اور جو چاہتے تیار ہو جاتا، مگر پھر بھی گدھے پر سوار ہوئے۔

مُؤْخِرہ، مُؤَخَّرہ، مُؤَخِّرہ، باب افعال سے اسم فاعل اور باب تفعیل سے اسم فاعل و مفعول تینوں طرح پڑھ سکتے ہیں، فرمایا کہ ہم دونوں میں صرف معمولی سا فرق تھا، زین کی لکڑی کا۔

استاذ کا اظہار حقیقت

فائدہ: تو معلوم ہوا کہ شاگردوں سے جب کلام کرو تو انہیں بتلا دو کہ جتنا میں جانتا ہوں استاد کو دوسرا نہیں جانتا، اور جتنا قریب سے میں نے سنا ہے کسی نے نہیں سنا اور یہ اظہار حقیقت ہے۔ اور یہاں ردیف ہونے اور لیس بینی وبینہ سے انتہائی قرب ظاہر

---

[۱] امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ "رِدْف" را کے کسرہ، دال کے سکون کے ساتھ اور بغیر یا کے بھی روایت کیا گیا ہے اور روایت میں "رَدِیف" را کے زبر دال کے کسرہ اور یا کے ساتھ بھی ہے دونوں کے معنی ایک ہیں اور دونوں روایۃً و معنیً درست ہیں۔ (قرطبی ۲: ۳۰۲/۱)

کرنے سے غرض یہی ہے کہ مجھے قصہ اچھی طرح یاد ہے تاکہ سامع کے نفس میں اوقع ہو اور وہ بھی اس کو ضبط کرے۔ (مرقاۃ، تنظیم)

اور اگر متواضع بن کر کہدے کہ میں بھی تم جیسا ہوں کچھ نہیں جانتا مجھے کچھ نہیں آتا، میں نے تو یوں ہی عمر برباد کی ہے تو اس کے پاس کوئی نہیں آئیگا۔ کہ جب اسے کچھ آتا ہی نہیں تو اس کے پاس کیوں جائیں۔

حقیقت کبر

کبر تو دوسرے کو حقیر سمجھنا ہے اور یہاں اظہار حقیقت ہے۔

جیسے اگر کوئی مرد کہے کہ میں مرد ہوں تو یہ کبر نہیں، اظہار حقیقت ہے۔

تو شاگردوں سے کہہ دو کہ جتنا میں جانتا ہوں اتنا کوئی نہیں جانتا جتنا قریب سے میں نے سنا ہے کسی نے نہیں سنا۔

وجہ دوم: **لیس بینی و بینہ الا الخ**: کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ باب محبت کے قبیل سے ہے کہ محبوب کے قرب کو ذکر کرنے سے بھی لذت حاصل ہوتی ہے، اس لئے اس قرب اور ہیئت کو ذکر کرنے سے مقصود لذت تازہ کرنا ہے۔

تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

ندا کی وجہ

یا معاذ الخ: حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ندا دی تاکہ حدیث کی اہمیت ظاہر ہو جائے، اور حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ کو پورا پورا متیقظ ہو جائے۔ اور کامل طور پر متوجہ ہو جائیں تاکہ جو بات بیان کیجا رہی ہے اس کو اچھی طرح سمجھ لیں، اور محفوظ کر لیں۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا حق

بندوں پر اور اللہ تعالیٰ پر بندوں کا حق کیا ہے؟

معلوم ہوا کہ پہلے مخاطب کو اپنی طرف متوجہ کرلو، پھر کلام کرو۔ یہ سوال فرمانے کا منشاء بھی یہی تھا کہ کامل طور پر متوجہ ہوں اور اس پر غور کریں۔

آج کل طلباء کو متوجہ تو کرتے نہیں اور شکایتیں کرتے پھرتے ہیں کہ سنتے ہی نہیں، شاگردوں کو اپنی طرف متوجہ تو کریں۔

رہا نفسانیات کا پہچاننا تو یہ استاد پر موقوف ہے، استاد نفسیات کو سمجھیں اور جیسی جس کی طبیعت ہو ویسا ہی عمل کریں[1]۔

حضرت معاذؓ نے عرض کیا کہ اللہ اور اللہ کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اپنے سے اعلم کے نزدیک جب تم ہو تو چپ رہو جواب دینے کی کوشش نہ کرو، اگر کچھ معلوم بھی ہو تو پہلے کچھ انتظار کرو کہ اعلم کی طرف سے بیان ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ اس کے ساتھ شرک نہ کریں، شریک نہ ٹھیرائیں اور اس کی عبادت کریں[2]۔

---

[1] علامہ زمخشریؒ فرماتے ہیں کہ درایت نام ہے اس معرفت کا جو کسی قسم کے دھوکے سے حاصل ہو اسی وجہ سے درایت کے ساتھ ذات باری کو متصف نہیں کیا جاتا۔

نیز معرفت کے معنی میں بھی جہل کے سابق ہونے کا تقاضہ ہے اس لئے اصل یہ ہے کہ معرفت کے ساتھ بھی ذات باری کو متصف نہ کیا جائے۔ برخلاف علم کے کہ اس میں یہ دونوں ہی باتیں نہیں پائی جاتیں۔ (مرقاۃ:۱/۸۴)

[2] حق۔ باطل کی نقیض ہے کیونکہ حق ثابت ہوتا ہے اور باطل زائل ہونے کے لئے ہوتا ہے، اور حق کبھی واجب، لائق اور مناسب وغیرہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔لہذا "حق اللہ تعالیٰ" میں حق واجب اور لازم کے معنی میں ہے۔اور "حق العباد" میں حق لائق اور مناسب کے معنی میں ہے کیونکہ جس نے شرک نہیں کیا تو خدمت خداوندی میں بطور احسان مناسب یہ ہے کہ اس کو عذاب نہ دے۔ (طیبی:۱/۱۵۲)

علامہ قرطبیؒ کی رائے یہ ہے کہ "حق العباد" میں حق سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ثواب وجزا کے متعلق جو وعدہ کیا وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ صدق اور قول حق کی بناپر واجب وحق ہوگیا۔اور چونکہ اللہ تعالیٰ سے اوپر کوئی چیز نہیں ہے اسی وجہ سے امراً یا عقلاً اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہوتی۔ (قرطبی:۱/۲۰۳)

اور بندوں کا حق اللہ تعالیٰ پر یہ ہے کہ شرک نہ کرنے والوں کی مغفرت کردے، اور ان کو عذاب نہ دے۔

اشکال: اس پر اشکال یہ ہے کہ احادیث صحیحہ بلکہ متواترہ سے یہ امر ثابت ہے کہ نافرمان مسلمانوں کی ایک جماعت کو جہنم میں عذاب دیا جائیگا، اور یہاں پر غیر مشرک سے عذاب کی نفی ہے، لہٰذا دونوں روایات میں تعارض ہے۔

جواب: ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ یہاں عذاب مخلد ومؤبد کی نفی ہے، کہ ہمیشہ ہمیش جہنم میں وہ نہیں رہیں گے، (کیوں کہ مومنین کا جہنم میں جانا بغرض تطہیر ہے نہ کہ بغرض تعذیب۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جنت ایک نورانی جگہ ہے اس میں نورانی اور پاکیزہ چیز ہی جاسکتی ہے، اور گناہوں کے نتیجہ میں مؤمن میلا کچیلا ہوجاتا ہے، تو جہنم کی بھٹی میں داخل کرکے اولاً اس کے میل کو ختم کیا جاتا ہے تاکہ وہ نورانی جگہ میں داخلہ کا اہل ہوسکے۔ (مرقاۃ: ١/٨٤)

انہوں نے سوچا کہ یہ تو بڑا مفت سودا ہے، بڑا سستہ نسخہ ہے، مل گیا تو کیا اس کی خبر لوگوں کو نہ دیدوں؟ ارشاد فرمایا کہ نہیں لوگ اسی پر تکیہ کرکے بیٹھ جائیں گے۔

اور یہ ایسا ہی ہے جیسے حضرت جی نے کہا ہے کہ بس جھگڑا نہ کی جیو اور جو چاہے کرو اور اب طلبہ بیٹھے ہیں ٹانگ پر ٹانگ رکھے کہا کہ بھائی گھنٹہ ہوگیا سبق پڑھ لو نہ جی حضرت جی نے کہا دیا ہے کہ جو چاہو کرو مگر جھگڑا نہ کی جیو۔

حالانکہ اس سے منشاء یہ نہیں تھا کہ نماز بھی نہ پڑھنا سبق بھی نہ پڑھنا۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خبر نہ دیجیو، لوگ اس کی تفصیل اور حقیقت کو تو سمجھیں گے نہیں، اور صرف اسی پر تکیہ بھروسہ کریں گے، اس لئے اس کی خبر نہ دینا۔

اللہ تعالیٰ پر حق اس وجہ سے ہے کہ اس نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔

یہ نہیں کہ کسی دوسرے نے اس پر واجب اور ضروری کر دیا ہے بلکہ اس نے خود ہی اپنے اوپر یہ بات لازم کر لی کہ وہ غیر مشرک کو عذاب نہ دیگا۔

اس پر اشکال یہ ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دینے کو منع کیا تھا تو حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ روایت کیوں بیان فرمائی؟

اس کا جواب آئندہ حدیث میں آ رہا ہے۔

اشکال مع جوابات

قولہ حق العباد علی اللہ الخ: اس جملہ سے ظاہر افلاسفہ کی تائید ہو رہی ہے کہ ان کے نزدیک اطاعت گذاروں کو ثواب دینا اور گنہگاروں کو عذاب دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔ مگر اہل سنت والجماعت کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے وہ مختار کل ہے۔ ''فعال لما یرید'' تو اس جملہ کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں۔

(۱)......حق کے بہت معانی ہیں۔ ثابت، واجب ولازم، لائق، شایانِ شان، ملک، نصیب۔ تو مقام کا لحاظ کر کے الگ الگ معنی مراد لئے جائیں گے تو حق اللہ علی العباد میں حق بمعنی لازم وواجب کے لئے جائیں گے۔ اور حق العباد علی اللہ میں حق بمعنی لائق وشایانِ شان لئے جائیں گے کہ شان خداوندی کے لائق یہی ہے کہ غیر مشرک کو عذاب نہ دے۔

(۲)......دوسری توجیہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر پورا یقین واعتماد تھا۔ اسی اعتماد کا اظہار آپ نے اس جملہ سے کیا۔

(۳)......تیسری توجیہ یہ ہے کہ اگر چہ اللہ پر کسی کی طرف سے کچھ واجب نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے بطور احسان اپنے اوپر لازم کر لیا جس کو وجوب احسانی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس

سے مجبوری لازم نہیں ہوتی۔

(۴)...... چوتھی توجیہ یہ ہے کہ یہاں لفظ حق مشاکلۃً ذکر کیا گیا کہ پہلے میں جیسا لفظ استعمال کیا گیا تو دوسرے میں بھی وہی لفظ استعمال کیا گیا گرچہ معنی وہ نہیں ہے۔اور کلام عرب میں ایسا استعمال بہت ہے۔(مرقاۃ)

﴿جہنم سے نجات کی ضمانت﴾

﴿۲۳﴾ وَعَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمُعَاذٌ رَدِیْفُہٗ عَلَی الرَّحْلِ قَالَ یَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! وَسَعْدَیْکَ، قَالَ یَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! وَسَعْدَیْکَ، قَالَ یَامُعَاذُ قَالَ لَبَّیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! وَسَعْدَیْکَ ثَلاثاً قَالَ مَامِنْ اَحَدٍ یَشْھَدُ اَنْ لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰہِ صِدْقاً مِنْ قَلْبِہٖ اِلَّا حَرَّمَہُ اللّٰہُ عَلَی النَّارِ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَفَلَا اُخْبِرُ بِہِ النَّاسَ فَیَسْتَبْشِرُوْا قَالَ اِذاً یَتَّکِلُوْا فَاَخْبَرَ بِھَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِہٖ تَاَثُّماً۔ (متفق علیہ)

حوالہ: بخاری شریف:ص ۲۴/۱، باب من خص بالعلم قوماً، کتاب العلم، حدیث نمبر:۱۲۸، مسلم شریف:ص ۴۴/۱، حدیث نمبر:۳۲، باب الدلیل علی من مات الخ، کتاب الایمان.

حل لغات: **لبیک**، اقامۃ اور حضور کے معنی میں ہے اس کو برائے تاکید معنی تثنی بنا کر کاف ضمیر خطاب کی طرف مضاف کیا ہے، یعنی میں ایک دفعہ نہیں دو دفعہ حاضر ہوں۔ **سعدیک**، یہ بھی لبیک کی طرح ہے، سعد کے معنی خوش بختی کے ہیں۔ **تـأثما**، تفعل سے گناہ سے بچنا، ھو یتأثم من الصغائر، وہ صغائر سے بچتا ہے۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت نبی کریم صلی

اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس وقت جبکہ سواری پر سوار تھے اور حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، فرمایا اے معاذ! انہوں نے عرض کیا حاضر ہوں یا رسول اللہ! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ارشاد فرمایا: اے معاذ! معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ حاضر ہوں اے اللہ کے رسول! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ارشاد فرمایا: اے معاذ! معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ حاضر ہوں اے اللہ کے رسول! آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تین مرتبہ مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا جو بندہ سچے دل سے اس بات کی گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، تو اس پر اللہ تعالیٰ دوزخ کی آگ حرام کر دیتا ہے، حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کیا میں اس خوشخبری سے لوگوں کو آگاہ کر دوں، آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں لوگ اس پر بھروسہ کر لیں گے۔ پس حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس حدیث کو بیان کیا اپنی موت کے وقت کتمان علم کے گناہ سے بچنے کے لئے۔

تشریح: عن انس و معاذ الخ: ان النبی اس میں النبی ان کا اسم ہے، اور قال یامعاذ اس کی خبر و معاذ ردیفه علی الرحل میں واو حالیہ ہے اور یہ پورا جملہ حال ہے، جملہ معترضہ کے طور پر واقع ہے۔

یامعاذ: یا حرف نداء ہے اور معاذ منادیٰ ہے۔

اشکال: یا حرف ندا بعید کے لئے آتا ہے، مگر یہاں قریب کے لئے استعمال کیا گیا ہے چونکہ آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے تو قریب ہی تھے حضرت معاذؓ؟

جواب اول: اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ حروف ندا باہم ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو جاتے ہیں۔

جواب ثانی: یہ ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ جسم کے اعتبار سے تو آنحضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قریب تھے، مگر ذہن کے اعتبار سے دور تھے اس لئے حرف نداء برائے بعید استعمال کیا۔

جواب ثالث: حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ذہناً بھی قریب ہی تھے مگر قریب ہونا بھی تو کلی مشکک ہے یعنی جس قدر قریب حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دیکھنا چاہتے تھے، اس قدر قریب نہ تھے۔

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ حد درجہ قریب ہوں تا کہ فیضانِ ربی کے اچھی طرح مستحق ہوں۔

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں عرض کیا کہ **لَبَّیْکَ وَسَعْدَیْکَ.**

لبیک یہ نون کے ساتھ "**لبینک**" تھا، نون کو گرا دیا، اس کا فعل عامل "**اجبت**" پہلے ہی حذف کر دیا تھا تو اب صرف "**لبیک**" رہ گیا۔

اور اسی طرح "**سعدیک**" بھی ہے وہ بھی تثنیہ تھا نون کو گرا دیا اور اس کا فعل پہلے ہی حذف کر دیا گیا تھا۔[1]

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پھر فرمایا یا معاذؓ! آپ جس قدر قریب آپ کو دیکھنا چاہتے تھے اس قدر قریب نہ تھے۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کو اپنے قلب کے بالکل

---

[1] علامہ رضیؒ کافیہ کی شرح میں مفعول مطلق کے بیان میں تحریر فرماتے ہیں کہ تثنیہ اگر مفعول مطلق ہو تو اس کے فعل کو حذف کرنا واجب ہوتا ہے چاہے وہ تکریر کیلئے ہو یا غیر تکریر لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ اس کی اضافت فاعل یا مفعول کی جانب ہو۔ اور امام سیبویہؒ فرماتے ہیں کہ "لبیک" تثنیہ ہے۔ اور اس کی اصل "الب لک البابین" ہے اولاً فعل "الب" کو حذف کیا گیا۔ اور مصدر "البابین" کو اس کا قائم مقام بنادیا گیا اور زوائد کو حذف کر کے ثلاثی مجرد کی جانب لوٹا دیا پھر "لک" کے حرف جر کو حذف کر کے اس کی جانب اضافت کر دی گئی۔

اور سعدیک کا معاملہ بھی لبیک کی طرح ہے فرق صرف یہ ہے کہ الب متعدی باللام ہے اور سعدیک متعدی بنفسہ ہے۔ (رضی: ۲۹۴-۱/۲۹۵)

قریب دیکھنا چاہتے، اس لئے تین مرتبہ یہی ارشاد فرمایا تا کہ معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دل آپ کے قلب مبارک سے ملجائے اور وہ علم جو آپ کے قلب مبارک پر آنیوالا تھا وہ معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل میں پوری طرح سے اتر سکے۔

قال ثلثا. ثلثا اس وجہ سے بڑھادیا کہ حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تین مرتبہ پکارا اور تینوں مرتبہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا۔ کہیں ایسا نہو کہ کاتب کی غلطی سے صرف دو مرتبہ ہی لکھا جائے اس وجہ سے ثلثا کہدیا۔

یہ طریق تعلیم تھا کہ پہلے دل سے دل ملاؤ تب فیضان علم ہوگا۔ اب دل تو ملاتے نہیں اور شکایتیں کرتے پھرتے ہیں۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بھی ایسا نہیں جو گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور یہ شہادت ناشی عن القلب ہو یہ نہیں کہ صرف زبان سے کہ صرف زبان سے تو گواہی دے، مگر دل اس کے خلاف ہے یہ شہادت معتبر نہیں کیونکہ ایسی شہادت تو منافقین بھی دیدیتے تھے۔

من قلبہ: کے سلسلہ میں دو احتمال ہیں۔ (۱) اس کا تعلق صدق سے ہو۔ (۲) اس کا تعلق شہادت سے ہو۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ زبان سے گواہی دے اور دل سے اس کی تصدیق کرے۔ دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ قلب سے شہادت دے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ پہلا مطلب مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔ (فتح الباری: ۱/۳۰۵، حدیث نمبر: ۱۲۸)

شھادۃ وہ مطلوب ہے جو **ناشی عن القلب** ہو۔ جو ایسی شہادت دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم پر حرام کردیتے ہیں، یعنی وہ جہنم میں نہ جائیگا۔

یہ تھوڑی بڑی بات ہے؟ سب مسلمانوں کی جدوجہد اسی واسطے ہوتی ہے یہ سب

یہاں مدرسہ میں اسی واسطے تو ہیں، ڈپٹی کلکٹر اور ڈاکٹر بننے کے لئے تو یہاں کوئی نہیں آتا۔

اشکال مع جوابات

ظاہراً اس سے مرجیہ کی تائید ہورہی ہے جو کہ کہتے ہیں "**لاتضر المعصیة مع الایمان**" اور اہل سنت والجماعت کے خلاف ہورہی ہے تو اس کے بہت سے جوابات دیئے گئے جن میں سے چند اہم جوابات ذکر کئے جاتے ہیں۔

(۱)...... **شہادت مع اداء جمیع حقوق** مراد ہے۔ جیسا کہ کسی نے شادی کے وقت فقط **قبلتھا** کہا تو اس سے مراد اس کے جمیع حقوق کی ادائیگی بھی مراد ہوتی ہے۔

(۲)...... وہ نار حرام ہے جو کفار کے لئے تیار ہے اور ظاہر ہے کہ عصاۃ مومنین کو کفار جیسا شدید عذاب نہیں دیا جائے گا۔

(۳)...... خلود فی النار کی تحریم مراد ہے، مطلق نار کی تحریم مراد نہیں۔

(۴)...... حضرت سعید بن المسیب وغیرہ علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ یہ حدیث اس زمانہ میں تھی جبکہ فقط ایمان باللہ والرسول فرض تھا، دوسرے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔

(۵)...... امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا محمل ایسا شخص ہے جو ابھی کفر سے توبہ کر کے ایمان لایا اور فرائض ادا کرنے کی فرصت ملنے سے پہلے ہی انتقال ہوگیا۔

(۶)...... سب سے اچھی توجیہ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمائی کہ اس حدیث میں کلمہ شہادت کی خاصیت بیان کرنا مقصود ہے۔ اس سے نار حرام ہوجاتی ہے۔ مگر خاصیت کا اثر ظاہر ہونے کی شرط یہ ہے کہ دوسری اشیاء سے یہ مغلوب نہ ہو۔ اگر گناہ سے مغلوب ہوجائے تو یہ نہیں کہا جائیگا کہ تحریم نار کلمۂ شہادت کی خاصیت نہیں ہے، جیسا کہ زہر کی خاصیت قتل ہے۔ اگر دوسرے موانع کی بناء پر زہر استعمال کرنے کے باوجود نہ مرے

تو یہ نہیں کہا جائیگا کہ مر جانا زہر کی خاصیت نہیں ہے۔ (مرقاۃ)

اس کی مثال یہ ہے کہ اطباء نے مفردات کی تاثیریں لکھی ہیں، مثلاً یہ لکھا ہے کہ گل بنفشہ کی تاثیر یہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر گل بنفشہ تنہا استعمال کیا گیا اور اس کی تاثیر میں کوئی مانع پیش نہ آیا لیکن جب اس گل بنفشہ کو کسی معجون مرکب میں استعمال کیا جائے تو ضروری نہیں کہ اس کی تاثیر وہی رہے، دوسری چیزوں کے ملنے کے بعد تیز بھی ہوسکتی ہے کم بھی ہوسکتی ہے یہی مطلب ان حدیثوں کا ہے کہ اگر کسی میں اعتقاد کلمہ ہو اس کے ساتھ نہ طاعت ہو نہ معصیت ہو تو یہ کلمہ سیدھا جنت میں پہونچائے گا، اور اگر کلمہ کے ساتھ طاعات جمع ہو گئیں، معصیت نہ ہوئیں، تو اس کی تاثیر اور بھی تیز ہو جائے گی، اور اگر اعتقاد کلمہ کے ساتھ معاصی جمع ہو گئے تو اس کی تاثیر میں کمی ہوسکتی ہے اس لئے کہ معصیت اس کی تاثیر میں مانع ہے۔ (اشرف التوضیح)

(۷)......شرک سے بچنے والے کو اگر دخول فی النار ہوا تو وہ تعذیب کے لئے نہ ہوگا، بلکہ تطہیر کے لئے ہوگا، جیسا کہ میلے کچیلے کپڑے کو تیز گرم پانی سے دھو لیتے ہیں میل کچیل دور کرنے کے لئے تا کہ پھر ان کو پہن کر شادی میں ولیمہ میں جا سکیں اسی طرح بدعمل مومن اگر جہنم میں جائیں گے تو اس لئے تا کہ پاک و صاف ہو کر جنت میں داخل ہو سکیں، برخلاف کافر کے کہ اس کا دخول فی النار تعذیب کیلئے ہوگا۔ (اشرف التوضیح)

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوچا کہ یہ تو بڑا اچھا نسخہ ہے اور خوشی سے پوچھا کہ اس کی خبر لوگوں کو دیدوں؟

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: "اذاً یتکلو ای اذاً اخبرت به یتکلو" کہ جب تم اس کی خبر دیدو گے تو لوگ تکیہ لگالیں گے۔

ہر مسئلہ ہر کسی کے لئے نہیں ہوتا

معلوم ہوا کہ ہر مسئلہ ہر کسی کے واسطے نہیں ہوتا، شریعت کا مجموعہ گرچہ پوری امت کے

لئے ہے، مگر ہر مسئلہ ہر کسی کے واسطے نہیں جس طرح مخلوق کی سب چیزیں انسانوں کے لئے ہیں مگر ہر چیز سب کے واسطے نہیں ہے۔

ورنہ اس صورت میں تو یہ ہوگا کہ بلی پکڑو اور کھا جاؤ، چوہا پکڑو اور کھا جاؤ، سانپ پکڑو اور کھا جاؤ، نہ کسی چیز کا طریقہ دیکھو اور نہ کچھ خیال کرو، حالانکہ ایسا نہیں۔

تو معلوم ہوا کہ جس طرح مخلوق کی ہر چیز ہر کسی کے واسطے نہیں، ایسے ہی ہر مسئلہ ہر انسان کے واسطے نہیں ہوتا۔

اسی واسطے آپ نے منع فرمادیا کہ لوگ اس کے تقاضوں کو پورا کریں گے نہیں، بلکہ اس کے اجمال پر ہی عمل کریں گے اور تفصیل کے پیچھے نہ پڑیں گے۔

حالانکہ تفصیل اور تقاضوں کو پورا کرنا ضروری ہے، اس وجہ سے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوری عمر کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا مگر وفات کے وقت کتمان علم کے گناہ سے بچنے کے لئے لوگوں کو یہ حدیث شریف پہنچادی۔

اشکال: اگر کوئی کہے کہ آج تو یہ حدیث عام ہوگئی اس لئے سب اسی پر اکتفا کرلیں گے، اس لئے اس کو ذکر نہیں کرنا چاہئے تھا۔

جواب: (۱)......اس اشکال کا یہ ہے کہ اس وقت علم اجمالی تھا، تفصیلی نہ تھا، اس لئے لوگ صرف اس پر اکتفا کرلیتے۔ مگر آج چونکہ علم تفصیلی ہوگیا اور جب کسی کے پاس اس کا علم پہنچتا ہے تو تفصیلی ہی پہنچتا ہے، اس لئے اس کے تقاضوں پر عمل کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے وہ احتمال ختم ہوگیا۔

(۲)......نیز حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سمجھا کہ نہی تنزیہی ہے۔

(۳)......تحریمی نہیں ہے اور یہ کہ نہی بقید اتکال کے ساتھ مقید ہے اور جب یہ دیکھا کہ اب اتکال کی کیفیت نہیں رہی تو جب قید زائل ہوگئی تو مقید بھی زائل ہوگیا یعنی کسی کو خبر نہ

دینے کا حکم رفع ہو گیا۔

(۴)...... یا ممانعت عام لوگوں کیلئے تھی اور بیان کیا خاص لوگوں کیلئے۔ (فتح الباری:٢٠٦-١/١٢٨)

(۵)...... یا یہ ممانعت وجوب تبلیغ اور کتمان علم پر وعید سے قبل تھی لیکن جب تبلیغ واجب قرار پائی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا "بلغوا عنی ولو آیة" اور اللہ تعالیٰ نے فرمادیا: "لاتکتمونه" اور کتمان علم پر وعید آئی۔ "من کتم علما الجم یوم القیامة بلجام من النار" تب معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خبر دیدی ورنہ گنہگار ہونے کا خوف تھا اور تاثماً بھی اسی پر دال ہے۔ (تنظیم الاشتات:١/٦٢)

(٦)...... موت کے وقت سنانے سے مقصد موت کے وقت کلمہ شہادت کی فضیلت حاصل کرنا تھا، تاکہ یہ فضیلت بھی حاصل ہو جائے اور آخری دم تک تعلیم وتعلم جاری رکھنے کی سعادت بھی نصیب ہو جائے جیسا کہ بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور اکابر امت نے آخری وقت میں اس حدیث کو سنانے کا اہتمام کیا، جیسا کہ حضرت ابو زرعہؒ نے سند کے ساتھ اس حدیث کو بیان کیا اور ابھی "لا اله الا الله" کہنے پائے تھے حدیث کا اگلا جملہ باقی تھا کہ روح پرواز کر گئی گویا ادخل الجنة. (جواب شرط) کا بھی مظاہرہ ہو گیا۔ (اشرف التوضیح)

﴿مرتکب کبائر مومن کا حکم﴾

﴿۲۴﴾ وَعَنْ اَبِی ذَرٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعَلَیْہِ ثَوْبٌ اَبْیَضُ وَھُوَ نَائِمٌ ثُمَّ اَتَیْتُہٗ وَقَدْ اِسْتَیْقَظَ فَقَالَ مَامِنْ عَبْدٍ قَالَ لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰی ذٰلِکَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّۃَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ

قَالَ وَاِنْ زَنیٰ وَاِنْ سَرَقَ، قُلْتُ وَاِنْ زَنیٰ وَاِنْ سَرَقَ قَالَ وَاِنْ زَنیٰ وَاِنْ سَرَقَ قُلْتُ وَاِنْ زَنیٰ وَاِنْ سَرَقَ قَالَ وَاِنْ زَنیٰ وَاِنْ سَرَقَ عَلیٰ رَغْمِ اَنْفِ اَبِی ذَرٍّ، وَکَانَ اَبُوذَرٍّ اِذَا حَدَّثَ بِھٰذَا قَالَ وَاِنْ رَغِمَ اَنْفُ اَبِی ذَرٍّ۔ (متفق علیہ)

حوالہ: بخاری شریف:۲/۸۶۶،باب الثیاب البیض، کتاب اللباس، حدیث نمبر:۵۸۲۷، مسلم شریف:۱/۶۶، حدیث نمبر:۹۴، باب من مات لایشرک باللہ الخ، کتاب الایمان.

حل لغات: رَغِمَ، (س) رَغماً مٹی سے لگ جانا، ذلیل ہونا، رَغِمَ اَنْفُ فلان کے بھی یہی معنی ہیں۔ استیقظ من نومہ، (استفعال) جاگ جانا۔

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفید کپڑا اوڑھے ہوئے سو رہے تھے، پھر دوبارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس وقت آیا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہو چکے تھے، آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے صدق دل سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اعتراف کیا پھر اسی عقیدہ پر وہ فوت ہوا تو وہ جنت میں جائیگا۔ میں نے عرض کیا کہ اگر چہ اس نے چوری اور زنا کا ارتکاب کیا ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں خواہ وہ چوری اور زنا کا مرتکب کیوں نہ ہو، میں نے پھر عرض کیا اگر چہ اس نے چوری اور زنا کا ارتکاب کیا ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں خواہ وہ چوری اور زنا کا مرتکب کیوں نہ ہو، اور خواہ ابوذر کی ناک خاک آلود ہو، جب بھی ابوذرؓ یہ حدیث روایت کرتے تو "یہ جملہ خواہ ابوذر کی ناک خاک آلود ہو" ضرور نقل کرتے۔

تشریح: وعن ابی ذر[1] الخ: حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ زاہد زمانہ

[1] **ابوذر:** آپ کنیت سے مشہور ہیں اور اسم مبارک جندب بن جنادہ ہے قبیلہ غفار کی جانب نسبت کرتے ہوئے غفاری کہلاتے ہیں۔ قدیم الاسلام ہیں مکہ میں آپکا اسلام لانا ثابت ہے..... (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تھے دنیا کی کوئی رغبت نہ تھی اگر کسی کے پاس اتنا مال ہو جاتا جس پر زکوۃ واجب ہو جاتی ہے تو آپ اس کے پاس ڈنڈالیکر جاتے اور فرماتے کہ اتنا مال ہی کیوں جمع کیا کہ زکوۃ واجب ہوئی، پھر آپ کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ طیبہ سے قریب ربذہ مقام پر بھیجدیا، وہیں پوری زندگی گذاری۔ وہیں وفات پائی۔

توانہوں نے فرمایا کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور ان پر سفید چادر تھی۔

سوال: یہاں سفید چادر کا ذکر کیوں کیا؟

جواب: یہ محبت کی علامت ہے اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے کہ جب انسان سے کسی کو محبت ہو جاتی ہے تو وہ اس کے پورے خدوخال کا نقشہ کھینچتا ہے[1]۔ اور اس سے لذت حاصل کرتا ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو جواب دیا تھا: "**ھی عصای اتوکؤ علیھا واھش بھا علی غنمی ولی فیھا مآرب اخریٰ**"

اگر چہ آپ کا جواب **عصای** سے پورا ہو جاتا، مگر آپ نے **ھی** بھی ذکر کیا اور **اتوکؤ** اور **اھش بھا** بھی۔

مگر چونکہ مخاطب اللہ تعالیٰ تھے اس لئے آپ پر خشیت طاری ہوگئی مگر پھر بھی اجمال کردیا کہ **ولی فیھا مآرب اخریٰ** کہ اس میں میرے لئے اور بھی دوسرے فائدے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)......حتی کہ ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ آپ اسلام لانے والوں میں پانچویں نمبر پر ہیں اس کے بعد واپس اپنی قوم میں چلے گئے تھے اور جنگ خندق کے بعد مدینہ طیبہ تشریف لائے تھے، آپ بڑے عابد وزاہد تھے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں مقام ربذہ میں مقیم تھے اور وہیں ۳۲ھ میں وفات ہوئی۔ حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی جماعت آپ سے روایت کرتی ہے۔ (اکمال: ۵۹۴)

[1] یہی رائے ہے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی، اور حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس سے صرف قصہ کا استحضار اور اتقان مقصود ہے۔ (تنظیم الاشتات: ۶۴/۱، فتح الباری: ۴۶۱/۱۱/۵۸۲۷)

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس وقت لیٹے ہوئے تھے اس لئے میں واپس چلا گیا تھا۔

دوسروں کی رعایت

فائدہ(۱): اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں کے فوائد کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ یہ نہیں کہ دوسروں کو خواہ تکلیف ہی ہو مگر ہمیں اپنے کام سے کام۔ کہ سوتے ہوئے کو بھی اٹھا دیتے ہیں۔ پس چاہئے کہ طلباء اپنے اساتذہ اور طالبین وسالکین اپنے مشائخ کے اوقات مشاغل کی رعایت کرتے ہوئے استفادہ کریں۔

پھر دوسرے وقت تشریف لائے کیونکہ آپ کی ملاقات سے وہ مستغنی کب ہو سکتے تھے۔ اب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہو چکے تھے۔

تعلق کا لحاظ

فائدہ(۲): اس سے معلوم ہوا کہ تعلق کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے کہ ہمارا ان کے ساتھ کس درجہ کا تعلق ہے، بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے آنے سے انسان سونے لگتا ہے۔ اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ آ کر سوتے کو اٹھا دے تو وہ اسے ہی غنیمت سمجھیں کہ بہت اچھا کیا آپ نے مجھے اٹھا دیا تو انسان کو اپنے تعلق کا بھی خیال کرنا چاہئے، حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے تعلق کے درجہ کو سمجھتے تھے اس وجہ سے بیدار ہوتے ہی آپ کے پاس چلے گئے۔

ادھر علم آ ہی رہا تھا، نزول ہو ہی رہا تھا ضرورت تھی کہ کوئی طالب علم ہو کوئی پریس ہو، جس کے پاس سادہ لوح ہو اور اس پر یہ چھپ جائے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہنچ گئے سادہ لوح صاف کاغذ لئے ہوئے۔ صاف ذہن صاف دل لئے ہوئے اور دل میں طلب لئے ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم استاد تھے اور یہ شاگرد۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو انسان **لا الـٰہ الا اللہ** کہے اور اس پر قائم رہے اور مر جائے تو وہ داخل جنت ہوگا۔

ثـــم: ترتیب مع التراخی کے لئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ وفات تک ایمان پر جما رہے، اور اس جملہ سے احتراز ہوگیا اس شخص سے جو مرتد ہو جائے اور پھر حالت ارتداد میں ہی اس کی موت ہو جائے کیونکہ اس کا ایمان سابق اس کی نجات کا ذریعہ نہ ہوگا۔ (مرقاۃ:۸۶/۱، طیبی:۱/۱۵۲)

اور یہاں پر توحید میں ایمان بالرسالۃ اور دیگر احکام شرعیہ بھی داخل ہیں، کیونکہ یہ کلمہ تو ایک اجمالی عنوان ہے جس کے ماتحت تمام احکام داخل ہیں اور حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے بعض طرق میں اس کی تصریح بھی ہے کہ ایمان کے ساتھ اقامتِ صلوۃ اور صیام رمضان وغیرہ بھی ہیں۔ روی احمد عن معاذ مرفوعا "**من لقی اللہ لایشرک بہ شیئا ویصلی الخمس ویصوم رمضان......**"

لیکن چونکہ یہ قیود مخفی تھیں اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے علی الاعلان اس کی تبلیغ کو منع فرما دیا تھا۔ (تنظیم الاشتات مختصرا:۱/۶۴)

اور چونکہ حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گونگے طالب علم نہ تھے۔ بلکہ بولنے والے تھے جب صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے پاس علم پہنچتا تو غور وخوض کرتے اسی وجہ سے حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے طالب علمانہ سوال کیا کہ چاہے وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پامال کرتا ہو چوری کرتا ہو اور زنا کرتا ہو۔ (چوری حق العبد ہے۔ اور زنا حق اللہ ہے)

پھر بھی صرف کلمہ پڑھنے کی وجہ سے جنت میں داخل ہو جائیگا۔

زنا کی تعریف: کہتے ہیں غیر منکوحہ سے منکوحہ جیسا فعل کرنے کو۔

چوری کی تعریف: کہتے ہیں کسی کے مال محفوظ کو خفیہ طریق پر لے لینے کو۔

قولہ "**وان زنی وان سرق الخ**" اگر چہ وہ زنا کرے اور اگر چہ وہ چوری کرے۔

اشکال مع جواب

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صرف ان دو چیزوں کا ذکر کیوں کیا گناہ تو اور بھی ہیں اس کا جواب یہ ہے: چونکہ انسان عام طور پر انہیں دو میں مبتلا ہوتا ہے اور دوسرے بڑے بڑے گناہوں میں بھی انسان خواہشات نفس کی وجہ سے مبتلا ہوتا ہے اس لئے انہیں دو چیزوں کا اشکال کیا۔ کیونکہ اجمالاً گناہ دو ہی قسم کے ہیں، حق اللہ اور حق العبد کے متعلق، اور یہاں دونوں چیزوں میں ایک حق اللہ ہے اور ایک حق العبد ہے۔

طالب علم اور استاذ کا ادب

اس سے معلوم ہوا کہ طالب علموں کو اشکال کرنے چاہئیں، جو بات سمجھ میں نہ آئے استاذ سے اس کو دریافت کر لینا چاہئے۔ یہ نہیں کہ خاموش بیٹھے رہیں، خواہ سمجھ میں کچھ نہ آئے جیسا کہ آج کل طلباء کا حال ہے اسی وجہ سے آج کل عام طور پر طلباء کو کچھ آتا جاتا نہیں۔ اسی طرح استاد کو بھی چاہئے کہ شاگرد کے سوال سے ناخوش نہ ہو بلکہ خوش ہو کر اس کا جواب دے، اور اس کو مطمئن کرے۔

خاموشی تو خانقاہوں میں ہوتی ہے،

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند
گر نہ بینی تو سر حق بر من بخند

وہاں سب چیزیں بند کر لو آنکھ بھی کان بھی تو چپ وہاں رہنا چاہئے، یہاں نہیں۔

یہاں جو چپ رہیگا اسے چاہئے کہ جنگل میں جائے اور گھاس کھودے۔

مشہور ہے کہ:

''طالب علمے کہ چون وچرا نکند ومریدے کہ چون وچرا بکند ہر دورا بہ چراگاہ باید فرستاد۔''

[جو طالب علم چون وچرا نہ کرے اور جو مرید چون وچرا کرے، دونوں کو چراگاہ بھیج دینا چاہئے]

حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہاں طالب علم کے مقام پر تھے۔اس وجہ سے پھر کہا کہ وان زنیٰ وان سرق، اگرچہ زنا وچوری کرے اگرچہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پامال کرتا ہو۔اور چونکہ حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی معلم کے مقام پر تھے اس لئے پھر فرمایا کہ وان زنیٰ وان سرق. تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں اگرچہ زنا کرے اور اگرچہ چوری کرے اللہ تعالیٰ کی جنت اور اللہ تعالیٰ کے بندے، وہ جانے اس کا کام، کسی کو دم مارنے کی گنجائش نہیں۔

وان رغم انف ابی ذر: اگرچہ خاک آلود کردی جائے ابوذر کی ناک یعنی اگرچہ ابو ذر کتنی ہی کوشش کرے جنت ہی میں جائیگا۔

وان رغم انف ابی ذر: رَغم، رغام سے ماخوذ ہے جس کے معنی مٹی کے آتے ہیں اور اس کا ضبط رُغم را کے ضمہ اور را کے فتحہ دونوں طریقہ پر محدثین نے کیا ہے مگر مشہور روایت بفتح الراء ہے۔اس کے لغوی معنی تو مٹی میں ملانا، خاک آلود کرنا ہی ہیں، لیکن مجازاً ذلت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔اس صورت میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کرے۔اور بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ رغام سے نہیں بلکہ مراغمہ سے ماخوذ ہے، جس کے

معنی بے چینی اور حیرانی کے آتے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی اس کو جنت میں ہی داخل کریگا۔ خواہ ابو ذر کو کتنی ہی پریشانی ہو۔ (نووی شرح مسلم: ۱/۳۲۶)

حدیث شریف کی ایک تقریر یہ ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اس عقیدت اور محبت کی وجہ سے۔ جو اس کو اللہ تعالی اور حضرت نبی اکرم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے ساتھ ہے۔

پہلا مطلب

دیکھو بچہ کو اپنے والدین سے عقیدت ہوتی ہے وہ یوں سمجھتا ہے کہ میرا ان دونوں کے سوا کوئی نہیں، اگر اسکے زبان ہو تو وہ کہے کہ میرے لئے ان سے زیادہ اچھا کوئی نہیں چاہے شیطان کتنے ہی وسوسے ڈالے مگر وہ نہیں پلٹ سکتا۔ ہزاروں میں بھی وہ اپنی ماں کو پہچان لیتا ہے تو اسکی عقیدت ہی تو ہے کہ والدہ اس سے کتنی محبت کرتی ہے جب وہ محبت کے انداز میں اپنی ماں کو دیکھتا ہے تو ماں صرف دیکھنے ہی سے اس پر مگن ہو جاتی ہے اور عمل اسکا بچہ کبھی پیشاب کبھی پاخانہ۔ اسکے باوجود والدہ نہ ناراض ہوتی ہے نہ چہرہ پر شکن ڈالتی ہے، ہنسی خوشی سب برداشت کرتی ہے۔

اس طرح بندہ جب حق تعالی شانہ کے ساتھ اور حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے ساتھ عقیدت و محبت رکھتا ہے اور بشری تقاضہ سے اس سے گناہوں کا بھی صدور ہو جاتا ہے مگر وہ پھر بھی اپنے خدا کی طرف محبت اور ندامت کے ساتھ دیکھتا ہے اللہ تعالی بھی اس کو معاف کرتا رہتا ہے، اور جنت میں داخل کرتا ہے۔

تو حدیث شریف کی ایک تقریر تو یہ ہے کہ وہ شہادت و عقیدت کی وجہ سے بخش دیا جائیگا۔ چاہے عمل اس کے برے ہی ہوں۔ یہ ہے محبت بھری تقریر۔

دوسرا مطلب

یہ ہے کہ دخل الجنۃ مطلقہ عامہ ہے کہ جنت میں داخل ہو جائے گا اور یہ مقید نہیں

ہے کہ کب داخل ہوگا تو حضرت نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جنت میں داخل ہوگا چاہے کبھی ہو۔

اور حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دائمہ مطلقہ سمجھ رہے تھے کہ وہ فوراً داخل ہوگا۔ اس وجہ سے بار بار اشکال کرتے رہے جن کو ضرورت تھی جھٹکے کی ذرا جھٹکا دیا اور کام ہوگیا۔

علی رغم انف ابی ذر کہا اور کام تمام ہوگیا۔

درد والی عورت کا علاج

جیسے کسی نے ایک درد والی عورت کا علاج اس طرح کیا تھا کہ ایک کمرے میں چاروں طرف گوکھرو بچھادے اور بیچ میں کرسی بچھادی اور کہا کہ اس کو یہاں بلاؤ وہ اٹھ کر آئی اور ذرا جھٹکا لگا اور درد ختم کیونکہ جو رگ لگی ہوئی تھی وہ کھل گئی۔

یہ تو منطقی انداز تھا۔ حدیث میں آیا ہے کہ جس نے کلمہ پڑھا اس کو دخول جنت ہوگا۔ جس نے کلمہ پڑھ لیا وہ جنت میں داخل ہوگا اگرچہ کبائر کا ارتکاب کرے۔

تیسرا مطلب

اس کا جواب یہ بھی ہے کہ اس کا دخول ہوجائیگا چاہے کبائر کی سزا بھگتنے کے بعد ہو یا ویسے ہی اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں البتہ اولاً داخلہ ضروری نہیں۔

ہاں کبھی نہ کبھی اس کا داخلہ ہوجائیگا، چاہے اولاً یا بعد میں۔ اور یہ معنی قریب قریب مذکورہ بالا معنی کے مطابق ہیں، کہ یہ مطلقہ عامہ ہے۔

اور مطلقہ عامہ میں موضوع کا وجود ابتداءً ضروری نہیں ہوتا بلکہ کسی ایک وقت میں ثابت ہوجائے بس وہی کافی ہے۔

حضرت کشمیریؒ کی رائے

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اس میں ایک عجیب بات فرمائی کہ اس سے حالت ایمان کی زنا و چوری مراد نہیں بلکہ قبل الاسلام کی زنا و چوری مراد ہے، وہ مانع دخول جنت نہیں ہونگے۔ (درس مشکوۃ)

ایک شاندار معنی

یہ بھی ہیں کہ کلمہ پڑھنا اجمال ہے ایمان کا، پورا ایمان نہیں ہے، یہ اجمال ہے اور اس کی تفصیل اور ہے کہ اس نے اس اجمال کو قبول کیا۔ اور اسی پر جان دیدی۔

جان دینے کا محاورہ محنت کرنے کا ہوتا ہے کہ اس نے اس کلمہ پر جان توڑ محنت کی۔

اسی پر ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شبہ ہوا اور کہا کہ اگر چہ وہ زنا اور چوری کرے تو زنا اور سرقہ سے مراد یہ نہیں کہ ہمیشہ زنا اور سرقہ کرتا ہو، بلکہ اگر کبھی اتفاقی طور پر ایسا ہو گیا اور اس نے توبہ کر لی تو وہ جنت میں جائیگا۔ یہ نہیں کہ زنا اور سرقہ ہمیشہ کرتا رہے اور توبہ بھی نہ کرے اور پھر بھی جنت میں داخل ہوگا۔ بلکہ مراد یہی ہے کہ اس نے کلمہ پڑھا اور اس پر جان توڑ محنت کی تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔

علی رغم انف ابی ذر الخ کی حکمت

تین مرتبہ میں بھی جب ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شرح صدر نہ ہوا تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جھٹکا دینا پڑا جیسے موٹر جب اسٹارٹ نہیں ہوتی تو زور سے اس کو جھٹکا دینا پڑتا ہے۔ علی رغم انف ابی ذر کہ اگر چہ ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ناک خاک آلود ہو۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی کتنی بھی کوشش کرے مگر وہ جنت میں ہی داخل ہوگا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس جملہ سے محبت

اور اس جملہ سے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایسی محبت ہوگئی تھی کہ جب اپنے تلامذہ سے اس حدیث کو بیان کرتے تو اس جملہ کو بھی بطور اعزاز وتفاخر نقل کرتے تھے۔ کہ محبوب کی زبان سے نکلا ہوا جملہ تھا۔ اس لئے اس جملہ کو نقل کرتے تھے، اور لذت حاصل کرتے تھے، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کس قدر محبت تھی۔

معتزلہ اور خوارج کا رد

اور یہ حدیث دلیل ہے معتزلہ اور خوارج کے خلاف۔

خوارج: خوارج کہتے ہیں کہ مرتکب کبائر کافر ہو جاتا ہے۔ اور وہ مخلد فی النار ہوگا۔

معتزلہ: معتزلہ کہتے ہیں کہ مرتکب کبائر ایمان سے خارج ہو جاتا ہے، گو کافر بھی نہیں ہوتا، مگر مخلد فی النار ہوگا۔

یہ حدیث ان دونوں فرقوں کے خلاف دلیل ہے۔ اور دونوں فرقوں کی اس حدیث سے تردید ہو جاتی ہے۔ البتہ اس سے ظاہر اً مرجیہ کی تائید ہو رہی ہے، جو "**لاتضر المعصية مع الايمان**" کے قائل ہیں اس کے جوابات وہی ہیں جو اوپر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے ذیل میں گذر چکے۔

﴿جنت میں دخول کے لئے عقائد کی اصلاح لازم ہے﴾

﴿۲۵﴾ وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ

رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰه تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُولُهٗ وَاَنَّ عِيْسىٰ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُولُهٗ وَابْنُ اَمَتِهٖ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِنْهُ وَالْجَنَّةَ وَالنَّارَ حَقٌّ اَدْخَلَهُ اللّٰه الْجَنَّةَ عَلٰى مَاكَانَ مِنَ الْعَمَلِ۔ (متفق علیه)

حوالہ: بخاری شریف ص:۴۸۸/١،باب قوله "یااهل الکتاب لاتغلوا فی دینکم" کتاب الانبیاء، حدیث نمبر:۳۴۳۵، مسلم شریف ص۴۳/١،حدیث نمبر:۲۸، باب الدلیل علی من مات علی التوحید دخل الجنة، کتاب الایمان.

حل لغات: امة، باندی، ج اِماءٌ و آمٍ. اَلْقَاهَا، اَلْقَی الشیءَ، (افعال) ڈالنا،پھینکنا۔

ترجمہ: حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جوشخص اس بات کی گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اوراس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اوراس کے رسول ہیں، نیز اس کی باندی (مریم) کے بیٹے ہیں اوراس کا کلمہ ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کی جانب ڈالا تھا اوراللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی روح ہیں، اور یہ کہ جنت ودوزخ حق ہیں، اللہ تعالیٰ ان عقائد رکھنے والے کو جنت میں داخل کرے گا خواہ اس کے عمل کیسے بھی ہوں۔

وان عیسیٰ عبد اللہ ورسولہ الخ لانے کی وجہ

تشریح: تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا فرض ہونے کے باوجود صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں یہود ونصاریٰ نے بہت افراط

وتفریط کی، نصاریٰ نے تو ان کو خدا یا خدا کا بیٹا بنالیا جو ان کے مرتبہ میں افراط ہے اور یہود نے ان کو (العیاذ باللہ) ولد الزنا قرار دیکر رسالت سے انکار کردیا، حالانکہ ان کا مرتبہ ان دونوں فریق کے عقیدے کے درمیان ہے تو ان دونوں کی تردید کیلئے خصوصی طور پر ان کو ذکر فرمایا۔ اور "عبداللہ" کہہ کر نصاریٰ پر تعریض ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں خدا یا اس کا بیٹا نہیں اور "ورسولہ" سے یہود پر تعریض ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ ولد الزنا رسول نہیں ہوسکتا۔

وابن امتہ: نصاریٰ پر بھی تعریض ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی باندی کے بیٹے ہیں، خدا یا خدا کا بیٹا کیسے ہوسکتے ہیں، جو بعد میں پیدا ہو پہلے سے نہ ہو وہ خدا کیسے ہوسکتا ہے، اور جو مخلوق سے پیدا ہو مخلوق کا بیٹا ہو وہ خدا کا بیٹا کیسے ہوسکتا ہے۔ اور یہود پر بھی تعریض ہے کہ اگر ولد الزنا ہوتا تو یہ شریف لقب جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف منسوب کیا، نہ ہوتا۔

وکلمتہ القاھا الی مریم: اس سے بھی یہود پر تعریض ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے خصوصی کلمہ "کُــنْ" سے بغیر مرد اور بغیر مادہ منویہ پیدا کئے گئے ہیں۔ ولد الزنا کہنا تہمت ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ کہنے کی وجہ

پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا کلمہ کہنے کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ان کو بغیر باپ کلمہ "کُــنْ" سے پیدا کیا۔ دوسری وجہ ہے کہ کہ انہوں نے وقت کلام سے پہلے بچپن میں گود مادر میں کلام کیا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ان کے کلام سے لوگوں کو بہت فائدہ پہونچا، اور جس سے فائدہ پہنچتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کردیا جاتا ہے، جیسے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تلوار سے بہت فائدہ پہونچایا اس لئے ان کو سیف اللہ کہا جاتا ہے۔

وروح منہ: معنی ہیں روح والا وجود دسرے روح والے اجسام کے مانند نہیں ہیں کیونکہ سب مادہ کے ساتھ روح والے ہیں اور حضرت عیسیٰ بغیر مادہ روح والے ہیں۔

رُوْحٌ مِنْهُ کہنے کی وجہ

اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح کہا جاتا ہے۔

(۱)......یا تو اسلئے کہ انکے ذریعہ مردوں میں روح آ جاتی تھی۔

(۲)......یا انکے ذریعہ مردہ قلوب ہدایت کی روح سے زندہ ہو جاتے تھے۔

(۳)......یا اسلئے کہ انکی پیدائش حضرت جبرئیل علیہ السلام کے نفخ روح سے ہوئی اور ان کا لقب روح ہے۔

تردید فلاسفہ

قولہ و الجنۃ و النار حق: جنت اور جہنم کے حق ہونے کا بھی یقین اور اعتقاد رکھے، اس جملہ قولہ والجنۃ والنار حق الخ سے ایسے فلاسفہ وزنادقہ کی تردید ہو جاتی ہے۔ جو جنت و دوزخ کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ (مرقاۃ)

مقصود یہ ہے کہ تمام ضروریات دین پر اس کا یقین اور اعتقاد ہو اس بات کی تعبیریں حدیثوں میں مختلف ہیں، کہیں صرف "لا الـہ الا اللہ" کا ذکر ہے، کہیں عبدیت عیسیٰ علیہ السلام کے اعتقاد کا بھی ذکر ہے۔ وغیرہ ذلک من التعبیرات معبر عنہ ایک ہی ہے کہ تمام ضروریات دین کا اعتقاد ہو، تعبیر کا یہ اختلاف احوال مخاطب کے اختلاف کی وجہ سے ہے، ہر مخاطب کے حال کے مناسب تعبیر اختیار کی گئی، مخاطب کی حالت دیکھ کر بعض ضروریات دین کا خصوصی ذکر کر دیا جاتا ہے، اس تقریر سے اس اشکال کا بھی جواب ہو گیا کہ اکثر احادیث میں

صرف لا الہ الا اللہ کا ذکر ہے تو کیا ایمان بالرسالۃ ضروری نہیں؟ حاصل جواب یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ صرف ایک عنوان ہے، تمام ضروریات دین کو مان لینے کا۔ (اشرف التوضیح)

﴿سابقہ گناہوں کو محو کرنے والے اعمال﴾

﴿۲۶﴾ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ اُبْسُطْ یَمِیْنَكَ فَلِاُبَایِعْكَ فَبَسَطَ یَمِیْنَهٗ فَقَبَضْتُ یَدَیَّ فَقَالَ مَالَكَ یَا عَمْرُو قُلْتُ اَرَدْتُ اَنْ اَشْتَرِطَ قَالَ تَشْتَرِطُ مَاذَا؟ قُلْتُ اَنْ یُغْفَرَلِی قَالَ اَمَا عَلِمْتَ یَا عَمْرُو اَنَّ الْاِسْلَامَ یَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهٗ وَاَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهَا وَاَنَّ الْحَجَّ یَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهٗ۔ (رواہ مسلم) وَالْحَدِیْثَانِ الْمَرْوِیَّانِ عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی "اَنَا اَغْنَی الشُّرَکَاءِ عَنِ الشِّرْكِ" وَالْآخَرُ "اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِی" سَنَذْکُرُهُمَا فِی بَابِ الرِّیَاءِ وَالْکِبْرِ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی۔

حوالہ: مسلم شریف: ص ۷۶/۱، باب کون الاسلام ما کان الخ، کتاب الایمان، حدیث نمبر: ۱۲۱۔

حل لغات: ابسط، امر حاضر بسط، (ن) بسطاً، پھیلانا۔ قبضتُ، ماضی واحد متکلم، قبض، قبضاً (ض) یدہ عن الشیء، ہاتھ ہٹالینا۔ یھدم، مضارع واحد مذکر غائب، ھدم البناء، (ض) ھدماً، عمارت گرانا، توڑنا۔ غنی مصدر غناء (س) عن الشیء، بے نیاز ہونا۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ آپ اپنا

ہاتھ بڑھائیے تاکہ میں آپ سے بیعت ہو جاؤں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا بات ہے عمرو؟ میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول میں کچھ شرط عائد کرنا چاہتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا شرط ہے؟ میں نے کہا میرے تمام گناہ معاف کر دئے جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمرو! کیا تم کو معلوم نہیں کہ اسلام ان تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے، جو قبول اسلام سے پہلے کئے گئے ہوں، ہجرت ان تمام گناہوں کو دور کر دیتی ہے جو ہجرت سے پہلے کئے گئے ہوں، اور حج ان تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے جو حج سے پہلے کئے گئے ہوں، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ دونوں حدیثیں "قال اللہ تعالیٰ انا اغنی الخ" اور "الکبریاء ردائی" ریاء اور کبر کے باب میں انشاء اللہ نقل کی جائیں گی۔

تشریح: عن عمرو[1] ابن العاص الخ: حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ جو عرب کے بڑے دانشمندوں میں سے ہیں، فحال العرب یعنی عرب کے بڑے سورما، بڑے بہادر، بڑے عقلمند انسان تھے۔

یہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ کے بڑے فاتحِ مصر اور گورنر تھے۔ انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا تھا ایک ملک فتح ہوا ہے جس کی زمین سونے چاندی کی ہے، حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا آج کل یہاں قحط پڑا ہوا ہے غلہ بھیجدو تو

[1] آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کنیت ابو عبد اللہ، اور ابو محمد ہیں، فتح مکہ سے قبل حدیبیہ اور خیبر کے درمیان ۵ھ میں آپ کا قبول اسلام ہے ۴۳ھ میں تقریباً نوے سال کی عمر میں وفات پائی، یہی قول ان کی وفات کے متعلق زیادہ صحیح ہے ورنہ اس کے علاوہ متعدد اقوال ہیں۔ (اصابہ: ۲/۳، اکمال: ۶۰۷)

ان کے والد کا نام عاص بن وائل ہے بعض کتب میں ان کے نام کو عاصی لکھدیا جاتا ہے جو غلط ہے اس لئے کہ عاصی کا مطلب یہ ہے کہ یہ کلمہ معتل لام ہے، حالانکہ یہ کلمہ معتل لام نہیں بلکہ معتل عین ہے، کیونکہ قاموس میں ہے "الاعیاص من قریش اولاد امیة بن عبد شمس الاکبر وھم العاص، وابو العاص والعیص۔" اسی وجہ سے اس کو "ی" کے ساتھ لکھنا اور پڑھنا جائز نہیں ہے نہ وقفاً اور نہ وصلاً۔ (مرقاۃ: ۱/۸۷)

انہوں نے اتنا بڑا قافلہ بھیجا کہ جس کا ایک آگے کا اونٹ مدینہ میں اور آخری ان کے ہاتھ میں تھا۔انہوں نے کہا:

ابسط: یہ صیغہ امر ہے مگر نہ امر ہے نہ التماس ہے بلکہ التجا اور درخواست ہے۔

صیغہ امر کا حکم

چونکہ یہ صیغۂ امر اگر چھوٹے کی جانب سے ہوتو التجا ہوتی ہے اور اگر برابر والے کی طرف سے ہوتو التماس۔اور اگر بڑے کی طرف سے ہوتو حکم وفرمان۔اور اللہ تعالیٰ کے سامنے ہوتو دعا کے لئے ہوتا ہے۔یہاں التجا کے لئے ہے۔

درخواست بیعت

اس سے معلوم ہوا کہ مرید خود بیعت کی درخواست کرے یہ نہیں کہ پیر خوشامد کرتا پھرے،اور کبھی پیر بھی تو خوش آمد کرتا ہے جیسے۔حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے دوھما اڑتے ہوئے دیکھے ان کی وجہ سے پیری مریدی کا جال بچھایا،مگر بہت سی چڑیے بھی پھنس گئیں۔ایک مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور ایک مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ۔اوران کے ساتھ دوسرے لاتعداد حضرات کی بھی اصلاح ہوگئی۔

اصل تو یہ ہے کہ مرید کی طرف سے طلب ہو،مگر کبھی پیر کی طرف سے بھی طلب ہوتی ہے، جب پیر جان لیتا ہے کہ مرید میں طلب موجود ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت ہاتھ بڑھائیے،آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہاتھ بڑھادیا،اس سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ حضرت تیار ہی بیٹھے تھے۔کچھ شرط بھی نہ کی، جیسے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علیہ الرحمۃ کے یہاں تو بڑی بڑی شرطیں تھیں، یہ شرطیں تب ہوتی ہیں جب سچی طلب معلوم نہ ہو،اور آپ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان کی سچی طلب معلوم تھی۔ اسی وجہ سے کوئی شرط بھی نہ لگائی، اور یہ شرطیں بھی طالب صادق معلوم کرنے کو ہی لگائی جاتی ہیں۔

پھر انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا ہاتھ تو پھیلوا دیا اور اپنا سکوڑ لیا۔ یہ تمہیں کیا ہوا، انہوں نے جواب دیا کہ میں کچھ شرط لگانا چاہتا ہوں۔ دیکھو یہاں مرید شرط لگا رہے ہیں۔

"ماذا تشترط" پر ایک نحوی اشکال

اشکال: ہوتا ہے کہ ماذا حرف استفہام ہے اور حرف استفہام صدارت کو چاہتا ہے اور یہاں درمیان میں آیا ہوا ہے۔ تشترط کے بعد میں ماذا آیا ہوا ہے۔

جواب: اسکا یہ ہے کہ اس کا عامل محذوف ہے یعنی ماذا تشترط۔ اس کے بعد تشترط محذوف ہے اور شروع میں تشترط ہے اس کا استفہام محذوف ہے۔ یعنی "اتشترط" کیا تم شرط لگاتے ہو؟ ماذا تشترط کیا شرط لگاتے ہو؟

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ گویا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا شرط لگانا پسند نہیں آیا، تو فرمایا: تم شرط لگاتے ہو؟ کیا شرط لگاتے ہو؟

ملا علی قاریؒ نے ایک رائے یہ بھی نقل کی ہے "ماذا" صدارتِ کلام کا تقاضا کرتا ہے یہ شروع کلام میں ہی تھا لیکن اس کو حذف کر دیا اور محذوف کے طور پر تشترط کے بعد اس کا تذکرہ کر دیا۔ (مرقاۃ: ۱/۸۷، طیبی: ۱/۱۶۲)

شرط لگانے کی وجہ

انہوں نے کہا کہ حضرت یہی کہ مغفرت ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے خوف کا غلبہ تھا۔ تو یہ

بھی کر چکے تھے، مغفرت بھی ہو چکی تھی، اور دل سے بھی مٹا دیا تھا۔

مگر جب گناہ یاد آتے تو مغموم ہو جاتے، خود ان کا بیان ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اسلام سے قبل ستر سے زائد اپنی اولاد اور اپنے محلہ کی لڑکیوں کو قبر میں دفن کیا ہے تو جب یاد آتا تو قبض کی حالت طاری ہو جاتی، اور فکر کرتے کہ قیامت میں کیا حال ہوگا، اگر تمام لڑکیاں چپٹ گئیں تو کپڑے تک پھاڑ ڈالیں گی، تو اسی قبض کی حالت میں آپ کے پاس آئے کہ حضرت ہاتھ بڑھایئے، میں تجدید ایمان کرنا چاہتا ہوں تو حضرت نے بھی کچھ نہ پوچھا معلوم ہوا کہ جب کوئی قبض کی حالت میں ہو تو اس کو تسلی دینی چاہئے۔

اما علمت یا عمرو الخ: آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔

اور ہجرت پہلے گناہوں کو ختم کر دیتی ہے۔ اور حج پہلے تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔

تین اعمال ذکر کرنے کی وجہ

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ تین بڑے بڑے عمل ذکر کر دیئے ورنہ تو ہر اچھا عمل گناہوں کو ختم کر دیتا ہے، مگر اپنے اعتبار سے جتنا بڑا عمل ہوگا، اتنے ہی گناہوں کو ختم کریگا۔

صابون جتنا بڑا اور عمدہ ہوگا اتنے ہی زیادہ کپڑے صاف کریگا۔ صابون کے ہر ٹکڑے میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ میل کو صاف کر دے، ایسے ہی ہر نیکی میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ سیئات کو دور کر دے اور یہ " ان الحسنات یذھبن السیئات" میں مذکور ہے، مگر تین بڑے عمل کو ذکر کیا۔

اسلام سب سے بڑا عمل ہے مگر اس کی کیا قدر رہے اس کی قدر اس وقت ہوتی ہے جب آبائی ایمان نہ ہوتا۔ ان کی قدر ان سے پوچھو جو آبائی اسلام نہیں رکھتے۔ اور اسلام لاتے

ہیں انہیں کتنی صعوبتیں پیش آتی ہیں۔

اور ایسے ہی ہجرت بڑا عمل ہے، وطن مالوف کو چھوڑ دینا آسان نہیں، بہت مشکل کام ہے۔ اور حج بھی بہت کٹھن ہے سفر میں بڑی بڑی صعوبتیں اور پریشانیاں سامنے آتی ہیں۔ اور اگر تکلیف ہو تو حکم ہے کہ کچھ نہ بولنا، اگر گالی بھی دے تو بولنا نہیں۔ "**ولا فسوق ولا جدال فی الحج.**"

یہ حج بھی بہت بڑا عمل ہے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان تینوں باتوں سے تسلی دی کہ تم مسلمان ہو مہاجر ہو، اور حاجی ہو پھر کیا فکر کرتے ہو۔

عمرو ابن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جانتے تھے مگر پھر بھی آپ نے فرمایا کہ کیا تم جانتے نہیں یہ اس وجہ سے کہ وہ استحضار کرلیں۔

اعمال ثلٰثہ سے کون سے گناہ معاف ہوتے ہیں

اما علمت یا عمرو مطلب یہ ہے کہ کمال حذاقت، جودتِ رائے کے باوجود تم پر یہ بات مخفی نہیں رہنی چاہئے۔ (مرقاۃ: ۱/۸۸)

البتہ اس سلسلہ میں علماء کی آراء مختلف ہیں کہ اسلام کیسے گناہوں کو منہدم کرتا ہے۔ اور ہجرت وحج کیسے گناہوں کو منہدم کرتے ہیں۔

تورپشتیؒ کی رائے یہ ہے کہ اسلام مطلقاً ماقبل کے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے، خواہ کبیرہ ہوں یا صغیرہ، اور از قبیل ظلم ہوں یا نہ ہوں۔ اور جہاں تک ہجرت وحج کا تعلق ہے تو یہ دونوں ان گناہوں کے لئے کفارہ نہیں بنتے جو از قبیل ظلم ہوں، اور ان دونوں سے ان کبائر کا منہدم ہونا بھی یقینی اور قطعی نہیں ہے، جو عبد اور معبود کے درمیان ہیں۔ لہذا حدیث کا محمل یہ ہے کہ حج

وہجرت صغائر ماقبل کومنہدم کرتے ہیں اوران کبائر کے لئے بھی ہادم ہوسکتے ہیں جوحقوق العباد کے متعلق نہ ہوں۔مگر کبائر کا ہادم بننے کے لئے تو یہ شرط ہے۔(طیبی:۱۶۲/۱)

بعض مشائخ سے یہ منقول ہے کہ زمانۂ اسلام سے قبل کے صغائر وکبائر نیز حقوق العباد غیر مالیہ مثلاً بہتان، غیبت وغیرہ سب کو اسلام منہدم کردیتا ہے۔لیکن حقوق العباد مالیہ مثلاً دین، بیع وشراء وغیرہ کے حقوق وہ باقی رہتے ہیں اور یہ تو تب ہے جب حربی مسلمان ہو۔اور اگر مسلمان ہونے والا ذمی ہوتو حقوق العباد مطلقاً منہدم نہیں ہوتے خواہ مالیہ ہوں یا غیر مالیہ۔

حافظ ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے کہ حج بھی ماقبل کے گناہوں کومنہدم کرتا ہے۔لیکن جب کہ وہ مظالم کے قبیل سے نہ ہوں۔نیز ساتھ ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ حج میں برائیوں کا ارتکاب نہ کیا ہو جیسا کہ ایک حدیث میں ہے "من حج فلم یرفث ولم یفسق خرج من ذنوبه کیوم ولدته امه" البتہ اہل سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ حقوق العباد تو حج وہجرت سے مطلقاً معاف نہ ہونگے اور پھر بعض علماء کے نزدیک ان دونوں سے صرف صغائر معاف ہوتے ہیں، کبائر کی معافی کے لئے تو یہ ضروری ہوتی ہے اور بعض کے نزدیک کبائر بھی معاف ہوجاتے ہیں۔(مرقاۃ:۸۸/۱،تحفۃ المرأۃ:۱۲۸)

اور دو حدیثیں جن کو ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا ہے، ان کو یہاں بیان نہیں کیا۔ان کو ہم نے باب الریا اور باب الکبر میں بیان کیا ہے۔

کیونکہ ان کا تعلق ریاء اور کبر ہی سے ہے۔ان میں سے ایک حدیث "انا اغنی الشرکاء عن الشرک" اس کو باب الریاء میں لائے ہیں۔

الکبریاء ردائی : بڑائی میری چادر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں ایک چادر میں دو آدمی نہیں سما سکتے اسی طرح کبریائی اللہ تعالیٰ کی چادر ہے اس میں دو آدمی نہیں سما سکتے۔جو اس کو کھینچے گا اس کی گردن توڑ

دیں گے۔اس حدیث کو باب الکبر میں بیان کریں گے۔

ثبوت بیعت

فائدہ: اس حدیث پاک سے بھی بیعت کا ثبوت ہو گیا، اور یہ بھی کہ یہ بیعت بیعت **علی الایمان** ہی تھی جس کو بیعت طریقت کہتے ہیں، جو آج مشائخ میں رائج ہے، چونکہ بیعت کی درخواست کرنے والے جلیل القدر صحابی ہیں پس معلوم ہو گیا کہ بیعت کا انکار کرنا یا اس کو بدعت کہنا جہالت ہے۔

نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اصل یہی ہے کہ ہاتھ میں ہاتھ لیکر ہو، مگر یہ بیعت کے لئے شرط کے درجہ میں نہیں، بلکہ استحباب کے درجہ میں ہے، چونکہ اصل تو بیعت معاہدہ کا نام ہے۔

---

[۱] یہاں مصنفؒ کی عبارت میں لف نشر مرتب ہے کہ پہلی روایت "انا اغنی الشرکاء عن الشرک" کو باب الریاء میں اور دوسری حدیث "الکبریاء ردائی" کو باب الکبر میں ذکر کریں گے۔(مرقاۃ:۱/۸۸)

الفصل الثانی[1]

خیر کے دروازے

(۲۷) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عنہ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُولَ اللّٰہِ اَخْبِرْنِی بِعَمَلٍ یُدْخِلُنِی الْجَنَّۃَ وَیُبَاعِدُنِی مِنَ النَّارِ قَالَ لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ اَمْرٍ عَظِیْمٍ وَاِنَّہٗ لَیَسِیْرٌ عَلیٰ مَنْ یَسَّرَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ تَعْبُدُ اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا، وَتُقِیْمُ الصَّلٰوۃَ وَتُؤْتِی الزَّکٰوۃَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ وَتَحُجُّ الْبَیْتَ ثُمَّ قَالَ اَلَا اَدُلُّکَ عَلیٰ اَبْوَابِ الْخَیْرِ اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ، وَالصَّدَقَۃُ تُطْفِیءُ الْخَطِیْئَۃَ کَمَا یُطْفِیءُ الْمَاءُ النَّارَ، وَصَلَاۃُ الرَّجُلِ فِی جَوْفِ اللَّیْلِ، ثُمَّ تَلَا تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ حَتّٰی بَلَغَ یَعْمَلُوْن، ثُمَّ قَالَ اَلَا اَدُلُّکَ بِرَأْسِ الْاَمْرِ وَعَمُوْدِہٖ وَذِرْوَۃِ سَنَامِہٖ قُلْتُ بَلیٰ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ رَأْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ وَعَمُوْدُہُ الصَّلٰوۃُ وَذِرْوَۃُ سَنَامِہٖ الْجِھَادُ، ثُمَّ قَالَ اَلَا اُخْبِرُکَ بِمَلَاکِ ذٰلِکَ کُلِّہٖ قُلْتُ بَلیٰ یَانَبِیَّ اللّٰہِ فَاَخَذَ بِلِسَانِہٖ، وَقَالَ کُفَّ عَلَیْکَ ھٰذَا فَقُلْتُ یَانَبِیَّ اللّٰہِ وَاِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَکَلَّمُ بِہٖ، قَالَ ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ یَا مُعَاذُ، وَھَلْ یَکُبُّ النَّاسَ فِی النَّارِ عَلیٰ وُجُوْھِھِمْ اَوْ عَلٰی مَنَاخِرِھِمْ اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِھِمْ (رواہ احمد والترمذی، وابن ماجۃ)

حوالہ: ترمذی شریف: ۲/۸۹، حدیث نمبر: ۲۶۱۶، باب ماجاء فی حرمۃ الصلاۃ، کتاب الایمان، مسند احمد: ۵/۲۳۱، ابن ماجہ: ۲۹۴، باب کف اللسان فی

[1] فصل ثانی میں ان روایات کا تذکرہ ہے جن کو صاحب مصابیحؒ نے حسان سے تعبیر کیا تھا۔

الفتنة، کتاب الفتن، حدیث نمبر:۳۹۷۳۔

حل لغات: یسیر، آسان، یَسَرَ الشَّیءُ (ض) یَسْراً، آسان ہونا، یَسَّرَ الشَّیءُ، آسان کرنا، اَلْجُنَّة، ڈھال، ذریعہ حفاظت، ج جُنَنٌ، تُطْفِئُ واحد مؤنث غائب، فعل مضارع، افعال، النار آگ بجھانا طَفِئتِ النار (س) آگ بجھنا۔ اَلْخَطِیْئَةُ گناہ، ارادہ گناہ جرم، ج خطایا، جوف، اندرون، کھوکھلا حصہ، ج اجواف، جوف من اللیل، رات کا آخری حصہ، المضجع، بستر پلنگ، خوابگاہ، ج مضاجع ضَجَعَ، ضَجْعاً، (ف) پہلو پر لیٹنا، کروٹ لے کر سونا، الذروة، چوٹی، بلندی، ج ذُرًا، کہتے ہیں ھو فی ذروة النسب، وہ اعلیٰ نسب کا ہے۔ اسنام، کوہان ہر چیز کا بالائی حصہ، ج اَسْنِمَةِ، عُمُود، سہارا، ج اَعْمِدَة، وَعُمُدٌ، ثَکِلَ الولد او الحبیب ثکلاً وَثُکْلاً (س) اولاد یا محبوب سے محروم ہو جانا، ثکلته امه، پیار کے موقع پر دعاء کے لئے اور ناراضگی کے وقت بددعاء کے لئے بولا جاتا ہے۔ خدا اس کا ناس کرے وہ ہلاک ہو۔ (القاموس الجدید: ۲۱۹/۱) یَکُبُّ، کَبَّه لوجهه (ن) کباً، اوندھا کرنا، منہ کے بل گرانا، اَلْمَنْخَرَ، نتھنا ناک، ج مَنَاخِرُ، حصائد واحد حصیدة، کٹی ہوئی کھیتی، حصائد الالسنة، فضول باتیں، بے فائدہ کلام۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے، جو مجھ کو جنت میں داخل کر دے، اور جہنم سے دور رکھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے ایک بڑی چیز کے بارے میں سوال کیا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جس پر آسان کر دے اس کے لئے نہایت آسان ہے، تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، نماز پڑھو، زکاۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، اور حج کرو، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تم کو بھلائی کے دروازے تک نہ پہنچا دوں؟ روزہ ڈھال ہے، صدقہ گناہوں کو اس طرح مٹا دیتا ہے جیسا

کہ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔اس طرح رات میں تہجد کی نماز پڑھنا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "تتجافٰی الخ" [ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں] "یعملون" تک آپ نے تلاوت فرمائی، پھر آپ نے فرمایا: کیا میں تم کو اس معاملے کا سر، اور اس کے ستون اور اس کے کوہان کی بلندی سے باخبر نہ کردوں" میں نے عرض کیا ہاں اللہ کے نبی! ضرور بتائیے، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اس چیز (دین) کا سر اسلام ہے اس کا ستون نماز ہے اور اس کے کوہان کی بلندی جہاد ہے پھر آپ نے فرمایا کیا میں تم کو ان سب چیزوں کی جڑ بتاؤں؟ میں نے کہا ہاں ضرور بتائیے اے اللہ کے نبی! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) آپ نے اپنی زبان مبارک پکڑی، اور فرمایا اس کو بند رکھو، حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ہم جو کچھ اپنی زبان سے بولتے ہیں کیا اس پر مؤاخذہ ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (تمہاری ماں تم کو گم کرے) لوگوں کو ان کے منہ کے بل یا پیشانی کے بل دوزخ میں گرانے والی چیز یہی زبان کی فضول باتیں ہوں گی۔

تشریح: عن معاذؓ قال قلت[1] یارسول اللّٰہ الخ:

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت بڑے فقیہ تھے اتنا بڑا سوال کیا جو سب سے بڑا مقصود ہے۔ان مدارس کی تمام تر کوشش اور جدوجہد کا مقصد صرف یہی تو ہے کہ جنت حاصل ہو اور جہنم سے دوری ہو۔

---

[1] امام ترمذیؒ نے اس واقعہ کے پس منظر کو بھی روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھا ایک دن چلتے چلتے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہو گیا تب میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات دریافت کی۔

اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ غزوۂ تبوک کا سفر تھا جب ایک دن دوران سفر گرمی لگنے لگی تو حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین منتشر ہونے لگے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میرے قریب تھے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہو گیا اور میں نے یہ سوال دریافت کیا۔(تحفۃ الاحوذی: ۳۶۲/۷/۲۷۴۹)

اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کی ذاتی حیثیت بیان کردی کہ وہ بڑا امر ہے۔ یعنی نفوس پر گراں گذرتا ہے، اور پھر تسلی کرتے ہوئے فرمایا کہ تم گھبرانہ جاؤ جس پر اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ چاہتا ہے آسان بھی کردیتا ہے۔ اور آسان ہوجاتا ہے۔[ے]

ماتحتوں کی تسلی کرنا

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ اساتذہ کو چاہئے کہ اپنے طلباء کی اور مشائخ کو چاہئے طالبین کی مشکل مقامات پر تسلی فرماتے رہا کریں، ایسا نہ ہو کہ وہ گھبرا کر ہمت ہار جائیں، اور اس کو چھوڑ بیٹھیں۔

تعبد اللّٰہ: اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اللہ تعالیٰ کو واحد سمجھو۔[ل]

و لاتشرک: اور کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ یہ **لاتشرک** تاکید ہے **تعبد اللہ** کی چونکہ عبادت جب تک نہیں ہوسکتی جب تک توحید پر یقین نہ کرے تو یہ **لاتشرک** مؤکد کی حیثیت رکھتا ہے۔

معتزلہ اور خوارج پر رد

ایمان حقیقت مخفیہ ہے اور جنت و دوزخ بھی مخفی ہیں، جنت مخفی خزانہ ہے اور اس کے حصول کے لئے راستہ بھی مخفی ہوگا۔ اور وہ ہے ایمان جو کہ مخفی ہے معلوم ہوا کہ نجات کے لئے ایمان کافی ہے۔ اس سے رد ہوتا ہے معتزلہ اور خوارج پر۔

ے یعنی سوال ایک ایسی عظیم شئی کا ہے جس کا جواب مشکل ہے کیونکہ اس عمل کی شناخت جس سے دخول جنت ہو یہ تو علم غیب سے متعلق ہے اور غیب کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے، لیکن اس شئی عظیم پر عمل کرنا اس کے لئے آسان ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ آسان فرمادیں۔ (تنظیم الاشتات: ۶۸/۱)

ل یا تو یہ جملہ اور مابعد میں آنیوالے جملے جملہ خبریہ ہونیکے باوجود امر کے معنی میں ہیں، یا مبتدا محذوف کی خبر ہیں ان سے ان مصدریہ کو حذف کردیا گیا یا فعل کو مصدر کے درجہ میں اتارلیا گیا ہے۔ (مرقاۃ: ۱/۸۹، وتحفۃ الاحوذی: ۷/۳۶۲)

وَتُقِیْمُ الصَّلٰوۃَ الخ: اور نماز قائم کرنا اور زکوۃ ادا کرتے رہنا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھتے رہنا۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قلب معاذ کو متوجہ دیکھا تو آپ نے سوچا کہ کچھ اور بھی بتلادوں چونکہ جب طالب متوجہ ہوتا ہے تو استاذ کا دل چاہتا ہے کہ کچھ اور بیان کروں اور اگر متوجہ نہ ہو تو دل نہیں چاہتا۔

اسی وجہ سے جب آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قلب معاذؓ کو متوجہ دیکھا تو فرمایا:

الا ادلک: یہ استفہام بھی متوجہ کرنے کے لئے ہے معلوم ہوا کہ جس قدر متوجہ ہوں اتنا ہی کم ہے یہ نہیں کہ بیٹھے سبق میں اور دھیان ادھر ادھر۔[1]

بغیر اس کے کہ معاذ ہاں کریں فرمایا "الصوم جنة" [روزہ ڈھال ہے]

"جنة" ایسی شئ کو کہا جاتا ہے جس سے تلوار وغیرہ سے حفاظت ہوتی ہے۔ (سپر)

تو روزہ ڈھال ہے اس کے ذریعہ انسان بہت سی مصیبتوں سے رک جاتا ہے۔ اول تو تقویٰ پیدا ہو جاتا ہے، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "کتب علیکم الصیام کما کتب

---

[1] ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ جس طرح بعد کے دونوں مقامات پر "قلت بلی" ہے اسی طرح "الا ادلک علی ابواب الخیر" کے بعد بھی "قلت بلی" ہوگا لیکن راوی بھول گیا۔ (مرقاۃ: ۱/۹۰)

اور علامہ طیبیؒ نے شیخ مظہر سے نقل فرمایا ہے کہ اس روایت میں اشیاء ثلاثہ مذکورہ کو ابواب الخیر قرار دیا ہے کیونکہ روزہ، ایسے ہی مال کو صدقہ کرنا (جبکہ وہ زکوۃ پر مزید بھی ہو) اور ایسے ہی درمیانی رات میں نماز ادا کرنا نفس پر بہت شاق ہیں، اور جو ان امور کی عادت بنالیتا ہے اس کے لئے ہر خیر کا حصول آسان وسہل ہو جاتا ہے کیونکہ دار مغلق کا دروازہ کھولنا ہی داخل ہونے کے لئے مشکل ہوتا ہے۔

یا مطلب یہ ہے کہ ابواب الخیر سے مراد نوافل ہیں اور اس کی دلیل "وصلوۃ الرجل فی جوف اللیل" ہے اور اس میں ایک فائدہ یہ ہے کہ تکرار لازم نہیں آتا۔ اور نوافل کو فرائض کا دروازہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ فرائض کے لئے مکملات کے طور پر ہوتے ہیں۔ (طیبی: ۱/۱۶۵)

اور کیونکہ اس مقام پر خیر کو ایک مکان کے ساتھ تشبیہ دے کر اس کے لئے دروازوں کو ثابت کیا ہے تو یہ استعارہ مکنیہ اور تخییلیہ ہے۔ (تحفۃ المرأۃ: ۱۲۸)

علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون"

رمضان المبارک میں ہر مسلمان میں کچھ نہ کچھ تقویٰ آہی جاتا ہے۔تو روزہ میں انسان زبان کو غیبت چغلی سے بچاتا ہے اور چونکہ روزہ افضل شئ ہے اس وجہ سے اولاً اس کا تعلق روح سے ہی ہوتا ہے روح کے واسطے سے اس کا تعلق اجسام سے ہوتا ہے۔

روزہ کے ڈھال ہونے کی وجہ

روزہ ڈھال ہے یعنی جہنم سے آڑ ہے کیونکہ بھوک میں شیطان کی آمدورفت کی راہ مسدود ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے وہ گناہ پر آمادہ نہیں کر سکے گا،اور گناہ ہی دخول جہنم کا سبب ہوتا ہے اور اس کی دلیل "**ان الشیطان یجری من الانسان مجری الدم الا فضیقوا مجاریه بالجوع**" [بے شک شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑتا ہے،خبر دار تم اس کے راستے بھوک کے ذریعہ تنگ کردو] ہے۔

اور قاضی ناصر الدین فرماتے ہیں کہ روزہ چونکہ خواہشات اور شہوات کو توڑتا ہے اسی وجہ سے اس کو ڈھال قرار دیا ہے اسی وجہ سے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "**الصوم له وجاء**" اور ایک موقعہ پر فرمایا تھا کہ "**ما ملأ آدمی وعاء شرا من بطنه**" کیونکہ پیٹ بھرنے پر ہی زیادہ تر زیغ وضلال پیدا ہوتا ہے۔(طیبی:۱/۱۶۶)

اور بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ دنیا میں غلبہ شہوت سے اور آخرت میں دوزخ سے ڈھال ہے۔(مرقاۃ:۱/۹۰)

و الصدقة تطفئ الخطيئة: [صدقہ خطا کو بجھادیتا ہے]

خطا کو تشبیہ دی آگ سے اور مشبہ کو حذف کردیا۔یہ استعارہ بالکنایہ ہے جس طرح پانی آگ کو بجھادیتا ہے اسی طرح صدقہ خطاؤں کو مٹا اور ختم کردیتا ہے،معصیت کے آثار

صدقہ سے مٹ جاتے ہیں۔

نافرمانیوں کے آثار چہروں پر نمایاں ہوتے ہیں گناہ کا خاصہ ہے اس کا اثر چہرے پر آجاتا ہے۔ مگر ہماری بصیرت کمزور ہے اس وجہ سے ہم پہچان نہیں سکتے۔ ورنہ ضرور اثر آتا ہے تو یہ صدقہ ایک اثر ہے مصیبتوں کے اثرات کو دور کرنے کا اور اس کے علاوہ اور بھی چیزیں ہیں، جیسے صابون کپڑے کے میل کچیل کو ختم کردیتا ہے۔ مگر اور بھی چیزیں ہیں جن سے میل صاف ہوجاتا ہے۔

تو یہ صدقہ گناہوں کے میل کے لئے پاؤڈر ہے۔

وصلوۃ الرجل فی جوف اللیل: کہ درمیانی رات میں کھڑے ہوکر نماز پڑھنا۔ جس سے تہجد مراد ہے۔ یہ بھی گناہوں سے روکتی ہے۔ اور اثرات معصیت کو ختم کرتی ہے صدقہ کی طرح اور آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ "تتجافی جنوبهم عن المضاجع" [کہ راتوں کو ان کے پہلو بستروں سے جدا رہتے ہیں] تہجد میں نمازوں میں مشغول رہتے ہیں۔ دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔

تو مؤمن کی شان یہ ہے کہ ان کے پہلو راتوں کو بستروں سے جدا رہتے ہیں۔ (اور آیت کو پڑھتے پڑھتے) "ومما رزقنهم ینفقون" (تک پہنچے) ہمارے دیئے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں۔

ثم قال الا اُدلک: فرمایا کیا نہ بتادوں میں تم کو دین کی جڑ اور اس کی درمیانی چیز یعنی بڑا رکن اور اس کی بلندی[1]۔

حضرت معاذؓ بول اٹھے کہ ضرور ہاں بتلا دیجئے، فرمایا کہ دین کی جڑ اسلام ہے اور یہ دین کی بنیاد ہے اور اس کا بڑا رکن نماز ہے اور اس کی بلندی جہاد ہے۔

---

[1] ذروۃ: ذال کے کسرہ کے ساتھ ہے یہی زیادہ مشہور ہے اور بعض علماء نے ذال کا ضمہ اور فتحہ بھی نقل کیا ہے یعنی بلندی۔ (مرقاۃ: ۱/۹۰)

ذروۃ سنامہ. سنام، کوہان۔

دین کوتشبیہ دی اونٹ سے اوراونٹ کوکوہان لازم ہے پس اس کوثابت کیا ہے دین کے لئے تو اس جملے میں تینوں قسم کے استعارات ہیں[ؔ]۔

الجہاد: کافروں سے جہادوقتال کرنا کلمۂ حق کی بلندی اوراشاعت کے لئے جہاد کہاجاتا ہے۔

حج ،صوم ،زکوۃ ،کوذکر نہ کرنے کی وجہ

اورقاضی مظہر کی رائے یہ ہے کہ جہادکواس پر ترغیب کے لئے مکرر لائے ہیں اورنماز اس اعتبار سے اقوی ہے کہ ہررات ودن میں مکرر آتی رہتی ہے لہذا شہادت، جہاداورصلوۃ کو ذکر کیا گیا ،تعظیماوتحریضا۔اورحج ،صوم ،اورزکوۃ کو چھوڑ دیا کیونکہ حج میں تو تکرارہی نہیں اورصوم وزکوۃ میں تکرارتو ہوتا ہے مگر سال بھر میں۔لہذا نماز کی طرح قوت نہیں رہی۔نیز ان کا تذکرہ شروع حدیث میں بھی ہوہی چکا ہے۔(طیبی:۱/۱۶۸)

جہادکاحکم

ہرشخص پر ہرزمانہ میں اورہرانسان پر جہادفرض ہے۔کیونکہ جہاد کی آیتوں کوگن کر

ؔ علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ "راس الامر الاسلام" میں امر سے مراد امردین ہے اوراسلام سے شہادتین ہے یعنی جب تک بندہ کلمۂ شہادت کا مقرنہیں ہوگا اس کودین میں سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔اورجب وہ شہادتین کا اقرار کریگا۔تواصل دین تو اس کوحاصل ہوجائیگا۔مگراس میں قوۃ وکمال نہ ہوگا اس گھر کی طرح جس میں ستون نہ ہو۔لہذا جب نماز پڑھیگا اوراس پر مداومت کریگا۔تو اس کا دین مضبوط ہوجائیگا۔لیکن اس میں رفعت وکمال نہ ہوگا۔پھرجب جہادکریگا تو اس کے دین کوبلندی حاصل ہوگی۔

اورشیخ اشرف سے منقول ہے کہ اسلام سے اس کی جانب اشارہ ہے کہ اسلام تمام اعمال کیلئے ایسا ہے جیسا کہ سر بدن کیلئے۔جس طرح بغیر سر کے جسم باقی نہیں رہتا اسی طرح بغیر اسلام کے اعمال بے فائدہ ہیں اور"ذروۃ سنامہ الجہاد" میں جہاد کے بلندمرتبہ اورتفوق پر دلالت ہے اورساتھ ہی اس کی صعوبت پر۔

دیکھو تو نماز کی آیتوں سے زائد ہیں اور جتنا مضمون جہاد کا ہے اتنا نماز کا نہیں ہے۔ قرآن شریف میں کہا گیا ہے۔ "وجاهدوا فی الله حق جهاده" اور کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ "صلوا حق صلوته" جہاد کے معنی حق کی اشاعت میں کوشش کرنا، جس طرح بھی ممکن ہو کوشش کرے، اگر تلوار کی ضرورت پڑے تو تلوار اٹھائے، تمام تر ترقیات اور عزتوں کا راز جہاد ہی میں مضمر ہے، آج جو یہ بے عزتیاں ہو رہی ہیں یہ سب اس وجہ سے ہو رہی ہیں، کہ جہاد چھوڑ دیا، اس کا علاج جہاد کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

جہاد و قتال میں نسبت

جہاد و قتال میں عام خاص من وجہ کی نسبت ہے اور دو مادے افتراقی۔ ایک اجتماعی ہیں، یعنی مسلمان اگر کافروں سے اشاعت اسلام کی وجہ سے قتال کرے تو اس صورت میں جہاد اور قتال دونوں جمع ہو گئے۔

اور اگر کافر آپس میں لڑیں یا مسلمان لڑیں آپس میں یا کافروں سے ہی قتال کریں مگر اپنی دوسری اغراض کی وجہ سے، اسلام کی اشاعت کے لئے نہیں تو یہاں قتال تو ہے مگر جہاد نہیں۔

اور اگر کوئی معلم اشاعت اسلام میں سعی کر رہا ہے زبان سے تقریر و وعظ کے ذریعہ لوگوں کو سمجھا رہا ہے تو یہاں جہاد تو ہے مگر قتال نہیں ہے۔

الا اخبرک بملاک ذلک کله. پھر حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا نہ خبر دیدوں تجھ کو، حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی تختی لگائے ہوئے تھے پریس پر ادھر سے فیضان ہو رہا تھا ادھر اتر رہا تھا، تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تختی پر اور سیاہی ڈالدی، "الا اخبرک" کہہ کر یعنی توجہ دلا دی۔

طلباء اور سامعین کو متوجہ کرنا

فائدہ: معلوم ہوا کہ درمیان میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ بھی کرتے رہنا چاہئے۔ اساتذہ کو چاہئے کہ دوران درس طلباء کو اپنی طرف متوجہ بھی کرتے رہیں، اسی طرح مشائخ کو بھی چاہئے کہ مجلس میں طالبین کو متوجہ بھی کرتے رہیں کہ کہیں ذہن ادھر ادھر تو نہیں۔

تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تم کو دین کا جوہر اور خلاصہ نہ بتا دوں، پورے کا پورا خلاصہ نچوڑ اور جوہر۔

ملاک: اصل لغت میں میم کے کسرہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، مگر حدیث میں کسرہ ہی ہے۔

نکتہ: یہ تمام مذکورہ بالا عبادات کی جانب اشارہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ مندرجہ بالا تمام امور وعبادات کی پختگی کا ذریعہ زبان کو لایعنی امور سے بچانا ہے، کیونکہ کفر وشرک غیبت وبہتان، سب وشتم، کذب وشہادت زور وغیرہ اکثر گناہ زبان سے ہی صادر ہوتے ہیں۔ لہذا زبان کو لایعنی باتوں سے بچانا تمام عبادات کی جڑ ہے۔ (تحفۃ المرأۃ:۱۲۹)

زبان کی حفاظت اور اس کی اہمیت

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ کیوں نہیں یا نبی اللہ ضرور بتلائیے۔ یہاں طرز بدل دیا کہ اس سے پہلے یا رسول اللہ کہا اور یہاں یا نبی اللہ تفنن کی وجہ سے۔ تو حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی زبان پکڑی۔ اور زبان پکڑ کے فرمایا: "**کف علیک هذا**" [کہ اپنے اوپر اس کو کنٹرول میں رکھو] پابندی کے ساتھ بولنے کی جگہ بولو اور نہ بولنے کی جگہ نہ بولو، اگر اس کے خلاف ہو رہا ہے تو سمجھ لو کہ تمہارا زبان پر کنٹرول نہیں ہے،

زبان کو تو ذراسی حرکت کرنی پڑتی ہے اور کتنا بڑا کام ہو جاتا ہے۔

اس زبان کی حرکت حرام عورت کو حلال اور حلال عورت کو حرام کر دیتی ہے۔ ایک اجنبی عورت جو حرام ہے آپ ذرا "قبلت" کہتے ہیں (جب کہ وہ خوش ہو) اور وہ آپ کے لئے حلال ہو جاتی ہے۔ صرف ذراسی زبان سے حرکت کرنی پڑی اور وہ حلال ہوگئی اسی طرح ایک ستر سال کی بڑھیا جس کے ستر لڑکے اور ستر لڑکیاں ہیں، آپ نے ذراسی زبان کو حرکت دی یعنی "طلقتک" کہا اور معاملہ ختم، نہ وہ بیگم رہی نہ آپ بیگمہ رہے، زبان کی ذراسی حرکت سے انسان دشمن بن جاتا ہے اور زبان کی ہی ذراسی حرکت سے انسان دوست بن جاتا ہے۔

ذرا آپ غصہ میں کسی کو برا بھلا کہتے ہیں تو وہ آپ کا دشمن ہو جاتا ہے اور اگر ذرا نرمی سے کہدیں کہ بھائی جان ذرا تشریف رکھئے تو وہ آپ کا دوست بن جاتا ہے، تو انسان اس سے دشمنی بھی کر لیتا ہے اور دوستی بھی۔

زبان کو ذراسی حرکت دی کہ کہ تیری ماں کو یوں، تو فوراً لڑائی جھگڑا شروع اور اگر لڑائی ہو رہی ہے اور آپ نے ذراسی زبان ہلادی کہ بھائی جان مجھ سے غلطی ہوگئی معاف فرمادو، تو دیکھو اس ذرا سے لفظ سے لڑائی ختم دشمنی ختم اور جھگڑا ختم صرف ذرا سے لفظ سے۔

تو حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دریافت کیا ہماری باتوں کا بھی سوال ہوگا جن سے ہم کلام کرتے ہیں ان کا بھی سوال ہوگا آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تجھے تیری ماں روئے۔

ثکلتک امک کے عجیب معنی

ثکل: کسی کے مرنے پر رونے کو کہا جاتا ہے۔ یہ اس وقت محبت کے لئے بولا جاتا تھا، اور اس میں والدہ کی زیادتی عمر کی دعا بھی ہے کہ تمہاری عمریں خوب ہوں اور پھر جب مرو

تو تمہاری والدہ روئیں اس کی اور بھی زیادہ عمر ہو۔

زبان کے نقصانات

نہیں داخل ہونگے انسان جہنم میں چہرے کے بل اور ناک کے بل مگر زبان کی کھیتیوں کی وجہ سے ہی۔

مــنــاخــر: منخر کی جمع ہے جو میم کے فتحہ اور خا کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور ناک کے سوراخ کو کہا جاتا ہے، اور یہاں ناک مراد ہے اور یہ راوی کو شک ہوا ہے کہ علی وجوھھم فرمایا تھا، یاعلی مناخرھم. (مرقاۃ:۱/۹۱)

حصائد: حصیدۃ کی جمع ہے جو فعیلۃ کے وزن پر ہے اور مفعول کے معنی میں ہے۔
بات کو تشبیہ دی ہے کھیتی کے ساتھ، یعنی جس طرح کھیتی کاٹتے وقت گھاس وغیرہ بھی کٹجاتی ہے، اسی طرح جب زبان شروع ہوتی ہے تو اچھے برے کو نہیں دیکھتی اور نہ یہ خیال کرتی کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

جتنے انسان جہنم میں داخل ہوں گے اسی زبان کی وجہ سے کہ اللہ تعالی کی نافرمانی کی، کہ زبان پر پابندی نہیں کی، بڑوں کی بے ادبی ہوتی ہے تو زبان پر کنٹرول نہ کرنے کی وجہ سے، گالی دیتا ہے زبان پر کنٹرول نہ ہونے کی وجہ سے، غیبت کرتا ہے چغلی کرتا ہے بہتان لگاتا ہے، سب زبان پر کنٹرول نہ ہونے کی وجہ سے۔

یکُبُّ: ی کے فتحہ، کاف کے ضمہ کے ساتھ [سرنگوں ہونا، ذلیل ہونا] یعنی جہنم میں ذلت وخواری اس زبان کی کھیتیوں ہی کی وجہ سے ہوگی۔

باتوں کو کھیتی کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجہ

یہاں زبان کی باتوں کو تشبیہ دی ہے کھیتی سے اور کھیتی کاٹتے وقت یہ لحاظ نہیں رکھا جاتا

کہ صرف گیہوں ہی کٹیں۔ بلکہ ساتھ میں گھاس بھی کٹتی ہے۔ اسی طرح بات کرنے کے وقت جب زبان کھلتی ہے تو پھر اچھی اور بری بات کا لحاظ نہیں رکھتی، نتیجہ کو نہیں سوچتی صرف کہنے سے کام ہے، نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو۔

﴿محبت و نفرت کا سبب رضاءِ الٰہی ہونا چاہئے﴾

﴿۲۸﴾ وَعَنْ اَبِی اُمَامَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰی لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدْ اِسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ، رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ، وَرَوَاهُ التِّرْمِذِیُ عَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍ مَعَ تَقْدِیْمٍ وَتَاْخِیْرٍ وَفِیْهِ فَقَدْ اِسْتَکْمَلَ اِیْمَانَهٗ۔

حوالہ: ابوداؤد: ص ۲/۶۴۳، باب الدلیل علی زیادۃ الایمان الخ، کتاب السنۃ، ترمذی شریف ص ۲/۷۸، کتاب صفۃ القیامۃ، باب نمبر: ۶۰، حدیث نمبر: ۲۵۲۱۔

حل لغات: ابغضہ، نفرت کرنا، دشمنی رکھنا، باب افعال سے، استکمل الشیء، پورا کرنا، تکمل الشیء پورا ہونا۔

ترجمہ: حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص اللہ ہی کے لئے محبت کرے، اللہ ہی کے لئے بغض رکھے، اللہ ہی کے لئے خرچ کرے، اللہ ہی کے لئے خرچ کرنے سے رک جائے، تو ایسے شخص نے یقیناً اپنے ایمان کو کامل کر لیا، (ابوداؤد) اور ترمذی نے یہ روایت معاذ بن انسؓ سے کسی قدر تقدیم و تاخیر کے ساتھ نقل کی ہے، اور اس میں یہ الفاظ ہیں ”اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا“۔

تشریح: عن ابی امامة[1] الخ: اس حدیث میں چار چیزیں ذکر کی گئی ہیں دو قلب سے متعلق ہیں۔ اور دو قالب سے۔ دو چیزیں جو قلب سے متعلق ہیں وہ محبت اور عداوت ہیں۔ اور دو چیزیں جو قالب یعنی ہاتھ سے متعلق ہیں وہ دینا اور نہ دینا ہے۔

ابوداؤد نے اس کو روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے معاذ بن انس سے روایت کیا ہے تقدیم وتاخیر کے ساتھ یعنی "احب لله وابغض لله" بعد میں ہے "اعطی لله ومنع لله" ہے[2]

منشا قلب وقالب کی دو دو چیزوں کو ذکر کرنے کا یہ ہے کہ جس نے اپنے قلب کی دونوں حرکتوں یعنی دوستی اور دشمنی کو اللہ تعالیٰ کے لئے کرلیا۔ اور ہاتھ کی دونوں حرکتوں یعنی دینے اور منع کرنے کو اللہ تعالیٰ کے لئے کرلیا تو سمجھ لو کہ اس کا ایمان مکمل ہوگیا۔

چونکہ قلب میں دو ہی حرکتیں ہوتی ہیں، ایک دوستی کی اور دوسری دشمنی کی، اس لئے ان کو اللہ تعالیٰ کے لئے کرنا چاہئے۔

اگر دوستی کرو تو اللہ تعالیٰ کے لئے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور دشمنی کرو تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جیسے فراعنہ سے دشمنی کرنا، کفار سے دشمنی کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے ہو۔

پس اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنے دل کے تمام کاموں کو اللہ تعالیٰ کے لئے کرلیا تو اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔

دل کا کوئی کام ان دو حرکتوں سے خالی نہیں ہوتا، اگر غصہ آئے تو اللہ تعالیٰ کے لئے

---

[1] **ابوامامة:** آپ کا نام صدی بن عجلان باہلی ہے، مگر کنیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ پہلے مصر میں مقیم تھے پھر حمص چلے گئے، اور ۸۶ھ میں حمص میں ہی وفات پائی جبکہ آپ کی عمر ۹۱ سال تھی، آپ مکثرین صحابہ میں سے ہیں، البتہ آپ کی اکثر روایات شامیین کے پاس ہیں، اور بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ شام میں وفات پانے والے آخری صحابی آپ ہی ہیں۔ (اکمال:۵۸۶)

[2] نیز اس میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ابوامامہ کی روایت میں "فقد استکمل الایمان" ہے، الایمان منصوب ہے اور ترمذی شریف کی روایت میں "ایمانه" مرکب اضافی ہے اور ایمان مرفوع ہے۔ (مرقاة:۱/۹۲)

آئے اس وجہ سے نہ آئے کہ اس نے میری بے عزتی کی میری نافرمانی کی، اپنی کسی غرض کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اس نے دین کی ہتک کی ہے۔

بیوی پر اس وجہ سے غصہ نہ آنا چاہئے کہ اس نے کھانے میں نمک تیز کر دیا بلکہ اس وجہ سے کہ وہ نماز نہیں پڑھتی، اور نماز نہ پڑھنے کی صورت میں بھی یہ خیال نہ ہو کہ نماز نہ پڑھنے میں میری توہین ہوگی، نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا حکم ہے نماز کا حکم کرنیکا، تو جب دونوں حرکتیں ٹھیک ہوں گی یعنی لوجہ اللہ، تو پھر دیکھئے کیا مزہ آتا ہے۔

اسی طرح ہاتھ کی حرکتیں ہیں کہ جسم کی تمام حرکتیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہوں۔ اور دل کے بعد زیادہ تر جوارح میں اعمال کا تعلق ہاتھ سے ہوتا ہے۔

اگر ہونٹ پچکاؤ تو چڑانے کے لئے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے لئے اگر قدم اٹھیں تو اللہ تعالیٰ کے لئے اٹھیں، اگر زبان چلے تو اللہ تعالیٰ کے لئے چلے، تمہارے کسی عضو کی کوئی بھی حرکت اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف نہ ہو، ہم دیکھیں کہ ہمارے کتنے کام اللہ تعالیٰ کے لئے ہوتے ہیں، اگر اسی پر عمل کر لیں تو جنید بغدادی بن جائیں گے۔

حضرت نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انہیں جملوں میں تمام دین کو بھر دیا ہے۔ اگر تجزیہ کر کے دیکھیں تو کوئی بھی شعبہ عنصریات کا ارضیات کا طبعیات کا فلکیات کا ایسا نہیں جو ان جملوں میں نہ آ گیا ہو۔

چار چیزوں کی تخصیص کی وجہ

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ان چار چیزوں کی تخصیص اس وجہ سے ہے کہ یہ حظوظ نفسانیہ ہیں جن میں اخلاص پیدا کرنا بہت مشکل ہے، جب ان چار اعمال میں دشوار ہونے کے باوجود اخلاص پیدا ہو جائیگا، تو باقی اعمال میں اخلاص بطریق اولیٰ پیدا ہو جائیگا۔ (مرقاۃ:۹۲/۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ تم میرے لئے کیا کرتے ہو تو موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ آپ کے لئے نماز پڑھتا ہوں، روزہ رکھتا ہوں، وغیرہ وغیرہ، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سب کچھ اپنے درجہ بلند ہونے کے لئے کرتے ہو۔ اگر میرے لئے کچھ کرنا ہے تو حب فی اللہ و بغض فی اللہ کرو۔ (درس مشکوۃ)

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت احسان کے لئے تتمہ اور ایمان کے لئے اجارہ ہے، جس کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "ان تعبد اللہ کانک تراہ" میں بیان کیا ہے۔ یعنی جب تم اللہ تعالیٰ اور اس کی عبادت میں مشغول ہو تو تم ہمہ تن اسی کی جانب متوجہ ہو اور اس کے ماسوا پر تمہاری نظر نہ ہو، اسی طرح جب تم اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ مشغول ہو تو تمہارا ان کے ساتھ معاملہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہو۔ (طیبی: ۱/۱۷۰)

میبذی اور قطبی پڑھنا پڑھانا

اگر میبذی پڑھو تو اس نیت سے پڑھو کہ فلاسفہ معتزلہ خوارج پر رد کریں گے، جو عقائد کو باطل کرتے ہیں ان کے عقائد کو باطل کرسکیں ان کی غلط بیانی ثابت کرسکیں، ان کی غلط بیانی سے دین کی حفاظت ہو۔

اگر اس نیت سے پڑھو گے تو ایسا ہی ثواب ملے گا، جیسا تلاوت قرآن شریف میں ثواب ملتا ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا واقعہ

حضرت مولانا یعقوب صاحب اور صدر المدرسین دار العلوم ایک مرتبہ قطبی پڑھا رہے

تھے، ایک صاحب آئے اور کہا کہ حضرت جی فلاں صاحب کا انتقال ہو گیا، ان کے لئے ایصال ثواب کرادو آپ نے فرمایا کہ بھائی اس کتاب کا ثواب پہنچادو تو ان کو قطبی پر بھی ثواب ملتا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمہارا پورا عمل اللہ تعالیٰ کے لئے ہو، اور اس کی تفصیل دیکھو تو تمام دین اسی میں بھرا ہوا ہے، یہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کھلا اعجاز ہے، کوئی دوسرا صرف دو جملوں میں پورے طرز عمل کا طریق ذکر نہیں کرسکتا۔

﴿سب سے بہتر عمل کی تعیین﴾

﴿۲۹﴾ وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ۔

(رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابوداؤد شریف ص۲/۶۳۲، باب مجانبة اهل الهواء وبغضهم، کتاب السنة،[۱] حدیث نمبر:۴۵۹۹۔

حل لغات: افضل، اسم تفضیل، فضل فلان علی غیرہ، (س ن) احسان

[۱] امام ابوداؤدؒ نے اس روایت کو کتاب السنة، "باب مجانبة اهل الاهواء وبغضهم" میں ذکر کیا ہے۔ص ۲/۶۳۲، پر، مگر اس کی سند میں ایک مجہول راوی ہے اور سند یہ ہے۔عن مجاهد عن رجل عن ابی ذر قال فذكره۔

ملا علی قاریؒ کی رائے یہ ہے کہ ابوداؤد شریف کی سند میں جو راوی مجہول ہے وہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں کیونکہ امام طبرانیؒ نے معجم کبیر میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایسی ہی ایک روایت ذکر کی ہے۔عن عكرمة عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لابی ذر ای عری الايمان، اظنه قال اوثق قال الموالاة فی الله والمعاداة فی الله والحب فی الله والبغض فی الله. (طبرانی کبیر ص۱۱/۱۷۲، رقم الحدیث: ۱۱۵۳۷)

وکرم یا فضل وکمال میں دوسرے پر فوقیت لے جانا، الحب، محبت، دوستی، تعلق، حب الانسان (س) حبا، محبوب وپسندیدہ ہونا۔

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''سب سے افضل عمل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے محبت ہو اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے عداوت ہو''۔

تشریح: افضل الاعمال الخ: یہاں بھی دو چیزیں ذکر کی ہیں، اور دو بول کر کل کا ارادہ کیا جاتا ہے حب اور بغض دونوں کا قلب سے تعلق ہے، اور قلبی حرکت بڑھی ہوئی ہوتی ہے قالب پر قالب یعنی اعضاء وہی کرتے ہیں جو قلب کا حکم ہوتا ہے، جب دل حکم دیتا ہے زبان کو تو وہ بولتی ہے ورنہ نہیں۔ اگر پیروں کو حکم ہوتا ہے چل، تو چلتے ہیں، ورنہ نہیں، جب تک دل صاحب حکم نہ دیں اس وقت تک کوئی عضو حرکت نہیں کرتا۔

قلب اصل ہے قالب سے تو یہاں اعمال دل کے متعلق ہیں اور اس سے دل کے تمام اعمال مراد ہیں دل کی دنیا میں دل کی جتنی حرکتیں ہوتی ہیں ان سب میں افضل دو حرکتیں ہیں۔

ایک وہ حرکت جو محبت فی اللہ ہو اور دوسرے بغض فی اللہ یہ معنی **الحب فی اللہ** اور **البغض فی اللہ** کے ہیں۔

سب سے بڑا دشمن انسان کا نفس ہوتا ہے جو پہلو میں چھپا بیٹھا ہے، مارِ آستین اسی کے واسطے انسان چوری کرتا ہے۔ اور اسی کی وجہ سے اور دوسرے گناہ کرتا ہے۔

دشمنی کا مرکز دو چیزیں ہیں ایک نفس اور دوسرا شیطان، ان سے اللہ تعالیٰ کیلئے دشمنی ہو۔

اور محبت کے بھی مرکز دو ہی ہیں، ایک اللہ اور ایک اللہ والے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق میں جس سے محبت ہو وہ اللہ تعالیٰ ہی کی وجہ سے ہو، اپنی ذاتی غرض کی وجہ سے نہیں، اسی طرح کسی سے بغض ہو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی وجہ سے ہی ہو اپنی ذاتی غرض کی وجہ سے نہ ہو۔

اگر کوئی کہے کہ "الحب فی اللہ" نماز سے بھی افضل ہے تو اس سے کہو تو باؤلا ہے نماز کا تعلق جوارح سے ہے یہ تو اعمالِ قلوب میں سے ہے ہی نہیں یہ تو اعمال جوارح ہیں صرف دل سے تو نیت ہوتی ہے اور بس۔

اور یہاں مقابلہ دل کے اعمال سے ہے تو نہ ذکر سے تعلق ہے نہ صلوٰۃ سے چونکہ ذکر بھی زبان سے ہوتا ہے تو "الحب فی اللہ و البغض فی اللہ" دو چیزیں یہاں ذکر کی ہیں اور جو افضلیت اعمال بیان کی ہے وہ تو افضلیت دل کے اعمال کی ہے کہ دل کے تمام کاموں میں افضل الحب فی اللہ والبغض فی اللہ ہے۔

اور اس بات کا بھی خیال رکھنے کی ضرورت ہے کہ اس روایت میں "فی" لام کے معنی میں ہے۔ (مرقاۃ:۱/۹۲)

﴿ایذاء مسلم حرام ہے﴾

﴿۳۰﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰه تَعَالیٰ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَیَدِهٖ، وَالْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلیٰ دِمَائِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ۔ رواہ الترمذی والنسائی[1] وَزَادَ الْبَیْهَقِی فِی شُعَبِ الْاِیْمَانِ بِرِوَایَةِ فُضَالَةَ وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ فِی طَاعَةِ اللّٰهِ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَایَا وَالذُّنُوبَ۔

---

[1] ملا علی قاریؒ کی رائے یہ ہے کہ اس سیاق کے ساتھ یہ روایت ترمذی اور نسائی میں تو کیا کتب ستہ میں سے کسی میں بھی موجود نہیں ہے، بلکہ چند صحابہ سے اس کے اجزاء کتب ستہ میں نقل کئے گئے ہیں البتہ امام حاکمؒ نے اپنی مستدرک میں فضالۃ بن عبیدؓ سے مکمل روایت کو نقل کیا ہے جس کی سند امام مسلمؒ کی شرط کے مطابق ہے اس میں یہ فرق بھی ہے کہ مستدرک میں مؤمن مسلم پر مقدم ہے اور صاحب مصابیحؒ نے مسلم کو مؤمن پر مقدم کیا ہے۔ (مرقاۃ:۱/۹۲)

حوالہ: ترمذی شریف ص:۹۰/۲،باب ما جاء فی ان المسلم من سلم المسلمون الخ، کتاب الایمان، حدیث نمبر:۲۶۲۷،نسائی شریف ص۲۳۰/۲،باب صفة المومن، کتاب الایمان، حدیث نمبر:۴۹۹۶،بیہقی فی شعب الایمان ص:۴۹۹/۷،باب فی ان یحب الرجل لاخیہ المسلم۔

حل لغات: امن، امنا (س) مطمئن ہونا، بے خوف ہونا،جاھد العدو مجاھدة و جھادا (مفاعلة) دشمن سے لڑنا،الذنوب، واحد،ذنب، جرم،گناہ۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں،مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جان و مال کو مامون سمجھیں۔ (ترمذی ونسائی) بیہقی نے شعب الایمان میں فضالة سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں،اور مجاہد وہ ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت میں اپنے نفس سے جہاد کیا،اور مہاجر وہ ہے جس نے تمام گناہوں اور جرائم کو ترک کر دیا۔

تشریح: "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ" یہ جملہ تو پہلے حدیث میں گذر چکا،اور ایک جملہ نیا ہے،"وَالْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاس عَلىٰ الخ" [کہ مومن وہ انسان ہے کہ لوگ اس سے مامون ہوں اپنے مالوں اور اپنے خونوں پر]

وہ مومن جو تعریف کے لائق اور ممدوح ہے وہ وہ مؤمن ہے جس سے لوگ اپنے نفسوں اور اپنے خونوں پر محفوظ ہوں۔

حدیث سے متعلق سوال وجواب

ایک طالب علم نے سوال کیا جس کی تمہید پہلے اس طرح بیان کی کہ جو مسلمان ہوتا ہے

وہی مؤمن ہوتا ہے اور جو مؤمن ہوتا ہے وہی مسلمان آپ نے نعم کے ساتھ جواب دیا۔

پھر طالب علم نے پوچھا کہ جو یہ حدیث گذری ہے "المسلم من سلم الخ" تو یہاں المسلم میں المؤمن اور المؤمن میں المسلم خود داخل ہے، پھر دوبارہ ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے، المسلم میں ہی دونوں آگئے تھے، اور المؤمن اور المسلم میں سے صرف ایک کو ذکر کر دیتے؟

پھر جب دونوں ایک ہیں تعریف دونوں کی الگ الگ کیوں۔

آپ نے فرمایا کہ مزاج منطقی ہو گیا ہے کہ ایسا کیوں کیا؟

محاورات سے واقف نہیں؟ کہ ایک مربی کس طرح سمجھاتا ہے کبھی اس عنوان سے کبھی اس عنوان سے۔ کچھ لوگ آئے تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سمجھایا کہ "المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده. اور یہ لوگ چلے گئے، پھر کچھ لوگ آئے تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "المومن من امنه الناس علی دمائهم و اموالهم. اور سب کے سامنے آپ صرف یہی بیان کئے جائیں "المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده"

دوسرا جواب: اگرچہ ان دونوں کا ایک دوسرے پر اطلاق ہوتا ہے مگر ان میں فرق بھی ہے۔

الاسلام: گردن نہادن بر طاعت، یعنی ظاہری طور پر مطیع ومنقاد ہونا مسلمان کہلاتا ہے۔ ظاہری مطیع ومنقاد کی علامت وپہچان یہ ہے کہ وہ کسی کو تکلیف نہ پہنچادے اس بات کا اہتمام کرے کہ مجھ سے کسی کو تکلیف نہ پہونچے۔

الایمان: باطنی طور پر مطیع ومنقاد ہونا جس کا اثر یہ ہے کہ لوگ اس سے اپنے مالوں اور جانوں کے بارے میں مطمئن ہوں۔

ایمان اور اسلام علیحدہ علیحدہ دو حقیقتیں ہیں جن کو بیان کیا ہے۔ تو یہاں تکرار کہاں ہوا اور صرف ایک کے ذکر کرنے سے دوسری کا اظہار نہ ہوتا۔

دلیل اِنِّی اور دلیل لِمِّیْ

ســــوال: فرمایا کہ علت معلول سے پہچانی جاتی ہے؟ یا معلول علت سے پہچانا جاتا ہے؟

جــــواب: علت سے معلول پہچانا جاتا ہے اور بعض دفعہ معلول سے علت پہچانی جاتی ہے۔

فرمایا مگر کب یعنی علت سے معلول اور معلول سے علت کب پہچانی جاتی ہے، یہ نہیں کہ ہر جگہ دونوں طرح شناخت ہوتی ہے۔

آپ ہی فرمائیں۔

فرمایا **دلیل انی** اور **دلیل لمی** نہیں پڑھی۔

اگر علت سے معلول کا پتہ چلتا ہو تو **دلیل انی** ہے جیسے: **انی محموم لانی متعفن الاخلاط و کل متعفن الاخلاط محموم فانی محموم.**

یہاں محموم معلول ہے متعفن الاخلاط سے پہچانا گیا ہے اور متعفن اخلاط علت ہے یہ **دلیل انی** ہوئی۔

اور اگر معلول سے علت پہچانی جائے تو **دلیل لمی** ہے جیسے **انی متعفن الاخلاط و کل متعفن الاخلاط محموم فانی محموم.**

یہاں متعفن اخلاط جو علت ہے اس کو معلول یعنی محموم ہونے سے پہچانا گیا ہے اس کو **دلیل لمی** کہتے ہیں۔

قاعدہ: علت اگر واضح ہو تو علت سے معلول کو پہچانا جاتا ہے۔ اور اگر علت مخفی ہو تو معلول سے علت کو پہچانا جاتا ہے۔ جیسے ذاتِ باری تعالیٰ مخفی ہے اس کو اس کے معلولات یعنی اثر سے پہچانا جاتا ہے پورا عالم اس کا اثر اور اس کا معلول ہے، ہر ذرہ اس کے عرفان پر دال ہے۔

اسی طرح ایمان ایک مخفی حقیقت ہے جو نظر نہیں آتی اس کو بھی اس کے معلول یعنی اثر سے پہچانا جائے گا۔

اور وہ یہ ہے (اثر ایمان) کہ لوگ اس سے اپنی جانوں اور مالوں پر مطمئن ہوں، تو اس حدیث میں ایمان کے اثر کو ذکر کیا گیا ہے۔

اور **المسلم من سلم الخ**: میں اس کا تقاضا مذکور ہے۔

خود فرمایا کہ جو بات پوچھنے کی نہیں تھی وہ تو پوچھی اور جو پوچھنے کی تھی وہ نہیں پوچھی، جہاں شبہ ہونا چاہئے تھا وہاں تو شبہ بھی نہیں ہوا۔

عرض کیا کہ حضرت فرمادیں۔

شبہ: فرمایا یہاں شبہ یہ ہوتا ہے کہ ایمان کی علامت بتائی ہے کہ لوگ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے بارے میں جس سے مطمئن ہوں تو سمجھ لو کہ وہ مومن ہے۔

مثلاً کہ ایک شیخ بزرگ بڑا سچا مومن جب سفر کرتا ہے تو دوسرے سفر کرنے والے انجان آدمی کبھی بھی اس پر اطمینان نہیں کرتے اور وہ کسی اجنبی سے کچھ روپے مانگے کہ میں گھر جا کر لوٹا دوں گا وہ اس سے مطمئن نہ ہونے کی وجہ سے اس کو روپے نہیں دیتا تو کیا اس میں ایمان نہیں ہے کیونکہ یہاں علاماتِ ایمان یعنی اطمینان ناس نہیں پایا گیا۔

جواب: غور کرو یہاں اس کی ضرورت ہی نہیں کہ عقل دوڑاؤ، کیونکہ حدیث کے شبہ کا جواب خود حدیث میں ہی موجود ہوتا ہے، چنانچہ یہاں بھی اس کا جواب موجود ہے۔

فرمایا کہ الناس میں الف لام عہد خارجی کا ہے الناس سے مخصوص صاحب معاملہ مراد ہیں، جولوگ اس سے معاملہ کرتے ہیں اور اس کے وہ متعلقین جو اس کے حالات وعادات سے واقف ہیں وہ مراد ہیں سمجھ گئے؟ جی ہاں۔

سوال: بعض کافر ایسے ہوتے ہیں کہ اس کے متعلقین اور صاحب معاملہ ان پر اطمینان کرتے ہیں حالانکہ وہ کافر ہے تو کیا وہ بھی اطمینان کی وجہ سے مومن ہے؟

جواب: اس پر اطمینان صرف باعتبار معاملہ کرتے ہیں اپنے نفوس اور اپنے اموال پر بالکل اطمینان نہیں ہوتا۔

دوسرا جواب: اور اگر مان بھی لیا جائے کہ پورا اطمینان کرتے ہیں تب بھی اس کا مومن ہونا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ یہ تو صرف شعبہ ہے ایمان کا نہ کہ کل ایمان۔

اگر کوئی شخص درخت کی ایک شاخ اپنے گھر میں گاڑ لے تو اس کو درخت نہیں کہتے۔

النسبة بینهما: ان دونوں میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے۔

کہ جہاں ایمان ہوگا، وہاں اطمینان علی اموال ودماء ہوگا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جہاں اطمینان علی اموال ودماء پایا جائے وہاں ایمان بھی پایا جائے یہ لازم نہیں۔

ہاں جہاں ایمان ہوگا وہاں اطمینان ضرور ہوگا۔

اور آج کل تو عام خاص مطلق کیا عام خاص من وجہ ہوگیا۔ کہ مومنوں کے بعض افراد ایسے ہیں جہاں اطمینان علی الاموال والدماء نہیں پایا جاتا۔ اور بعض میں پایا جاتا ہے۔

اسی طرح غیر قوموں میں بھی اطمینان علی الاموال والدماء پایا جاتا ہے۔ تو یہ عام خاص من وجہ ہوگیا۔

یہاں مومن کی منطقی تعریف وحد بیان نہیں کی جس میں ایک جنس ہوتی ہے، اور ایک فصل، بلکہ یہاں مؤمن کا وہ وصف ذکر کرنا مقصود ہے جو لائق تعریف ہو، جیسے طالب علم تو

ہمارے یہاں سب ہیں مگر وہ سب لائق ذکر نہیں ہیں، تو اسی طرح مؤمن وہ ہے جو ہزاروں تغایر کے باوجود (جب کہ اس کا مزاج اور ہے اور اس کا مزاج اور) پھر بھی وہ اس سے محفوظ ہو، کتنا بھی جھگڑا ہو مگر اس کی طرف سے انسان کو اطمینان ہو تو وہ مؤمن لائق ذکر ہے، ورنہ لائق ذکر نہیں ہے، صرف لمبی داڑھی سے انسان مومن کامل نہیں بنجاتا، جبکہ وہ ذرا سی بات پر چراغ پا اور شعلہ دار بن جائے۔ تو یہ صفت پیدا کیجئے۔

اور گویا کہ مؤمن اور مسلم دونوں کے مادۂ اشتقاق کی جانب اشارہ کردیا کہ مادۂ اشتقاق کے مطابق عمل ہونا چاہئے۔ (مرقاۃ:۱/۹۲)

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا یہ حال تھا کہ جب لوگ کہیں جاتے تو امانتیں ان کے پاس رکھ کر جاتے اپنی بیٹی اور بیویوں کو صحابہ کے گھر چھوڑ کر جاتے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ تو کسی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، اپنے اعمال اپنے اخلاق اپنے کردار کو ایک زمانہ تک درست کیجئے، پھر لوگ آپ پر اطمینان کریں گے۔

صحبت شیخ کی ضرورت

اور یہ چیز صحبت شیخ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی اس لئے اس سے صحبت شیخ کی ضرورت بھی معلوم ہوگئی، جس طرح حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں یہ صفت حضرت نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحبت مبارکہ کی وجہ سے حاصل ہوئی۔

مجاهد: وہ ہے جو جہاد کرے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کوشش کرے۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہو تو اس میں سعی کرے صرف نماز پڑھ لینا کافی نہیں۔

بلکہ مجاہد کا قابلِ ذکر یہ وصف ہے اس کو باری تعالیٰ کا جو بھی حکم ہو وہ اسی میں سعی اور جہاد کرے اگر سبق کا وقت ہو تو سبق پڑھے اور کسی اور شئی کا حکم ہو تو اسی میں کوشش کرے۔

جہادِ اکبر

قاضی مظہرؒ سے علامہ طیبیؒ نے نقل کیا ہے کہ مجاہد صرف وہی نہیں ہے جو کفار سے قتال کرے، بلکہ مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جنگ کرے اور اس کو طاعتِ خداوندی پر مجبور کرے، اس لئے کہ نفسِ انسانی اس انسان سے کفار کے مقابلہ زیادہ دشمنی رکھتا ہے کیونکہ ایک تو وہ کفار دور ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ ان سے جنگ اور قتال کی نوبت بھی کبھی آتی ہے اور نفس ہمیشہ ساتھ رہتا ہے اور خیر وطاعت سے روکنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا اس دشمن سے قتال جو ہمیشہ ساتھ ہے اس دشمن کے مقابلہ زیادہ اہم ہوگا جو دور ہے۔ (طیبی: ۱/۷۲)

علامہ طیبیؒ کی رائے یہ ہے کہ "المجاھد" کا الم جنسی ہے یعنی مجاہد حقیقی جس کو مجاہد کہنا مناسب ہے وہ ہے جو نفس سے جہاد کرے۔ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کیونکہ یہ جہادِ اکبر ہے اور جہادِ اصغر کے لئے منشاء واصل ہے۔ (مرقاۃ: ۱/۹۲، طیبی: ۱/۷۲)

والمھاجر من ھجر الخطایا والذنوب: مہاجر تو اس شخص کو کہا جاتا ہے جو تحفظ دین کی خاطر وطن مالوف کو چھوڑ دے، مگر مہاجر کامل وہ انسان ہے جو تمام گناہوں اور غلطیوں کو چھوڑ دے۔

ای الصغائر والکبائر یعنی مہاجر وہ ہے جو صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو ترک کردے، یہاں خطایا سے مراد صغائر اور ذنوب سے مراد کبائر ہیں، اور بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ذنوب خطیئہ کے مقابلہ میں اعم ہے۔ (مرقاۃ: ۱/۹۳)

ہجرت کی حکمت

قاضی ناصر الدینؒ فرماتے ہیں کہ ہجرت کی حکمت یہ ہے کہ مؤمن بغیر کسی مانع اور

رکاوٹ کے اطاعت پر قدرت حاصل کر سکے اور ان برے لوگوں کی صحبت سے چھٹکارا پائے، جو ہمیشہ اخلاق ذمیمہ اور افعال شنیعہ کے حصول میں کوشش کرتے رہتے ہیں، پس ہجرت حقیقت میں اسی سے نکنے کا نام ہے، اور مہاجر حقیقی وہی ہے جو اس پر کار بند ہو۔ (طیبی:۱/۱۷۲:۲) باقی مزید تفصیل ان جملوں کی پہلے گذر چکی۔

﴿امانت اور ایفائے عہد﴾

﴿۳۱﴾ وَعَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَّا قَالَ لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَۃَ لَہٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَہْدَ لَہٗ۔ (رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

حوالہ: بیہقی شعب الایمان، ص ۴/۷۸، بـاب فی الایفاء بالعقود، حدیث نمبر: ۴۳۵۴۔

حل لغات: امانۃ، امن، (س) امانۃ، امین ہونا، دیانت دار ہونا۔ عھد، قبول کردہ ذمہ داری، عہد و پیمان، عھد، عھداً و عدۃً، (س) وعدہ پورا کرنا۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام طور سے خطبہ میں یہ ضرور ارشاد فرماتے کہ ''جس شخص میں امانت نہیں، اس کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں، اور جس میں عہد کی پاسداری نہیں اس کے دین کا کوئی اعتبار نہیں۔

تشریح: قل: تقلیل کے واسطے ہے۔

مـــا: تاکید تقلیل کیلئے ہے اور مصدریہ ہے اس نے قـل ماضی کو مصدری معنی میں کردیا۔ (اور ممکن ہے کہ کافہ ہو۔ طیبی)

اور یہ ما نافیہ کے معنی میں ہے کیونکہ غایت قلت کا حاصل عدم اور نفی ہے اور آگے آنے والا حرف استثناء بھی اسی کی تائید کر رہا ہے۔ (مرقاۃ)

فرماتے ہیں کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت کم تقریر فرمائی، یعنی ایسی تقریر بہت کم ہی ہوئی جس میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ نہ فرمایا ہو کہ: "**لا ایمان لمن لا امانة له.**

امانت ایسی چیز ہے کہ جس کو اس کا خیال نہیں اس کا ایمان نہیں ہے۔

امانت کی قسمیں

ایک امانت تو یہ ہے کہ کوئی انسان میرے پاس آتا ہے تو مجھ پر حق ہے کہ میں ذرا اس کے اکرام میں اٹھ جاؤں، نہیں اٹھتا تو گویا اس کے حق میں خیانت کی، گرچہ یہ معمولی درجہ کی خیانت ہے۔

دوسری امانت یہ ہے کہ مال میں امانت کا معاملہ کرے یعنی اگر کسی کی کوئی چیز بغیر ارادہ کے ہمارے گھر آ گئی تو ہم پر ضروری ہے کہ اس چیز کو اس کے گھر پہنچا کر آئیں۔

ایسے ہی کوئی شخص کسی کے پاس اپنا پیسہ یا سامان بطور امانت رکھتا ہے، یہ بھی امانت ہے، اس کو جوں کا توں واپس کرنا تقاضائے امانت ہے۔ اسی طرح ہر بندہ پر دوسروں کے جو حقوق واجب ہیں، وہ بھی امانت ہیں، مثلاً اولاد پر والدین کا حق والدین پر اولاد کا حق، میاں بیوی پر ایک دوسرے کا حق، اسی طرح رشتہ داروں کے حقوق پڑوسیوں کے حقوق، یہ سب بھی امانت ہیں۔ ان حقوق کو ادا کرنا امانت ہے، اگر ادا نہیں کیا تو خیانت ہوئی، اسی طرح ملازم کے لئے ملازمت کا وقت طے ہوا ہے، پورے وقت میں کام کرنا، امانت ہے، ورنہ خیانت، اسی طرح مالک کے ذمہ لازم ہے کہ مزدوری وقت پر ادا کرنا اور پوری ادا کرنا تقاضائے امانت

ہے، اگر ایسا نہیں کیا تو یہ بھی خیانت ہے۔

خیانت کا وبال

اور دیکھو جو خیانت کرتا ہے تو قیامت میں تین نئے پیسے کے بدلے میں سات سو مقبول نمازیں ادا کرنی پڑیں گی۔

امانت سے کیا مراد ہے

اب یہاں امانت سے کیا مراد ہے اس میں مختلف اقوال ہیں، بعض کہتے ہیں کہ اس سے طاعت مراد ہے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سے اداءِ فرائض مراد ہیں، زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ اس سے صلوٰۃ وصوم اور اغتسال من الجنابت مراد ہے، اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد عقل دیکر مکلف بنانا ہے کہ ایمان وہدایت کا ایک تخم جو قلوب بنی آدم میں بکھیر دیا گیا، اسی کی نگہداشت کرنے سے ایمان کا پودا اُگے اور بڑھے، پھولے پھلے اور آدمی کو اس کے ثمرۂ شیرین سے لذت اندوز ہونے کا موقع ملے، اسی کو حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں بیان کیا گیا اور ''انا عرضنا الامانة علی السموات والارض الخ'' میں بھی امانت مراد ہے۔ اور بعض نے کہا کہ امانت سے عهد الست مراد ہے، جس کو ''واذ اخذ ربک من بنی آدم'' الآیہ میں بیان کیا گیا، ان دونوں صورتوں میں ''لاایمان'' میں اصل ایمان کی نفی مراد ہوگی، اگر اس سے امانت مع الناس مراد ہو تو کمال ایمان کی نفی ہوگی۔ (مرقاۃ)

اور تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد بھی امانت کے مفہوم میں داخل ہیں، پس جو شخص ان سب کو جتنا جتنا ادا کریگا، اسی درجہ اس کا ایمان کامل ہوگا، اور جتنی جتنی کوتاہی کریگا اسی درجہ اس کے ایمان میں نقصان ہوگا۔ فقط

ولا دین لمن لا عهد له: اس شخص کا دین ہی نہیں جس کو عہد نہیں جو شخص عہد کو پورا نہ کرے اس کا دین درست نہیں ہے۔

عہد سے جائز وعدہ مراد ہے، یہ نہیں کہ غلط اور نا جائز وعدہ کرے تو اس کو بھی پورا کرے، وعدے چاہے اللہ تعالیٰ کے ہوں یا مسلمانوں کے یا غیر مسلموں اور دوسری چیزوں کے۔

اشکال مع جواب

اشـکـال: اس روایت پر اشکال یہ ہے کہ یہ معتزلہ کی مؤید ہے کیونکہ وہ اعمالِ صالحہ کو حقیقتِ ایمان میں داخل قرار دیتے ہیں۔

جـــواب: اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت میں "لا" نفی کمال کے لئے ہے جیسا کہ "**لاصلوٰة لجار المسجد الا فی المسجد**" اور "**لاعیش الا عیش الآخرة**" میں ہے اور اس پر قرینہ حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ماقبل میں گذری ہوئی روایت ہے جس میں ہے **وان زنی وان سرق**۔

یا مطلب یہ ہے کہ خیانت اور نقض عہد جس کی عادت ہو جائے اس کے کفر میں پہنچنے کا خدشہ قوی ہو جاتا ہے۔ (مرقاة: ۹۳/۱، تحفۃ المرأۃ: ۱۳۰)

قوله لا دین لمن لا عهد له: اگر عہد سے عہد مع الناس مراد ہے تو اس نفی سے کمال دین کی نفی مراد ہوگی۔ اور اگر اس سے عہد مع اللہ مراد ہے۔ تو وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو تمام ذریات آدم سے روز ازل میں لیا گیا تھا۔ وہ اللہ کی ربوبیت پر، کمافی قوله تعالیٰ "**واذ اخذ ربک**" جیسا کہ "**قلنا اهبطوا منها جمیعا**" الآیة تو پہلی قسم کے اعتبار سے نفی اصل دین ہوگی اور دوسری قسم کے اعتبار سے نفی کمال دین ہوگی۔ (مرقاة)

﴿الفصل الثالث[۱]﴾

﴿کلمہ توحید نجات کا ضامن ہے﴾

﴿۳۲﴾ وَعَنْ عُبَادَةَ ابْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالیٰ عنه قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالیٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّداً رَّسُولُ اللّٰهِ، حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ النَّارَ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف ص ۴۳/۱، باب الدلیل علی ان مات علی التوحید الخ، کتاب الایمان، حدیث نمبر: ۲۹۔

ترجمہ: حضرت عبادۃ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے سچے دل سے اسکی گواہی دی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کی آگ حرام کردے گا۔

تشریح: قولہ عن عبادۃ الخ: حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے معبود ہونے کی واحد ہونے کی شہادت دے۔

---

[۱] اس باب میں ان روایات کا تذکرہ ہے جن کو صاحب مشکوۃ خطیب تبریزیؒ نے بڑھایا ہے چاہے وہ شیخین کی روایت کردہ ہوں یا ان کے علاوہ اصحاب سنن کی، نیز مرفوع ہوں یا موقوف ہوں یا مقطوع ہوں۔

(مرقاۃ مع زیادۃ: ۱/۹۳)

افلاطون کی تردید

ایسے خدا نہیں جیسا کہ افلاطون وغیرہ نے مانا کہ اس نے عقل اول کو پیدا کیا عقلِ اول نے عقلِ ثانی کو اسی طرح عقل عاشر کو پیدا کیا۔ اور پھر اللہ میاں سو گئے اور اب پتہ نہیں کہ کہاں سو رہے ہیں، تو ایسا ماننا نہیں۔

معتزلہ وخوارج کی تردید

اس حدیث سے بھی رد ہوتا ہے معتزلہ اور خوارج پر کہ مدار جنت صرف ایمان نہیں، بلکہ اعمال ہیں ایمان ایک علیحدہ حقیقت ہے اور اعمال مستقل ایک حقیقت ہے۔

یہود ونصاریٰ کی تردید

اور نہ ایسا ماننا جیسا یہود ونصاری نے مانا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد بنالی، بھلا ان لوگوں کے ان نبیوں کے سترہ سترہ ہوں اور اللہ پوری محنت کے ساتھ ایک ہی بنائے، تو یہ بھی مراد نہیں اور ایسا بھی مراد نہیں جیسا کہ مشرکین مانتے ہیں، بلکہ وہ ماننا معتبر ہے جو ان تمام اوصاف کے ساتھ ہو جو قرآن وحدیث میں مذکور ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کو ماننے کے لئے ضروری ہیں، یعنی فرشتوں کو ماننا آخرت پر ایمان لانا وغیرہ۔ اور ایسے ہی حضرت نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شہادت دے کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، تو اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کو حرام فرما دیتے ہیں۔

اس پر جہنم حرام فرمانے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ بالکل جہنم میں نہیں جائیگا۔ یہ تو اسوقت ہے جبکہ اس نے اس شہادت کا پورا حق ادا کیا ہو کہ اوامر کو پورے طور پر بجا لایا اور نواہی سے بالکلیہ اجتناب کیا اور اگر ایسا نہیں کیا بلکہ اشیا میں کوتاہی کی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جہنم میں ہمیشہ رہنا حرام کر دیا گیا، بداعمالیوں کی سزا پا کر جہنم سے چھٹکارا ضرور ہوگا یا مراحم خسروانہ کے طور پر کسی کو بلا سزا معاف کر دیا جائے۔

﴿توحید کے اعتقاد پر مرنے والا جنتی ہے﴾

﴿٣٣﴾ وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ (رواه مسلم)

حوالہ: مسلم شریف ص۴۱/۱، باب الدليل على ان من مات على التوحيد الخ، كتاب الايمان، حدیث نمبر ۲۶۔

ترجمہ: حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے اس اعتقاد پر وفات پائی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو وہ جنت میں جائے گا''۔

تشریح: وَعَنْ عُثْمَانَ[1] بْنِ عَفَّانَ قَالَ: ان تمام عبارتوں

[1] عثمان بن عفان بن ابی العاص، القرشی الاموی، امیر المومنین، آپ کی کنیت ابو عبداللہ اور ابو عمر ہے۔ شروع زمانہ میں ہی حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دست حق پرست پر ایمان لے آئے تھے جب تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم میں نہیں پہنچے تھے، دو ہجرتیں فرمائی ہیں، ہجرت حبشہ اور مدینہ دونوں کی جانب آپ نے ہجرت فرمائی ہے۔
جنگ بدر میں حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بیماری کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے تھے، مگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا سہم مرحمت فرمایا تھا اور اسی طرح بیعت رضوان میں بھی شریک نہ ہو سکے تھے، کیونکہ آپ کو مکہ مکرمہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھیجا تھا جب آنے میں تاخیر ہوئی تو وہ بیعت لی گئی، آپ کو ذو النورین کہا جاتا ہے، کیونکہ حضرت رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو دونوں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں ہیں، یکے بعد دیگرے آپ کے نکاح میں تھیں۔
واقعہ فیل کے چھ سال بعد پیدائش، اور ۱۷/ یا ۱۸/ ذی الحجہ ۳۵ھ میں شہید کئے گئے۔ اور ۲۴ھ میں اول محرم کو خلیفہ بنائے گئے تھے، اور ابن اسحاق کی رائے یہ ہے خلیفہ بننے کے گیارہ سال، گیارہ مہینہ بائیس دن بعد آپ کی شہادت ہوئی، اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ (اصابہ ۴۶۲/۲، اکمال: ۶۰۲)

کا تقریباً ایک ہی مضمون ہے، عبارتیں مختلف ہیں۔

یعلم یہاں استیقان کے معنٰی میں ہے۔ اور "لا الہ الا اللہ" سے تمام ایمانیات مراد ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ وہ تمام ایمانیات کا یقین کرتا ہو، اور تسلیم کرتا ہو۔

﴿مشرک جہنمی ہے﴾

﴿۳۴﴾ وَعَنْ جَابِرٍ[1] رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثِنْتَانِ مُوْجِبَتَانِ قَالَ رَجُلٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! مَاالْمُوْجِبَتَانِ؟ قَالَ مَنْ مَاتَ یُشْرِکُ بِاللّٰہِ شَیْئًا دَخَلَ النَّارَ وَمَنْ مَاتَ لَایُشْرِکُ بِاللّٰہِ شَیْئًا دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف ص ۶۶/۱، باب من مات لایشرک باللہ شیئا الخ، کتاب الایمان، حدیث نمبر: ۹۳۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دو باتیں واجب کرنے والی ہیں، ایک شخص نے عرض کیا اے اللہ کے نبی وہ دو واجب کرنے والی کیا چیزیں ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ "جو شخص اس حال میں مرا کہ وہ اللہ تعالٰی کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہراتا ہے تو وہ جہنم میں جائیگا، اور جو شخص اس حال میں مرا کہ وہ اللہ تعالٰی کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا ہے تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔

---

[1] **جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما:** کنیت ابوعبداللہ ہے مدینہ طیبہ کے رہنے والے ہیں بدر اور اس کے علاوہ اٹھارہ غزوات میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے، اخیر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی ۷۸ھ میں مدینہ منورہ میں ۹۴ رسال کی عمر میں وفات پائی، اور ایک قول یہ ہے کہ یہ سب سے آخری صحابی ہیں جن کی مدینہ طیبہ میں وفات ہوئی، (اکمال: ۵۸۹)

تشریح: ثنتان کا ہمزہ گرادیا یعنی اثنتان تھا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو چیزیں واجب کرنے والی ہیں، اور یہ فرما کر خاموش ہو گئے، (طلب پیدا کرنے کے لئے) چونکہ طلب کے بعد جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ اچھی طرح ذہن میں بیٹھ جاتی ہے، ایک شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) واجب کرنے والی کیا چیزیں ہیں، اور وہ کس چیز کو واجب کرتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو اس حال میں مرجائے کہ شرک کرتا ہو تو جہنم اس پر واجب ہو جاتی ہے اور جو اس حال میں مرجائے کہ وہ شرک نہ کرتا ہو تو اس پر جنت واجب ہو جاتی ہے۔

یعنی جہنم کا وجوب شرک سے ہوتا ہے، اور عدم شرک جنت کو واجب کر دیتا ہے۔

﴿موحدین کے لئے جنت کی خوش خبری﴾

﴿۳۵﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ: كُنَّا قُعُوداً حَوْلَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَنَا اَبُوبَكْرٍ وَعُمَرُ فِي نَفَرٍ فَقَامَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ بَيْنِ اَظْهُرِنَا فَاَبْطَاَ عَلَيْنَا وَخَشِيْنَا اَنْ يُقْتَطَعَ دُوْنَنَا وَفَزِعْنَا فَقُمْنَا فَكُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ، فَخَرَجْتُ اَبْتَغِيْ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى اَتَيْتُ حَائِطاً لِلْاَنْصَارِ لِبَنِي النَّجَّارِ فَدُرْتُ بِهٖ هَلْ اَجِدُ لَهٗ بَاباً فَلَمْ اَجِدْ، فَاِذَا رَبِيْعٌ يَدْخُلُ فِي جَوْفِ حَائِطٍ مِنْ بِئْرٍ خَارِجَةٍ وَالرَّبِيْعُ الْجَدْوَلُ قَالَ فَاحْتَفَزْتُ فَدَخَلْتُ عَلٰى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَبُوهُرَيْرَةَ فَقُلْتُ نَعَمْ يَارَسُولَ اللّٰهِ قَالَ مَاشَانُكَ قُلْتُ كُنْتَ بَيْنَ

اَظْهُرِنَا فَقُمْتَ فَاَبْطَاْتَ عَلَيْنَا فَخَشِيْنَا اَنْ تُقْتَطَعَ دُوْنَنَا فَفَزِعْنَا فَكُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَاَتَيْتُ هٰذَا الْحَائِطَ فَاحْتَفَزْتُ كَمَا يَحْتَفِزُ الثَّعْلَبُ وَهٰؤُلَاءِ النَّاسُ وَرَائِي فَقَالَ يَا اَبَاهُرَيْرَةَ وَاَعْطَانِي نَعْلَيْهِ فَقَالَ اِذْهَبْ بِنَعْلَيَّ هَاتَيْنِ، فَمَنْ لَقِيْكَ مِنْ وَرَاءِ هٰذَا الْحَائِطِ يَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِناً بِهَا قَلْبُهُ فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ فَكَانَ اَوَّلُ مَنْ لَقِيْتُ عُمَرَ فَقَالَ مَا هَاتَانِ النَّعْلَانِ يَااَبَاهُرَيْرَةَ فَقُلْتُ هَاتَانِ نَعْلَا رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَنِي بِهِمَا مَنْ لَقِيْتُ يَشْهَدُ اَنْ لَااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِناً بِهَا قَلْبُهُ بَشَّرْتُهُ بِالْجَنَّةِ فَضَرَبَ عُمَرُ بَيْنَ ثَدْيَيَّ فَخَرَرْتُ لِاِسْتِي فَقَالَ اِرْجِعْ يَااَبَاهُرَيْرَةَ فَرَجَعْتُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَجْهَشْتُ بِالْبُكَاءِ وَرَكِبَنِي عُمَرُ وَاِذَا هُوَ عَلٰى اَثَرِي فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَالَكَ يَااَبَاهُرَيْرَةَ قُلْتُ لَقِيْتُ عُمَرَ فَاَخْبَرْتُهُ بِالَّذِيْ بَعَثْتَنِي بِهٖ فَضَرَبَ بَيْنَ ثَدْيَيَّ ضَرْبَةً خَرَرْتُ لِاِسْتِي فَقَالَ اِرْجِعْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاعُمَرُ مَاحَمَلَكَ عَلٰى مَافَعَلْتَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ بِاَبِي اَنْتَ وَاُمِّي اَبَعَثْتَ اَبَاهُرَيْرَةَ بِنَعْلَيْكَ مَنْ لَقِيَ يَشْهَدُ اَنْ لَااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهُ بَشَّرَهُ بِالْجَنَّةِ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَلَا تَفْعَلْ فَاِنِّي اَخْشٰى اَنْ يَّتَّكِلَ النَّاسُ عَلَيْهِ فَخَلِّهِمْ يَعْمَلُوْنَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَلِّهِمْ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف ص ۴۴/۱، باب الدلیل علی من مات علی التوحید الخ، کتاب الایمان، حدیث نمبر: ۳۱۔

حل لغات: النفیر، آدمیوں کی تین سے لیکر دس تک کی جماعت، ج انفار، ابطأ علی احدٍ، دیر سے آنا، افعال سے۔ خشینا، خشی (س) خشیة، ڈرتے رہنا، فزعنا، فزع (س) فزعا ڈرنا، گھبرانا، ابتغی (واحد متکلم فعل مضارع) چاہنا، تلاش کرنا،

الحائط، دیوار، باغ، ج حیطان، وحوائط، الربیع چھوٹی نہر، نالی، ج اَرْبِعَاءُ وَرِبَاعٌ، بِئرٌ کنواں، ج آبَار وبِئارٌ، الجدول آب پاشی کی چھوٹی نہر فاحتفزت مصدر احتفاز سمٹ کر بیٹھنا، کودنے کے لئے تیار ہونا، تقتطع کٹوتی، وضع کردگی، مراد حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نقصان پہنچنا، الثَّعْلَبُ، لومڑی، بعثنی، بعث بشیئ بعثة (ف) کوئی چیز بھیجنا، ثدئی پستان تثنیہ ہے ج اثدو ثُدِیَ خررت، خر (ض ن) الشیئ گرنا، ساجداً سجدہ میں گرنا، قرآن میں ہے۔ وخر وله سجداً، اَجْهَشْتُ، اجهش للبکاء، وبالبکاء رونے کا ارادہ کرنا، جهش الصبی الی امه (س) جهشا ماں کے پاس ڈر کر جانا، حمل (ض) علی شیء ابھارنا داعی ہونا، سبب بننا، فخلهم، خل خلا الابل اونٹ کو ہانکنا، مراد یہاں تنہا چھوڑ دینا ہے۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم چند صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے اور ہمارے ساتھ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی تھے کہ اچانک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان سے اٹھے اور کہیں تشریف لے گئے، جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تشریف لانے میں تاخیر ہوئی تو ہمیں تشویش ہوئی کہ ہماری عدم موجودگی میں کہیں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تکلیف نہ پہنچ جائے۔ ہم گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے، چونکہ سب سے پہلے گھبرانیوالا میں تھا، اس وجہ سے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا یہاں تک کہ میں بنی نجار کے ایک انصاری کے باغ کے پاس آ گیا، میں دروازے کی تلاش میں اس باغ کے چاروں طرف گھوما، لیکن مجھے دروازہ نظر نہیں آیا، اچانک ایک نالی پر میری نگاہ پڑی جو باہر کے کنویں سے باغ کے اندر جارہی تھی، لہٰذا میں سمٹ سکڑ کر اس نالی میں داخل ہوا، اور اس کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گیا، آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ابو ہریرہ تم؟ میں نے کہا جی ہاں یا رسول اللہ! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کیا بات ہے؟ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) آپ ہمارے درمیان موجود تھے، پھر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اٹھ کھڑے ہوئے، جب آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہمارے پاس تشریف لانے میں بہت تاخیر ہوئی تو ہم گھبرا گئے کہ کہیں ہماری عدم موجودگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ تکلیف نہ پہنچ جائے اور سب سے پہلے یہ تشویش مجھے لاحق ہوئی، چنانچہ میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تلاش میں اس باغ تک آ گیا، پھر میں لومڑی کی طرح سمٹ کر اس باغ میں داخل ہو گیا، اور بقیہ لوگ میرے پیچھے آرہے ہیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابو ہریرۃ! اور مجھے اپنی دونوں جوتیاں مبارک عنایت فرمائیں، اور ارشاد فرمایا: کہ میری یہ دونوں جوتیاں لے کر جاؤ اور اس دیوار کے پیچھے جو شخص بھی تم سے اس حال میں ملے کہ وہ صدق دل سے کلمہ "لاالـــــہ الا اللہ" کی گواہی دے رہا ہو اس کو جنت کی خوش خبری سنادو، حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں میری سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات ہوگئی، انہوں نے فرمایا: کہ ابو ہریرہ یہ جوتیاں کیسی ہیں؟ میں نے کہا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیاں ہیں، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ جوتیاں دیکر مجھے بھیجا ہے کہ جو شخص صدق دل اور پختہ اعتقاد کیساتھ یہ گواہی دیتا ہوا ملے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو میں اس کو جنت کی بشارت دیدوں۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میرے سینے پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ میں سرین کے بل نیچے گر گیا اور پھر انہوں نے کہا کہ ابو ہریرہ واپس چلے جاؤ، چنانچہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور میرے اوپر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خوف طاری تھا کہ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آ گئے، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ابو ہریرہ کیا ہو گیا؟ میں نے کہا کہ اے

اللہ کے رسول سب سے پہلے میری ملاقات عمرؓ سے ہوئی، میں نے ان کو آپکا وہ پیغام جو آپ نے مجھے دیا تھا سنادیا، تو انہوں نے میرے سینے پر اتنی زور سے مارا کہ میں سرین کے بل گر پڑا، اور کہا کہ واپس ہو جاؤ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر تم نے ایسا کیوں کیا؟ عمر نے کہا کہ آپ پر میرے ماں باپ قربان، کیا آپ نے واقعی ابو ہریرہؓ کو اپنی جوتیاں دیکر بھیجا تھا کہ جو شخص صدق دل سے "لا الـــہ الا اللہ" کہتا ہوا ملے اس کو جنت کی خوشخبری دیدو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں، عمرؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ایسا نہ کیجئے مجھے ڈر ہے کہ لوگ کہیں اسی بشارت پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں، آپ ان کو عمل میں لگا رہنے دیجئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھیک ہے عمل میں لگا رہنے دو۔

تشریح: حول: یہاں عند کے معنی میں ہے۔

قعود: یہاں مصدر نہیں ہے بلکہ قاعد کی جمع ہے جس طرح سجود ساجد کی جمع ہے۔ اسی لئے تو قعود کا کُنَّا کی خبر بنا صحیح ہو گیا ہے۔

اور ہمارے پاس ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما بھی موجود تھے، معلوم ہوا کہ یہ دونوں حضرات خصوصی امتیاز رکھتے تھے، جب ہی تو ان کو علیحدہ ذکر کیا ہے۔ حالانکہ کُنَّا میں سب داخل تھے۔ یعنی یہ خواص حضرات تھے اور حاضرین کے بدل جانے سے مجلس کا رنگ بدل جاتا ہے۔

نفر: ایک جماعت، مختلف افراد۔[1]

---

[1] فی نفر: نفر بمعنی جماعت ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جماعت کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ (مرقاۃ)

معنا ابو بکر وعمر: مع بمعنی ساتھ ہے اور یہ عین کے فتحہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور کبھی کبھی سکون عین کے ساتھ بھی استعمال کرتے ہیں لیکن اگر اس کے بعد الف لام یا ہمزہ وصل ہو تو مفتوح ہی استعمال ہوتا ہے۔ (ابی مع سنوسی ۱/۲۰۲)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر حضرات شیخین ابو بکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا تذکرہ فصاحت کلام کے قبیل سے ہے اسلئے کہ جب ایک جماعت کو شمار کرنا چاہتے ہیں تو سب کے نام لینے کے بجائے اسکے چند اشراف کا تذکرہ کر دیتے ہیں۔ (نووی: ۱/۲۰۶، رقم: ۵۲)

من بین اظھرنا: ہمارے درمیان سے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر تشریف لے گئے بغیر کچھ کہے ہوئے۔ (اصل معنی من بیننا ہیں اور اظھر کو تاکید کے لئے زائد کیا گیا ہے۔ مرقاۃ)

صدر مجلس کا بلا کچھ کہے اٹھ کر جانا

فائدہ اول: معلوم ہوا کہ صدر مجلس، مجلس کا بڑا آدمی کبھی کسی ضرورت اور کسی مصلحت کی وجہ سے بغیر کچھ کہے بھی اٹھ کر چلا جائے تو، یہ بھی سنت کے خلاف نہیں ہے۔

اور تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بیٹھے رہے۔

طالبین کو صدر مجلس کا انتظار کرنا

فائدہ دوم: اس سے معلوم ہوا کہ صدر مجلس جب اٹھ کر چلے جائیں تو ان کے انتظار میں بیٹھا رہنا چاہئے، ایسے ہی اپنا استاد یا اپنا شیخ کسی ضرورت کی بنا پر بتائے بغیر چلا جائے تو طلباء اور سالکین و طالبین کو انتظار میں بیٹھے رہنا چاہئے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف آوری میں دیر فرمائی، بہت دیر ہوگئی۔

محبت میں بے چینی

فائدہ سوم: ایسے موقع پر جس انسان کو محبت ہوتی ہے وہ تقاضہ طبیعت کے تحت گھبرا جاتا ہے اس لئے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو تشویش ہوئی، چونکہ اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہر وقت گھات میں رہتے تھے۔ خیال ہوا کہ کہیں دشمن تکلیف نہ پہنچادیں، آپ کو ہم سے جدا یعنی شہید نہ کردیں[1] گھبرا گئے اور جب گھبراہٹ ہوتی ہے تو انسان بے چین ہوجاتا ہے آپ کی تلاش میں نکل گئے۔

---

[1] یعنی ہم آپ کے پاس نہ ہوں، آپ سے دور ہوں، دشمن آپ کو قید وغیرہ..... (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے گھبرانے والا میں ہوں یعنی سب سے زیادہ محبت مجھ کو ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اس لئے مجھ کو سب سے زیادہ گھبراہٹ ہوئی۔

چونکہ ان میں سے ہر انسان یہی سمجھ رہا تھا کہ میں اول گھبرانے والا ہوں، یعنی سب سے زیادہ محبت آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مجھ ہی کو ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ محبت فرماتے تھے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین یہی خیال فرماتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ محبت مجھ سے فرماتے ہیں۔

واقعہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مصر کو فتح کرکے آئے اور پوچھا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! آپ کے نزدیک زیادہ محبوب کون ہے ان کا خیال تھا کہ سب سے زائد محبوب

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)......کر کے یا کسی دوسرے طریقہ سے تکلیف پہنچادیں، اور خشیۃ کے معنی خوف مع تعظیم کے آتے ہیں، (نووی:۱/۳۰۶، مرقاۃ)

علامہ ابیؒ شرح مسلم میں اور اسی طرح علامہ سنوسیؒ ان کی اتباع میں یہ فرماتے ہیں کہ اگر آیت "واللہ یعصمک من الناس" کے نازل ہونے سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا ہے تب تو واضح ہے لیکن اگر آیت کے نزول کے بعد یہ واقعہ پیش آیا ہے تو یہ فرط محبت کی دلیل ہے، محب اپنے محبوب کی جدائی سے پریشان ہوتا ہی ہے۔ (ابی مع سنوسی:۱/۳۰۲)

علامہ طیبیؒ کی رائے یہ ہے کہ اس مقام پر خشینا اور فزعنا دونوں مترادف ہیں استمرار کے ارادہ کے پیش نظر مترادفین کا عطف کیا گیا ہے اور ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ جب تاسیس تاکید سے اولیٰ ہے تو بہتر یہ ہے کہ خشیت سے مراد خوف باطن اور فزع سے مراد اضطراب ظاہر لیا جائے۔ (مرقاۃ:۱/۹۴)

میں ہی ہوں گا مگر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابو بکر پھر دوسرے جواب میں عمر پھر تیسرے میں عثمان پھر سوال بند کر دیا اب تو چوتھے نمبر پر خود کو خیال کرتا رہوں گا۔ ورنہ معلوم نہیں کہاں نمبر آئے۔

گھبراہٹ زیادتیٔ محبت کی علامت نہیں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھبرا گئے اور گھبرا جانا بھی زیادہ محبت کی علامت نہیں ہے کیونکہ کبھی گھبراہٹ دل کی کمزوری کی وجہ سے بھی ہو جاتی ہے۔ جیسے جس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو حضرت عمرؓ گھبرا گئے اور آپ نے تلوار نکال لی کہ اگر کسی نے کہدیا انتقال فرما گئے اس کی گردن ماردونگا۔

مگر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کی چادر اٹھا کر دیکھا اور کہا کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایک ہی مرتبہ موت آنیوالی تھی آ گئی، ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بوسہ دیا اور جا کر تقریر شروع فرمادی "وما محمد الا رسول الخ"

حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہادری

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ محبت تھی مگر پھر بھی آپ گھبرائے نہیں بلکہ کوہ وقار اور استقلال بنے رہے، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بہادری کے واقعات تو بہت مشہور ہیں۔ مگر پھر بھی اگر بغور دیکھا جائے اور گہرائی سے سوچا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ بہادر تھے۔ مگر ان کا وہ وصف زیادہ ممتاز نہ تھا۔

تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہی آپ صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ محبت تھی، بہر حال حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تلاش کرنے لگے اور چونکہ کسی کو بھی تلاش وہیں کیا جاتا ہے جہاں اس کی جگہ ہوتی ہے جہاں وہ اٹھتا بیٹھتا ہے۔

حضرت نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کبھی کبھی بنو نجار کے باغ میں تشریف لے جایا کرتے تھے، چونکہ وہ باغ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ننہال کا تھا۔

حائط: ایسے باغ کو کہتے ہیں جس کی چہار دیواری ہو رہی ہو۔ لیکن اس پر چھت نہ ہو۔ (نووی: ۱/۲۰۷)

بنی نجار: یہ عطف بیان ہے اور بدل البعض ہے انصار کا چونکہ یہ ایک انصار کا قبیلہ ہے۔

فدرت: پس میں اس کے چاروں طرف چکر لگانے لگا، دروازہ تلاش کرنے کے لئے، اور دل میں یہ سوچتا رہا "ھل اجد له بابا" (مرقاۃ)

اور چونکہ گھبراہٹ کی وجہ سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دروازہ ہوتا ہے اور پھر بھی پتہ نہیں چلتا۔ گھر میں کوئی انسان اٹھتا ہے اور اس میں روشنی نہ ہو اور پیشاب آ رہا ہو تو وہ بیچارہ دروازہ تلاش کرتا ہے مگر دروازہ نہیں ملتا، پریشان ہو جاتا ہے۔ تو باوجودیکہ باغ کا دروازہ تھا اسی دروازہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اندر تشریف لے گئے تھے، مگر پھر بھی نہ ملا اب کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح وہاں پہونچوں۔

یہ منطق و فلسفہ نہیں ہے کہ دروازہ ہو اور پھر نہ ملے یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ تو کسی اہل محبت سے پوچھو جس کو اس سے واسطہ پڑا ہو۔

بہر حال باغ میں ایک جدول[1] یعنی نالی جا رہی تھی، انہوں نے سوچا کہ کس طرح باغ

---

[1] ربیع: کی تفسیر بعض رواۃ نے جدول سے کی ہے جو آگے روایت میں خود ہی آ رہی ہے اور اس کا ترجمہ اردو میں "کول" سے کیا جاتا ہے یعنی وہ نالی جو کھیت اور باغ وغیرہ میں ہوتی ہے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں پہونچوں، بڑی مشکل تھی چونکہ مطلوب بڑا عظیم تھا جس کے واسطے جان دیدینا بھی آسان تھا، اور جب کسی مقصد کی عظمت ذہن میں ہوتی ہے تو انسان بڑی سے بڑی مشکل کو سر کر لیتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی عصمت محبوب تھی چنانچہ جب زلیخا نے آپ کو سات تالوں میں بند کر دیا اور آپ نے ہمت بھر کر کوشش کی اور دوڑ پڑے تو ساتوں تالے کھل گئے۔

کیونکہ زلیخا کو یوسف علیہ السلام محبوب تھے اور یوسف علیہ السلام کو اپنی عصمت محبوب تھی۔

بہر حال حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یقین نہیں تھا کہ آپ اسی باغ میں تشریف فرما ہیں، صرف خیال تھا کہ شاید یہاں ہوں، اور جب کسی کو کچھ محبت ہوتی ہے تو محبوب کی کچھ نہ کچھ بو اس کو آ ہی جاتی ہے دو دن بعد بھی پتہ چل جاتا ہے کہ کوئی اس راستہ سے گیا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام سے محبت تھی جس کی وجہ سے آپ کو مصر سے یوسف کے کرتے کی خوشبو آ گئی تھی۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) في جوف حائط: یعنی اس باغ کی چہار دیواری میں سے ایک نالی گزر رہی تھی۔ **(مرقاۃ:۱/۹۵)**

من بئر خارجه: امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ عبارت تین طرح سے ضبط کی گئی ہے۔

(۱) بئرٍ خارجةٍ: بئر اور خارجۃ دونوں کی تنوین کے ساتھ، موصوف اور صفت ہونے کی بناء پر۔ حافظ ابن الصلاح نے مسلم شریف کے رواۃ کی کاپیوں سے اس طرح نقل کیا ہے۔

(۲) بئرٍ خارجه: بئر کی تنوین، اور خارج کی ضمیر کی جانب اضافت کے ساتھ، ضمیر کا مرجع حائط ہے اور خارج حائط کی صفت ہونے کی بناء پر مرفوع ہے۔

(۳) بئرِ خارجةَ: بئر کی خارجۃ کی جانب اضافت کے ساتھ، اس صورت میں خارجہ کسی شخص کا نام ہوگا اور اس کے نام پر کنویں کو بئر خارجہ کہا جاتا ہوگا۔

امام النوویؒ نے پہلی روایت کو راجح قرار دیا ہے اور بعض دیگر علماء نے تیسری روایت کو راجح قرار دیا ہے۔

(نووی:۱/۲۰۶، ابی مع سنوسی:۱/۲۰۲)

احتفزت:[1] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ پس میں سکڑ گیا اور اس نالی سے اندر داخل ہوگیا۔

ابو ہریرہ اندر چلے گئے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ابو ہریرہ کو دیکھا اور فرمایا ابو ھریرہ!.

قال کا فاعل ابو ہریرہ نہیں ہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خبر ہے انت محذوف کی یعنی آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: "انت ابو ھریرۃ"[2]

فقلت نعم یا رسول اللہ! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)

چونکہ اتنی دیر میں ہی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے چہرے پر پریشانی ظاہر ہوگئی تھی، جس کو کسی سے محبت ہوتی ہے ذرا سی دیر میں اس کے حال پر جو گذرتی ہے پس اس کو تو وہی جانتا ہے۔

چونکہ ابو ہریرہ گھبرا رہے تھے پریشان تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔

ماشانک یا ابا ھریرۃ [تیرا کیا حال ہے]

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا یا رسول اللہ! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) آپ ہمارے درمیان میں بیٹھے ہوئے تھے آپ اٹھ کر چلے آئے اور واپسی میں دیر ہوگئی اس لئے ہم سب گھبرا گئے اور سب سے پہلے گھبرانے والا حضرت جی میں ہی تھا۔

---

[1] احتفزت: مسلم شریف کے رواۃ اس لفظ کی روایت میں مختلف ہیں، بعض نے "راء مہملہ" کے ساتھ فاحتفرت ضبط کیا ہے اور بعض نے "زاء معجمہ" کے ساتھ "فاحتفزت" نقل کیا ہے۔ امام نووی، ابن الصلاح، قاضی عیاض، قرطبی وغیرہ محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ اصلاً زاء معجمہ کے ساتھ ہے یعنی لومڑی کی طرح سکڑ کر باغ میں پہنچا۔ (نووی: ۱/۲۰۸)

[2] قولہ فقال ابو ھریرۃ: یہ استفہام یا تقریر کے لئے ہے یا تعجب کے لئے کہ دروازے بند ہونے کے باوجود تم کیسے یہاں آگئے؟ یا حقیقت پر محمول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بشریت سے معدوم ہو کر اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم میں مستغرق تھے۔ بناء بریں پہچاننے میں دیر ہوئی۔ بناء بریں دریافت فرمایا۔ (درس مشکوۃ)

اظہار محبت

فائدہ: معلوم ہوا کہ انسان اپنی محبت کو ذکر کردے جتنی محبت ہو اس کو ظاہر کردے۔ مگر جتنی محبت ہو اتنی ہی ظاہر کرے، آج کل کی طرح نہیں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بیان کیا کہ یا رسول اللہ میں لومڑی کی طرح سکڑا اور اندر آ گیا۔

اشکال مع جواب

اشکال: اس پر اشکال یہ ہے کہ دوسرے کے یہاں بلا اجازت وہ کیسے ایک مخفی راستے سے گھس گئے؟

جواب: بعض علماء نے اس کا جواب دیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے گم ہو جانے کا ان پر اس قدر اثر تھا کہ ان کو اجازت لینے کی سوجھی ہی نہیں۔ اسلئے معذور تھے۔

تو ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرے پیچھے دوسرے صحابہ بھی موجود ہیں، بیقرار ہیں۔ گرچہ آپ کو سب کی محبت کا پتہ تھا۔ مگر آج مشاہدہ ہو گیا۔ تو آپ کو اس سے خوشی ہوئی۔

محبت کا بدلہ

فائدہ: معلوم ہوا کہ محبت کا بدلہ دینا چاہئے۔ محبت کا بدلہ محبت ہی ہوتا ہے اور کچھ بھی نہیں۔

اس لئے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خوش خبری دی اور بطور شہادت کے اپنے جوتے مبارک دیدئے۔

سند کا ثبوت

فائدہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابو ہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نعلین مبارک دیکر بھیجنا اس لئے تھا کہ لوگ ان پر پورا اطمینان کرلیں کہ آنخضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس سے آرہے ہیں اور صلی اللہ علیہ وسلم بعافیت ہیں اگرچہ ان کی خبر اس کے بغیر بھی مقبول تھی اور چونکہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی اور چیز نہیں تھی اس لئے نعلین مبارک ہی کو دیدیا۔

یا اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ امم سابقہ میں جو قیود تھیں ان کو اٹھا کر تسہیل و تشہیر کے لئے امت محمدیہ پر آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا ہے جو نعلین کھولدینے سے مستفاد ہے۔

"قال اللہ تعالیٰ وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعلمین" (طیبی:۵/۱۷۵، کتاب الایمان)

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ قاصد کو کوئی نشانی قاصد ہونے کی دیدینی چاہئے، آج کل تو لکھ کر دے سکتے ہیں۔ اس سے طلباء فارغین کو سند دینے کا جواز بلکہ مسنون ہونے کا ثبوت نکل آیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑے خوش تھے، چونکہ آج ترجمانِ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور قاصد بنے ہوئے تھے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان بنے ہوئے تھے۔

تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک جوتوں کو لیکر باہر آئے تو سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملے یہ تو بہت خوش تھے کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ بات سنکر بڑے خوش ہونگے۔

شان فاروقی

مگر ان کا مزاج تو کچھ اور ہی تھا، شان فاروقی ان پر غالب تھی، اور پھر آنخضرت صلی

اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مبارک جوتوں کو دیکھا تو اور بھی زیادہ گھبرا گئے کہ شاید آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم شہید نہ کردیئے گئے ہوں، تبھی تو ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خالی جوتے لئے آرہے ہیں، زور سے پوچھا کہ یہ جوتے کیسے ہیں؟

انہوں نے جواب دیا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے اور یہ بات کہی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس زور سے ان کے دھول مارا کہ گر پڑے۔ ترجمان نبوت ہی مار سکتا ہے اس وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس زور سے دھول مارا کہ وہ سرین کے بل گر پڑے اور کہا کہ چل یہاں سے۔[1]

یہ فوراً اٹھکر چلدئے اور کہیں تو راستہ نہ ملا سیدھے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس تشریف لے گئے۔ اور رونا شروع کیا۔

فاجھشت بالبکاء: خوب بارش شروع کردی اور اس کے ساتھ اور جھڑی لگادی اس سے پہلے نہیں روئے، اگر روتے تو اور لگتا۔

نیز ایسی حالت میں اپنے محبوب اور اپنے مربی و سرپرست کے پاس پہونچ کر زیادہ رونا آتا ہے، جیسے کسی بچہ کو کوئی دوسرا بچہ مار دیتا ہے وہ سیدھا اپنی اماں کے پاس پہونچتا ہے، اور اماں کے پاس پہونچ کر رونا شروع کردیتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مارنیکی وجہ

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس زور سے بریک مارا کہ گاڑی وہیں رک گئی،

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بشارت لوگوں کو پہنچانا چاہی تھی ابو ہریرہؓ کے ذریعہ اس کا تعلق عقیدہ توحید اور ایمان باللہ میں اخلاص اور پختگی کے ساتھ تھا کسی مسئلہ کی مشروعیت کی بات نہیں تھی کسی فرض اور واجب کو بیان کرنا نہیں تھا وہ تو محض رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و محبت کا ایک جذبہ تھا جو اہل ایمان کیلئے بے اختیار امنڈ آیا تھا۔ (مظاہر حق جدید: ۱۰۳/۱، ایمان کے ابواب)

چونکہ آپ رضی اللہ عنہ ڈرائیور تھے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "لو کان نبیا بعدی لکان عمر" یعنی اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتے تو عمر ہوتے۔

اگر امت کے لئے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد ڈرائیور کی ضرورت پڑتی تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ڈرائیور ہوتے۔ (مرقاۃ المفاتیح، کتاب الایمان:۱/۱۱۳) الحدیث (مرقاۃ:۱۱/۳۰۲، باب مناقب عمر)

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو گاڑی مالک ہیں اور یہ اُس کے ڈرائیور۔

اور بریک لگانے کا حق ڈرائیور کو ہوتا ہے مالک تو پیچھے بیٹھا ہوا ہوتا ہے، اور ڈرائیور بریک لگانا مناسب سمجھتا ہے جبکہ وہ کوئی خطرہ محسوس کرے، اگرچہ اس وقت مالک چلانے کو کہتا رہے مگر بعد میں مالک بھی خوش ہوگا۔

ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بریک لگایا کہ گاڑی وہیں رک گئی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کے پاس آئے اور واقعہ بیان کیا۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت فرمایا: کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟

انہوں نے جواب دیا کہ لوگ اس پر تکیہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ یا نبی اللہ! بات صحیح ہے مگر میرا یہ مشورہ ہے کہ ابھی اس قانون کو نافذ نہ کیا جائے۔ ابھی اس کے نفاذ کا وقت نہیں آیا۔

اور اس سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حضرت نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقابلہ میں فوقیت ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ یہ ڈرائیور تھے اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مالک اور گاڑی چلاتے وقت ڈرائیور کی رائے کو ترجیح ہوتی ہے۔

جب وہ خطرہ محسوس کرے تو اس کو ضروری ہے کہ فوراً بریک لگادے چاہے مالک کا

مشورہ نہ ہو، اور اس دھول کے بدلہ کا ذکر نہیں کیا، چونکہ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مربی تھے اور مربی سے بدلہ نہیں لیا جاتا اس وجہ سے اس کو ذکر نہیں کیا۔

اور پھر یہ کہ آپ نے دھول ہی کیوں مارا؟ ویسے ہی منع کر دیا ہوتا یا سمجھا دیا ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب گاڑی چلتی ہوئی ہوتی ہے تو زور سے بریک لگانا پڑتا ہے چاہے پہیہ میں نقصان ہوجائے مگر خطرہ کے وقت بریک لگانا ضروری ہوتا ہے اور جب گاڑی تیز چل رہی ہو تو اور بھی زیادہ زور سے بریک لگایا جاتا ہے اس وجہ سے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زور سے بریک لگایا یعنی دھول مارا۔

اگر آپ ایسا نہ کرتے تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ رکتے اور منادی کردیتے، اگرچہ جنت کا مدار شہادت پر ہے، مگر اعمال بھی تو ضروری ہیں۔ (مرقاۃ: ۱/۱۱۴، کتاب الایمان)

اشکال مع جواب

قولہ فضرب عمرؓ بین ثدیی: اس میں دو اشکال وارد ہوتے ہیں۔

(۱) ...... حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کیسے مارا، حالانکہ **المسلم من سلم المسلم الخ** کے پیش نظر ایذاء خلق اللہ حرام ہے حدیث کے رو سے ایک ادنیٰ مسلمان سے بھی یہ کام صادر نہیں ہوسکتا، تو اتنی جلیل القدر ہستی سے کیسے صادر ہو گیا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرائن سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سمجھ لیا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف سے بشارت دینے کا حکم وجوبی نہیں ہے بلکہ صرف مسلمانوں کے قلوب کی تطییب کے لئے تھا۔ ادھر یہ خیال کیا کہ اگر یہ بشارت دیجائے تو اکثر

کمزور مسلمان عمل چھوڑ کر گمراہ ہو جائیں گے۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسلمانوں کے ایمان بچانے کی خاطر ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو واپس کرنے کی تدبیر سوچی تو دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقابلہ میں میرے فقط کہنے سے واپس نہیں جائیں گے تو انہوں نے مارا تا کہ کم سے کم فریاد کرنے کے لئے تو جائیں گے تو میرا منشاء حاصل ہو جائیگا، تو حمیت دینی اور عام ضرر کو دفع کرنے کے لئے ایک فرد کو تکلیف دی اور یہ شرعاً جائز بلکہ مستحسن ہے۔ لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کوئی اشکال نہیں ہے۔

(۲) ......دوسرا اشکال یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دینے کا حکم فرمایا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صاف فرماتے ہیں "لاتفعل" تو ظاہراً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ مقابلہ ہے اور آپ کی عدول حکمی ہوئی اور یہ مسلمان کی شان نہیں چہ جائیکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مختلف شان ہوتی ہے کبھی اللہ تعالیٰ کی صفت جلالیہ کے مظہر ہوتے ہیں تو اس وقت معمولی گناہ پر دوزخ کی تہدید فرماتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا: "من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من کبر دخل النار" اور کبھی صفت جمالیہ کے مظہر ہوتے ہیں تو اس وقت معمولی نیکی پر جنت کی بشارت دیدیتے ہیں۔ تو جب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مخلوق سے الگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی صفت رحم وکرم کے سمندر میں مستغرق ہوتے ہیں اس وقت مخلوق کی کمزوری، کی طرف نظر نہیں پڑتی، تو فقط ایمان پر جنت کی بشارت دیدیتے ہیں، یہاں بھی یہی حالت تھی، بناء بریں بشارت دینے کا حکم فرمایا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس پایہ کے نہیں تھے ان کی نظر مخلوق کی کمزوری کی طرف تھی اس لئے دیکھا کہ اگر بشارت دیدی جائے تو اکثر لوگ نہ سمجھ کر عمل ترک کر کے گمراہ ہو جائیں گے، تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی

فوت ہوجائے گا، تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا اور آپ کی نظر مخلوق کے ضعف پر پڑی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موافقت فرماتے ہوئے فرمایا کہ اچھا بشارت نہ دو لہذا حضرت عمرؓ پر کوئی اشکال نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (درس مشکوۃ)

بابي انت و امي : آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں اس کی ترکیب اس طرح کیجاتی ہے "انت مفدی علیک بابی و امی"

انت مبتدا، مفدی صیغہ اسم مفعول، "علیک" علی حرف جر، ک ضمیر خطاب مجرور، جار مجرور سے ملک متعلق ہوا مفدی کے، "بابی و امی" ب زائدہ، ابی وامی معطوف و معطوف علیہ سے مل کر مفعول بہ ہوا مفدی کا، مفدی شبہ فعل اپنے متعلق اور مفعول بہ سے مل کر خبر ہو گیا، انت مبتدا کی۔

رکبني : [عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھ پر سوار تھے] یعنی اس قدر قریب تھے کہ گویا وہ مجھ پر سوار ہیں۔

"رکبني" لا کر شدت قرب کو بتلانا مقصود ہے۔

مقام فاروقی

فائدہ: اور حضرت نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نزدیک ان کا مقام اور قدر ومنزلت کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی رائے کو تسلیم فرمایا اور برقرار رکھا۔

اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔

(۱)......امت کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی محبت اور شفقت۔

(۲)......حضرت عمر فاروق کی اصابت رائے فہم و فراست اور امر حق میں ان کی صاف گوئی۔ (مظاہر حق)

تنبیہ: پس وہ لوگ غور کریں کہ جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں اور ان کو بدعتی تک کہہ دیتے ہیں، کہ فلاں چیز عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بدعت ہے،

جیسا کہ رمضان المبارک میں بیس رکعات تراویح کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بدعت کہا جاتا ہے۔(العیاذ باللہ)

﴿جنت کی کنجی﴾

﴿۳۶﴾ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ لِي رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَفَاتِيحُ الْجَنَّةِ شَهَادَةُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (رواہ احمد)

حوالہ: مسند احمد:۲۴۲/۵۔

حل لغات: مفاتیح کنجی، واحد مفتاح.

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ دل سے اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جنت کی کنجیاں ہیں۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

قال لی: کے لفظ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مجلس میں تنہا حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی ہوں گے، تبھی تو "قال لی" فرمایا:

ایک اشکال اور اس کا جواب

اشکال: یہاں یہ اشکال ہوتا ہے "مفاتیح الجنة" مبتداء ہے جو کہ جمع ہے۔اور "شهادة ان لا اله الا الله" خبر ہے جو مفرد ہے، تو یہاں مبتداء اور خبر میں مطابقت

نہیں جبکہ مبتداء اور خبر کے درمیان تذکیر وتانیث اور مفرد وجمع کے اعتبار سے مطابقت ضروری ہوتی ہے۔

جواب(١): یہ ہے کہ یہاں "**شهادة ان لا اله الا الله**" مختصر ہے اور خبر کا ایک جزء ہے اور دوسرا جزء اس کا محذوف ہے، یعنی "**شهادة ان محمدا رسول الله وشهادة ان الجنة ونعمتها حق**" اب مبتداء اور خبر میں مطابقت ہوگئی۔

جواب(٢): یہ ہے کہ "**شهادة**" مصدر ہے اور قاعدہ ہے کہ "**المصدر لا یثنی ولا یجمع**" اس وجہ سے اس کو مفرد لایا گیا۔ اور دونوں میں مطابقت ہوگئی۔

جواب(٣): یہ ہے کہ جزء اول میں تاویل کرلیجائے وہ یہ کہ مفاتیح گرچہ جمع ہے مگر مفرد کے معنی میں ہے بمعنی مفتاح یعنی مفتاح ہے لہٰذا دونوں میں مطابقت ہوگئی۔

اشکال:(٢) مگر اس جواب پر پھر اشکال ہوتا ہے کہ مفتاح یعنی مفرد لے آتے جمع لانے کی کیا ضرورت تھی، جو مفتاح کے بجائے مفاتیح لایا گیا۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ اس وجہ سے اس کو جمع لائے تاکہ معلوم ہوجائے کہ یہ ایک بسیط حقیقت نہیں بلکہ اس میں تکثیر ہے۔

اور یا اس وجہ سے کہ مفتاح کے اندر دندانے ہوتے ہیں اور وہ اس کے اجزاء ہوتے ہیں مگر ان میں سے ہر ایک علاحدہ مستقل طور پر مفتاح ہونیکی صلاحیت رکھتا ہے کہ اگر وہ نہ ہوتو ہرگز تالا نہ کھلے۔

تو یہ کلام مشتمل ہوا کنایہ کو اور کنایہ ابلغ ہوتا ہے تصریح سے۔

اور اسمیں تشبیہ بھی ہے کیونکہ "**شهادة ان لا اله الا الله**" کوئی ایسی چیز نہیں جو محسوس ہو، بلکہ اس کو مفتاح کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح مفتاح سے تالے اور دروازے کھل جاتے ہیں اسی طرح "**شهادة**" سے جنت کے تالے کھلیں گے۔ (مرقاة: ١/١١٤، کتاب الایمان)

﴿نجات کا ذریعہ کلمہ توحید﴾

﴿۳۷﴾ وَعَنْ عُثْمَانَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ اِنَّ رِجَالاً مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حِیْنَ تُوُفِّیَ حَزِنُوا عَلَیْہِ حَتّٰی کَادَ بَعْضُھُمْ یُوَسْوِسُ قَالَ عُثْمَانُ وَکُنْتُ مِنْھُمْ فَبَیْنَا اَنَا جَالِسٌ مَرَّ عَلَیَّ عُمَرُ وَسَلَّمَ فَلَمْ اَشْعُرْ بِہٖ فَاشْتَکٰی عُمَرُ اِلٰی اَبِی بَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا ثُمَّ اَقْبَلَا حَتّٰی سَلَّمَا عَلَیَّ جَمِیْعاً فَقَالَ اَبُوبَکْرٍ مَاحَمَلَکَ عَلٰی اَنْ لَاتَرُدَّ عَلٰی اَخِیْکَ عُمَرَ سَلَامَہٗ قُلْتُ مَافَعَلْتَ فَقَالَ عُمَرُ بَلٰی وَاللّٰہِ لَقَدْ فَعَلْتَ قَالَ قُلْتُ وَاللّٰہِ مَاشَعَرْتُ اَنَّکَ مَرَرْتَ وَلَاسَلَّمْتَ قَالَ اَبُوبَکْرٍ صَدَقَ عُثْمَانُ قَدْ شَغَلَکَ عَنْ ذٰلِکَ اَمْرٌ فَقُلْتُ اَجَلْ قَالَ مَاھُوَ قُلْتُ تَوَفَّی اللّٰہُ تَعَالٰی نَبِیَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَبْلَ اَنْ نَسْأَلَہٗ عَنْ نَجَاۃِ ھٰذَا الْاَمْرِ قَالَ اَبُوبَکْرٍ قَدْ سَأَلْتُہٗ عَنْ ذٰلِکَ فَقُمْتُ اِلَیْہِ وَقُلْتُ لَہٗ بِاَبِی وَاُمِّی، اَنْتَ اَحَقُّ بِھَا قَالَ اَبُوبَکْرٍ قُلْتُ یَا رَسُولَ اللّٰہِ مَانَجَاۃُ ھٰذَا الْاَمْرِ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ قَبِلَ مِنِّی الْکَلِمَۃَ الَّتِی عَرَضْتُ عَلٰی عَمِّی فَرَدَّھَا فَھِیَ لَہٗ نَجَاۃٌ۔ (رواہ احمد)

حوالہ: مسند احمد: ۱/۶۔

حل لغات: یُوَسْوِسُ، وَسْوَسَ الشیطان الیہ ولہ وسوسۃ ووسواساً (باب بعثرۃ) شیطان کا کسی کے دل میں برا خیال پیدا کرنا، نیکی سے ہٹا کر بدی پر ابھارنا، اَشْعُرُ شَعَرَ بہ، (ن) شعورا جاننا، محسوس کرنا، سمجھنا، شغلک شَغَلَ عن الشیء، شَغْلاً (ف) غافل کرنا، توجہ ہٹانا، عرض علیہ شیئاً (ض) کسی کے لئے کوئی چیز پیش

کرنا، فردہ، ردہ (ن) ردا واپس کرنا۔

ترجمہ: حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی، تو بعض اصحاب نبی کی غم کی وجہ سے یہ حالت ہوگئی کہ ان کے شک وشبہ میں گرفتار ہونے کا خطرہ ہوگیا، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ان میں سے میں بھی تھا، چنانچہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرے پاس سے گذرے اور مجھے سلام کیا، مجھے اس کی خبر بھی نہیں ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی شکایت کی، چنانچہ دونوں حضرات میرے پاس تشریف لائے اور انہوں نے ایک ساتھ مجھے سلام کیا، پھر ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھ سے کہا کہ تم نے اپنے بھائی عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا، میں نے عرض کیا کہ میں نے تو ایسا نہیں کیا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کیوں نہیں، بخدا آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسا کیا ہے، میں نے کہا کہ خدا کی قسم مجھے اس کی خبر نہیں کہ آپ گذرے ہیں اور آپ نے سلام کیا ہے، حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ عثمان سچ کہہ رہے ہیں تمہیں کسی خاص چیز نے اس سے باز رکھا، میں نے کہا جی ہاں، حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، وہ کیا چیز ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو وفات دے دی، اور ہم ان سے یہ سوال بھی نہیں کر سکے کہ اس معاملے میں نجات کا ذریعہ کیا ہے، حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ میں نے اس بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیا تھا، میں کھڑا ہوگیا، اور میں نے ان سے کہا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، واقعی آپ ہی اس چیز کے پوچھنے کے زیادہ مستحق تھے، حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں نے عرض کیا، اے اللہ کے نبی! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اس معاملے میں نجات کی صورت کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے اس کلمہ کو میری طرف سے قبول کر لیا جس کو میں نے

اپنے چچا پر پیش کیا تھا اور انہوں نے اس کو ٹھکرا دیا تھا تو وہ کلمہ اس کے لئے باعث نجات ہوگا۔

تشریح: "حزنوا" خبر ہے "ان رِجَالاً" کی اور "حین توفی" ظرف ہے۔

وفات نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا حزن وملال

وفات پر غمگین ہونا جہاں محبت کی علامت ہے وہاں کمزوردلی کی بھی علامت ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین غمگین تو سب ہی تھے، مگر کچھ زیادہ ممتاز فی الحزن تھے، یہاں تک کہ کچھ لوگ مجنوں ہونے کے قریب تھے، یوسوس: یہاں جنون ہی کے معنٰی میں ہے اور یوسوس جنون کی ہی ایک قسم ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بھی انہیں میں سے تھا یعنی رنجیدہ وبےقرار اور دل شکستہ، میرا غم جنون کے قریب پہنچ گیا تھا۔ شعر

صبت علی مصائب لو انها

صبت علی الایام صرن لیالیاً

[مجھ پر اتنی مصیبتیں پڑیں کہ اگر وہ دن اور روزِ روشن پر پڑ جائیں تو وہ بھی شب تاریک بنجاتا]

یہ شعر حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے یہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر کہا تھا۔

فبینما: یہ اصل میں بین وقت تھا، وقت کو حذف کر دیا اور اس کے عوض الف ام لے آئے، یعنی اس درمیان میں کہ میں بیٹھا ہوا تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرے پاس سے گذرے اور معلوم کیا۔ چونکہ اس وقت یہ طریقہ تھا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم

اجمعین جب آپس میں ملاقات کیا کرتے تھے، تو آپس میں سلام کیا کرتے تھے۔

تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس سے گذرے اور آپؓ کو سلام کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مطلق پتہ نہ چل سکا کیونکہ وہ تو اپنی دھن میں تھے، انہوں نے سمجھا کہ مجھ سے ناراض ہیں اس زمانہ میں سلام کا جواب نہ دینا ناراضگی کی علامت تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گئے جو اس وقت خلیفہ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت فرما رہے تھے۔

اپنے بڑے سے شکایت

فائدہ: معلوم ہوا کہ جب کسی سے کچھ شکایت ہو تو اپنے سے بڑے کے پاس اس کو پیش کردے، یہ نہیں کہ خود ہی بدلہ اور انتقام لینا شروع کردیں۔

حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی باہمی الفت ومحبت

فائدہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین آپس میں کس درجہ پیار ومحبت سے رہتے تھے کہ ایک دوسرے کی ادنیٰ ناراضگی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

تو جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شکایت کی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فوراً چلدئے کہ آؤ ان کے پاس چلیں یہ نہیں کہ سنتے ہی کہدیں کہ اچھا وہ اتنے بڑے درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ سلام کا جواب تک نہیں دیتا، لاؤ انہیں گرفتار کر کے۔

حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تواضع

اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کمال تواضع کا بھی علم ہوگیا، کہ باوجودیکہ امیر المومنین ہیں، ان کو اپنے پاس بلانے کا پورا حق تھا، مگر ان کو اپنے پاس نہیں بلایا۔ بلکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود گئے اور سلام کیا اور پوچھا کہ تم نے اپنے بھائی عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا انہوں نے جواب دیا کہ حضرت نہیں میں نے ایسا نہیں کیا، انہوں نے اپنے علم کے اعتبار سے نفی کی کہ مجھے علم نہیں ہوا کہ آپ گذرے ہیں اور آپ نے سلام کیا ہے، اس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اور مؤکد کلام کیا چونکہ منکر کے سامنے مؤکد کلام کیا جاتا ہے اس وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لام بھی تحقیق بھی اور قسم بھی سب جمع کر کے فرمایا: ”واللہ لقد فعلت“

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہ ہوسکا کہ یہ کب گذرے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تسلی دی کیونکہ بڑے آدمی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ان موقعوں پر تسلی دے۔ گرچہ انہیں خود بھی بہت زیادہ رنج تھا، مگر بڑا آدمی اپنے غم کو برداشت کر کے دوسروں کو تسلی دیتا ہے۔

حضرت تھانویؒ کی وفات پر خواجہ مجذوبؒ کا دوسروں کو تسلی دینا

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علیہ الرحمۃ کی جب وفات ہوگئی سب حضرات حتی کہ بڑی بڑی داڑھی والے رو رہے تھے اور حضرت خواجہ مجذوبؒ جو آپ کے عشاق میں شمار ہوتے ہیں اور آپ کو حضرت سے سب سے زیادہ محبت تھی مگر پھر بھی وہ دوسروں کی تسلی کے لئے ان کو شعر سناتے اور کھانا کھلاتے پھر رہے تھے، ہم اس وقت طالب

علم تھے ہمیں زیادہ رنج نہ تھا، چونکہ بچوں کو زیادہ رنج نہیں ہوتا ہے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ آپ کسی اہم کام میں مشغول ہوں گے؟

انہوں نے فرمایا کہ ہاں میں یہ سوچ رہا تھا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا اور ہم دین کے بارے میں یہ بھی نہ پوچھ سکے کہ نجات والا امر کونسا ہے۔

"ھذا الامر" کا مصداق

(۱)......"امر" سے مراد امرِ دین ہے۔ یعنی دین کے اندر آتشِ دوزخ سے نجات اور خلاصی کس چیز سے ہوگی اور وہ نجات اسی دین کے ساتھ خاص ہے۔

(۲)......یا اس سے مراد یہ ہے کہ اکثر لوگ جو آجکل شیطان کے دھوکے اور دنیا کی محبت اور اس کی مہلکات اور میلان الی الشہواۃ اور ارتکاب معاصی میں مبتلا ہیں ان خطرناک امور سے ذریعۂ نجات کیا ہے۔ (شرح الطیبی: ۱/۱۷۸، کتاب الایمان)

(۳)......یا پھر وسوسہ شیطانی سے نجات مراد ہے جیسا کہ خود حدیث ہذا میں '' کاد بعضہم یوسوس قال عثمان وکنت منہم'' کا جملہ بھی ہے۔ (تنظیم الاشتات: ۱/۷۲)

طالب علم کا ادب

فائدہ: معلوم ہوا کہ وہ طالب علم تھے اور اگر طالب علم کو کوئی چیز معلوم نہ ہو تو اس کو پریشانی ہوتی ہے۔

اور جب تک وہ اس کو معلوم نہ کرلے جب تک اس کو چین نہیں آتا اور معلوم ہوا طالب علم کو جو چیز معلوم نہ ہو اس کو معلوم کر لینا چاہئے، اور اس میں حیا نہیں کرنا چاہئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دین سے تعلق

فائدہ: نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو دین سے کیسا تعلق تھا کہ ایک چیز اگر معلوم نہیں تو اس کی وجہ سے کیسے غمگین ہو رہے ہیں، کہ شدت غم کی وجہ سے یہ بھی معلوم نہیں کہ کون آیا کون گیا، سلام تک کا پتہ نہ چل سکا۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ اس بارے میں تو میں پوچھ چکا ہوں۔

وہ کونسا علم تھا جو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس نہ ہو۔

فضیلت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اگر کسی مسئلہ میں گفتگو ہوتی اور کسی چیز کے بارے میں حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا جاتا تو آپؓ "بلی'' اور ''نعم" سے جواب دیتے۔

ایک مرتبہ آپ بیٹھے ہوئے تھے اور صبح کے وقت آپ کے پاس مجلس جمع تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوال فرماتے ہیں۔

آج کس نے سب سے پہلے تعزیت کی ہے؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا: کہ میں نے۔

آج رات کس نے اتنی رکعت نماز پڑھی؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے۔

آج جنازہ کی نماز سب سے اول کس نے پڑھی؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے۔

آج سب سے پہلے صدقہ کس نے دیا ہے؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ میں نے۔

معلوم ہوا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس بڑا علم تھا۔ اور دین کے ہر میدان میں حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تمام صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے پیش پیش رہتے تھے۔

تو آپ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہ جواب دیا کہ اس بارے میں تو میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ کونسا امر ذریعہ نجات ہے اور مدارِ نجات کس امر پر ہے؟ روزہ پر زکوۃ پر یا حج پر؟

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جواب ارشاد فرمایا تھا کہ مدارِ نجات کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ'' ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عنوان کیسا اچھا اختیار کیا کہ وہ کلمہ جس کو میں نے اپنے چچا ابو طالب پر پیش کیا تھا۔

اور انہوں نے جواب دیا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ کا کلمہ حق ہے اور تمہارا دین پھیل کر رہیگا، مگر قریش کی لڑکیاں کہیں گی کہ ابو طالب جہنم کی آگ سے ڈر گیا اور آباواجداد کے دین سے پھر گیا۔ اس لئے اسلام قبول نہیں کیا۔

مذہب اسلام کے حق ہونے کا یقین کافی نہیں

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ صرف یہ جان لینا کہ مذہب اسلام حق ہے، اور اس کا یقین کر لینا کافی نہیں بلکہ اس کو ماننا اور تسلیم کر لینا ضروری ہے۔

یعنی مدارِ نجات صرف ایمان ہے اور ہونا بھی ایمان ہی چاہئے تھا۔ جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا تھا کہ جنت بھی مخفی ہے اور جہنم بھی مخفی ہے اس لئے جنت میں جانے اور جہنم سے

نکلنے کا راستہ بھی مخفی ہی ہونا چاہئے۔

کلمہ توحید کی فضیلت

فائدہ: گویا کلمہ توحید کے یہ فضائل و برکات ہیں کہ جس شخص نے اس کلمہ کو صدق دل سے پختہ اعتقاد کے ساتھ اس کو قبول کرلیا اور اس کے تقاضوں کو پورا کر کے اس کے فرائض پر عمل کیا تو یہ کلمہ آخرت میں اس کی نجات کا ضامن ہوگا۔ (مظاہر حق جدید: ۱۰۵/۱، ایمان کے ابواب)

کہ جب ستر سال کفر میں پرورش پانے والا ایک بوڑھا ایک دفعہ کلمہ کا اقرار کر نے سے نجات پا سکتا ہے، تو ایک موحد جس کی پوری زندگی ایمان میں بسر ہوئی کس طرح نجات نہیں پائیگا۔ تو اس سے اس کلمہ کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ (درس مشکوۃ)

معتزلہ اور خوارج کی تردید

اس حدیث شریف سے رد ہوتا ہے معتزلہ اور خوارج پر جو بجائے ایمان کے اعمال کو مدارِ نجات مانتے ہیں اور اسی کے قائل ہیں کہ مدارِ نجات اعمال ہیں نہ کہ ایمان۔

استاذ کا ادب

جس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ جواب دیا کہ اس کے بارے میں تو میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ مطلوب سامنے ہے تو فوراً کھڑے ہوگئے چونکہ اب استاذ بتا رہے تھے اور استاذ کا ادب ضروری ہوتا ہے وہ استاذ کا اتنا ہی ادب کرتے تھے، جتنا کہ آج نہیں کرتے۔

آج تو صرف یہ سمجھتے ہیں کہ مدرسہ کے ملازم ہیں اس سے زیادہ کیا سمجھتے ہیں؟ اس لئے آج علم نہیں آتا، چونکہ علم تو اساتذہ کے ادب سے آتا ہے۔

امام اعظم علیہ الرحمۃ کا ارشاد

امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ میرے سات سو استاذ ہیں اور ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ مجھے بازار میں لیجا کر فروخت کر دے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد

اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ جس نے مجھے ایک لفظ سکھلا دیا وہ میرا استاذ ہے اور میں اس کا غلام ہوں۔

امام اعظم کا بھنگی استاذ کا ادب

امام اعظم علیہ الرحمۃ درس دے رہے تھے ایک بھنگی سامنے سے گذرا تو آپ اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے، شاگردوں نے پوچھا آپ کھڑے کیوں ہو گئے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ میرے استاذ ہیں۔

شاگردوں نے تعجب سے پوچھا کہ حضرت یہ بھنگی اور آپ کا استاذ؟

آپ نے جواب دیا کہ ہاں مجھے انہیں سے معلوم ہوا تھا کہ کتا جب ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرنے لگے تو سمجھ لو کہ یہ بالغ ہو گیا۔

مجھے ان سے اس بات کا علم ہوا تھا اس لئے یہ میرے استاذ ہیں اس وقت تو بھنگیوں کو بھی استاذ سمجھتے تھے اور ان کا ادب کرتے تھے۔

مگر آج استاذوں کو بھنگی سمجھتے ہیں اور ان کو لائق احترام نہیں سمجھتے۔

اس زمانہ میں تو فدا ہونے کو تیار رہتے تھے، جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمایا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آپ ہی اس کے زیادہ حقدار ہیں۔

علم کے لئے قربانی

علم تو ایسی پیاری اور محبوب شئی ہے کہ اس پر ماں باپ جیسے پیاروں کو قربان کیا جاتا ہے۔ طالب علم کا مطلب یہ ہے کہ علم مطلوب ہے اور یہ طالب، مطلوب کے ہر حکم کو مانا جاتا ہے۔ اس کے حصول کے لئے کتنی قربانیاں دینی پڑتی ہیں وہ کم ہیں ایک انسان فانی محبوب کو حاصل کرنے کے لئے جس کا کمال فانی جس کا وجود فانی جس کا حسن فانی ہے پھر بھی اسے حاصل کرنے کے لئے ہزارہا کوششیں کرتا ہے تو پھر علم جو زندہ ہے، جس کے بارے میں حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "**نضر اللہ إمرأ سمع مقالتی فوعاها واداها کما سمعها الخ**" اللہ تعالیٰ تر و تازہ رکھے، سدا بہار رکھے، اس شخص کو جس نے میری کوئی بات سنی اور اس کو یاد کیا اور اس کو جس طرح سنا تھا اسی طرح دوسروں کو پہونچا دیا۔ تو کیا اس کو یہ درجہ نہیں دیا جا سکتا کہ حسین سے حسین عزیز سے عزیز اور محبوب سے محبوب چیز کو اس پر قربان کر دیا جائے۔

﴿دین غالب آ کر رہے گا﴾

﴿۳۸﴾ **وَعَنِ الْمِقْدَادِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ وَذُلِّ ذَلِيْلٍ اِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ اَهْلِهَا، اَوْ يُذِلُّهُمْ**

فَیَدِیْنُوْنَ لَہَا قُلْتُ فَیَکُوْنُ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔ (رواہ احمد)

حوالہ: مسند احمد: ۶/۴۔

حل لغات: مدر، لیس دار مٹی، گارا، وبر اس کے لغوی معنی اونٹ کے نرم بال ہیں جمع اوبار اهل الوبر، دیہاتی لوگ۔ بعز، مصدر عز فلان (ض) عزا وعزۃ طاقت ور ہونا، صاحب عزت ہونا، ذل مصدر ذل (ض) ذلا وذلۃ، ذلیل ہونا، حقیر ہونا، بے وقعت ہونا، کمزور ہونا، فیدینون، دان لہ (ض) دینا، ودیانۃ فرماں بردار ہونا، کسی کے سامنے عاجز ہونا۔

ترجمہ: حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ زمین پر کوئی گھر خواہ مٹی کا ہو یا خیمہ کا ایسا باقی نہیں رہے گا جس میں اللہ تعالیٰ اسلام کے کلمہ کو معزز کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کی ذلت کے ساتھ داخل نہ کردے، یا تو اللہ تعالیٰ ان کو معزز بنا دیگا، اور ان کو اس کلمہ کا اہل بنا دے گا، یا ان کو اللہ تعالیٰ ذلیل کردیگا، اور ان کو اس کلمہ کا مطیع ہونے پر مجبور کردیگا، میں نے کہا پھر تو چاروں طرف اللہ تعالیٰ ہی کا دین ہوگا۔

تشریح: نہیں باقی رہے گا زمین پر کوئی کچا یا پکا مکان، مطلب یہ ہے کہ شہر ہو یا قریہ ہو، بالو کا مکان ہو یا خیمہ ہو، یا خانہ بدوشوں کا مکان ہو، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس میں اسلام کا کلمہ داخل فرمادیں گے۔

وبر: اونٹ کی اون کو کہا جاتا ہے اس سے مراد کپڑے کا مکان یعنی خیمہ ہے۔

بعز عزیز[1] **وبذل ذلیل**[2]**:** یہ عزت والے کی عزت کے ساتھ اور ذلت والے کی

---

[1] **بعز عزیز:** عزت والے کی عزت کے ساتھ بایں طور کہ وہ اس کلمہ کو برضا و رغبت اور خوش دلی سے اس کو قبول کرے وہ کہیں بھی ہو تو اس کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں بلند ہوگا اور دنیا و آخرت دونوں جگہ اللہ تعالیٰ اس کو عزت و سرفرازی سے نوازیں گے۔ (حاشیہ نمبر ۲ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

ذلت کے ساتھ یعنی یا تو عزت سے کوئی اس کلمہ کو قبول کر لے ورنہ تو ذلت کیساتھ اس کو قبول کرنا پڑیگا۔

دوسرا مطلب: اس کا یہ ہے کہ لوگ اس وقت ذلیل ہوں یا عزیز ہوں ان میں اسلام پہنچ جائیگا، اکثریت کے اعتبار سے تو یہ زمانہ آچ آیا ہوا ہے ورنہ تو حضرت مہدی علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تو یقیناً ایسا زمانہ آہی جائیگا۔

جب اس بات کو حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے سنا تو کہا کہ دین سارا پھر تو اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہو جائے گا۔

اب بحث ہے کہ اس سے کون سا زمانہ مراد ہے؟ تو بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری زمانہ مراد ہے، اور ظہر الارض سے صرف جزیرۃ العرب اور اسکے آس پاس مراد ہے۔ کیونکہ اسلام اس وقت اس سے باہر نہیں نکلا تھا مگر حدیث کا آخری جزاسکے ساتھ مطابق نہیں ہوتا، کیوں کہ "ذل ذلیـــــل" سے جزیہ مراد ہے کہ ذمی جزیہ دیکر اسلام کے تابع ہوں گے حالانکہ جزیرۃ العرب میں جزیہ قبول نہیں ہوگا، وہاں تو دو ہی صورتیں ہیں یا اسلام یا قتل، اسلئے بعض نے کہا کہ ظہر الارض سے پوری سرزمین مراد ہے۔ اور حضرت مہدی علیہ السلام کے زمانہ میں ہوگا۔ مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس وقت بھی جزیہ قبول نہیں ہوگا، لہذا سب سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ اس سے پورے عالم کا مسلمان ہونا مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اسلام کی غلبائی ہے کہ اسلام دلائل وحقانیت کے اعتبار سے پورے عالم پر غالب ہوگا۔ اور "ذل ذلیل" سے ہر کافر مراد ہے جو دلیل سے مغلوب ہوگا۔ (مرقاۃ)

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۲ بذل ذلیل: ذلت والے کی ذلت کے ساتھ بایں طور کہ وہ جہاں کہیں بھی ہو اس کلمہ کا انکار کردے اور رضا و رغبت کے ساتھ اس کو قبول نہ کرے اور اس کا تابعدار نہ ہو۔
تو اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کرے گا اس کے انکار کرنیکی وجہ سے قیدی بنانے کے ذریعہ یا قتل ہونے کے ذریعہ یہاں تک کہ وہ تابعدار اور پابند رہے گا جزیہ دینے کا یا مجبوراً اور زبردستی یا خوش دلی کے ساتھ۔ (مرقاۃ: ۱/۱۱۶)

﴿کلمہ توحید اور اعمال﴾

﴿۳۹﴾ وَعَنْ وَهْبِ بْنِ مُنَبِّهٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قِيْلَ لَهٗ أَلَيْسَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لَيْسَ مِفْتَاحٌ إِلَّا وَلَهٗ أَسْنَانٌ فَإِنْ جِئْتَ بِمِفْتَاحٍ لَهٗ أَسْنَانٌ فُتِحَ لَكَ وَإِلَّا لَمْ يُفْتَحْ لَكَ۔ (رواہ البخاری فی ترجمۃ باب)

حوالہ: بخاری شریف:۱۶۵/۱،ترجمۃ الباب، کتاب الجنائز.

حل لغات: مفتاح، کنجی، جمع مفاتیح، اسنان واحد سن، دانت، دندانہ، جبڑے میں پیدا ہونے والا ہڈی کا ٹکڑا۔

ترجمہ: حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کہ "لا الہ الا اللہ" جنت کی کنجی نہیں ہے، آپؒ نے کہا بالکل ہے، لیکن، کنجی میں دندانے بھی ضروری ہیں، چنانچہ اگر تم ایسی کنجی لے کر آئے جو دندانے والی ہے، تو تمہارے لئے جنت کے دروازے کھل جائیں گے، ورنہ تمہارے لئے جنت کے دروازے نہیں کھلیں گے۔

تشریح: حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ یہ صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد ہیں ان سے پوچھا گیا کہ کیا "لا الـــہ الا اللہ" مفتاح الجنۃ نہیں ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ضرور۔

اس وقت بہت سے مرتد اور معتزلہ وخوارج تھے، جنہوں نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقت کا لباس پہن رکھا تھا۔

جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو یہ سب بے نقاب ہوگئے، کوئی معتزلہ ہوگیا اور کوئی خارجی اسی طرح ایک فرقہ مرجیہ ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ کلمہ "لا الہ الا

اللہ" پڑھو اور جنت میں داخل ہو جاؤ، نماز روزہ حج وغیرہ کسی عمل کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کرنے والا کوئی مرجیہ ہی میں سے تھا۔

اس لئے اس نے سوال کیا کہ جب "لا الہ الا اللہ" مفتاح الجنۃ ہے تو پھر اعمال کی کیا ضرورت ہے؟ حضرت وہب بن منبہؒ اس کے فقرہ سے واقف ہو گئے اور اس کو اسی کے مزاج سے سمجھایا کہ "لا الہ الا اللہ" کنجی ضرور ہے مگر کنجی میں بھی بہت سے دندانے ضروری ہوتے ہیں۔

اگر چابی میں دندانے ہوں تو دروازہ کھل جائیگا، اور اگر ایک دندانہ بھی کم ہو گیا تو دروازہ نہیں کھل سکتا۔

اور وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت ہے۔ جب یہ حاصل ہو جائیں گی تب جا کر دروازہ کھلے گا ورنہ نہیں۔

اس سے اعمال صالحہ کا ضروری ہونا معلوم ہو گیا، اور مرجیہ کی تردید ہو گئی۔

(مرقاۃ:۸۲/۱،و۱۱۶/۱، کتاب الایمان)

﴿اللہ تعالیٰ کی بے حساب رحمت﴾

﴿۴۰﴾ وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَحْسَنَ اَحَدُكُمْ اِسْلَامَهٗ فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهٗ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ وَكُلُّ سَيِّئَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ بِمِثْلِهَا حَتّٰى لَقِیَ اللّٰهَ۔ (متفق علیہ)

حوالہ: بخاری شریف:۱۱/۱، باب حسن اسلام المرء، کتاب الایمان،

حدیث نمبر:۴۲، مسلم شریف:۸۷/۱،باب اذا هم العبد کسنة الخ، کتاب الایمان، حدیث نمبر:۱۲۹،

حل لغات: احسن، باب افعال اچھا کرنا، نیکی کرنا، اچھا کام کرنا،ضعف، ڈبل،دوہرا۔

ترجمه: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص اپنے ایمان کو اچھا بنالیتا ہے،تو وہ جو بھی نیک عمل کرتا ہے تو اس پر اس جیسی دس سے لے کر سات سو تک نیکیاں لکھی جاتی ہیں، اور وہ جو برا عمل کرتا ہے اس پر ایک ہی عمل کا گناہ لکھا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرلے۔

حسن اسلام

تشریح: حسن اسلام کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اسلام کے تمام تقاضوں کو پورا کرے اور کمال اخلاص اختیار کرے، پھر جیسا جیسا اخلاص ہوگا، اسی درجہ اس کا اجر ہوگا، ایک ایک عمل پر دس نیکیاں۔

یہ ابتداء ہے اور اس سے اوپر سات سو تک لکھا جاتا ہے اور سات سو بھی کوئی حد نہیں بلکہ یہ عدد عربوں کے نزدیک بڑا تھا، اس وجہ سے اس کو ذکر کیا ہے۔ ورنہ جتنا خلوص ہوگا اسی اعتبار سے ثواب زائد ہوتا رہے گا۔اور اگر وہ کوئی گناہ کریگا تو اس کو اس کے برابر ہی لکھا جائے گا، یہ اللہ تعالیٰ کی بندوں پر کمال رحمت ہے، یہاں تک کہ وفات ہو جائے۔یعنی وفات تک یہی سلسلہ رہیگا، کہ ہر نیکی پر کم از کم دس گنا اور اس سے زائد سات سو گنا تک اور اس سے بھی زائد اور گناہ پر صرف اس کے برابر اور وہ بھی توبہ کرنے سے معاف کردیا جائے گا۔

﴿نیکی پر خوشی ایمان کی علامت ہے﴾

﴿۴۱﴾ وَعَنْ اَبِی اُمَامَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَجُلاً سَأَلَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا الْاِیْمَانُ قَالَ اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَیِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ قَالَ یَارَسُولَ اللّٰهِ فَمَا الْاِثْمُ قَالَ اِذَا حَاكَ فِی نَفْسِكَ شَیْءٌ فَدَعْهُ۔ (رواہ احمد)

حوالہ: مسند احمد صفحہ:۲۵۱/۵۔

حل لغات: سَرَّتْک سرّہ، سُرُورا، مَسرَّةً خوش کرنا، سَاءَ تْک، سَاءَ الشئی سَوْءً برا ہونا، الاثم گناہ، قابل سزا جرم، ج آثَام اَثِمَ، اِثْماً، گنہگار ہونا، جرم کرنا، حَاکَ الشَّیْءُ فی صدرہ او قلبه حَوْکاً دل میں بیٹھنا، جمنا، کھٹکنا۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایمان کیا ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کو اپنی نیکی اچھی لگے، اور تم کو اپنی برائی ناگوار لگے تو تم مومن ہو، اس شخص نے عرض کیا کہ گناہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا جب کوئی چیز تمہارے دل میں کھٹکے اور تردد پیدا کرے تو اس کو چھوڑ دو۔

تشریح: کسی شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔

"ماالایمان" ایمان کیا ہوتا ہے؟

اس سے مراد ایمان کے اجزا معلوم کرنے نہیں ہیں جیسا کہ جواب سے معلوم ہوتا ہے بلکہ صرف ایمان کی موٹی سی نشانی دریافت کرنا مقصود تھی۔

کیونکہ ایمان تو ایک مخفی حقیقت ہے اس کی پہچان ضروری تھی مؤمنوں کے کپڑے تو کافر بھی پہن سکتے ہیں۔

چونکہ سائل ایک عامی سا انسان تھا اس لئے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو ایسا جواب دیا کہ ایمان کی علامت اور پہچان یہ ہے کہ اچھا کام کر کے تمہیں خوشی ہو اور برائی کرنے سے دل رنجیدہ ہو۔

فانت مؤمن: اس لئے کہ مومن کامل فرق کرتا ہے طاعت ومعصیت کے درمیان اور ان دونوں پر درگذر کا اعتقاد رکھتا ہے، برخلاف کافر کے کہ وہ ان دونوں کے درمیان فرق نہیں کرتا اور نہ ان کے کرنے نہ کرنے کی کوئی پرواہ کرتا۔ (مرقاۃ: ۱/۱۱۸، کتاب الایمان)

اور صرف اس کی یہ پہچان نہیں کہ برائی سے دل برا ہوتا ہے تو گناہ کر ڈالیں تاکہ اس کی پہچان ہو جائے نہیں۔

بلکہ اس کا ایک جز حسنہ بھی تو ہے حسنہ کر کے دیکھو اس سے معلوم ہو جائیگا۔

اور اگر کبھی اتفاق سے گناہ ہو جائے اور اس پر دل رنجیدہ ہو تو یہ ایمان کی پہچان ہے اس شخص نے جب دیکھا کہ یہ تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے موٹی سی بات بتادی تو اس کو ہمت ہوئی کہ اور سوال کروں۔

پھر اس نے سوال کیا کہ گناہ کیا ہوتا ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب ارشاد فرمایا کہ ہر وہ کام جس سے تمہارا دل تردد کرے شک کرے کھٹکے تو اسی کو گناہ سمجھو۔ اور اس کو چھوڑ دو۔

فدعہ: حضرت نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کا فرمان ہے **"دع ما یریبک الی مالا یریبک"** کہ جو چیز تم کو شک وتردد میں ڈالے اس کو چھوڑ کر بغیر شک والی چیز کو اختیار

کرلو اور یہ اہل باطن اور پاکیزہ قلوب کی طرف نسبت کرتے ہوئے ہے کہ اس کو احتیاطاً چھوڑ دو جب اس کا چھوڑنا زیادہ محتاط ہو، اور اگر فعل اولیٰ ہو تو اس کی ضد یعنی غیر اولیٰ کو چھوڑ دو تا کہ تم گناہ کے اندر نہ واقع ہو جاؤ۔ (مرقاۃ: ۱/۱۱۸، کتاب الایمان)

جواب میں سائل کی رعایت

فائدہ: حدیث پاک سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سائل کے حال اور مزاج کی رعایت کرتے ہوئے جواب دینا چاہئے، اگر سائل عالم ہے تو اسی اعتبار سے جواب ہو اور اگر عام شخص ہو تو جواب بھی اسی اعتبار سے ہو جو اس کو اچھی طرح سمجھ سکے، اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ کمال عطا فرمایا تھا کہ سائل کے حال و مزاج کی رعایت فرماتے ہوئے جواب عنایت فرمایا کرتے تھے۔ فقط

﴿حسن اخلاق اور افضل اعمال﴾

﴿۴۲﴾ وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ اَتَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَارَسُولَ اللّٰهِ! مَنْ مَعَكَ عَلٰى هٰذَا الْاَمْرِ؟ قَالَ: "حُرٌّ وَعَبْدٌ" قُلْتُ مَا الْاِسْلَامُ؟ قَالَ: "طِيْبُ الْكَلَامِ وَاِطْعَامُ الطَّعَامِ" قُلْتُ مَا الْاِيْمَانُ؟ قَالَ: "اَلصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ" قَالَ قُلْتُ اَيُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: "مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ" قَالَ قُلْتُ اَيُّ الْاِيْمَانِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: "خُلُقٌ حَسَنٌ" قَالَ قُلْتُ اَيُّ الصَّلَاةِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: "طُوْلُ الْقُنُوْتِ" قَالَ قُلْتُ اَيُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: "اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ" قَالَ قُلْتُ فَاَيُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ؟

قَالَ: "مَنْ عُقِرَ جَوَادُهٗ وَاُهْرِيْقَ دَمُهٗ" قَالَ قُلْتُ اَيُّ السَّاعَاتِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: "جَوْفُ اللَّيْلِ الآخِرِ"۔ (رواہ احمد)

حوالہ: مسند احمد صفحہ: ۴/۳۸۵۔

حل لغات: حُرٌّ آزاد، شریف، ج اَحْرَارٌ، عبد، غلام، محکوم، بندہ، ج عَبِيْدٌ، وَعُبُدٌ، طِيْبٌ، پاکیزگی، ہر افضل و اعلیٰ شی، ج اَطْيَابٌ وَطُيُوْبٌ، اِطْعَام (افعال) کھانا کھلانا، سَمَاحَةٌ، فراخ دلی، فیاضی، نرمی، عالی ظرفی، قنوت، دعاء، دین پر ثابت قدمی، قَنَتَ، قنوتا، (ن) خدا کا فرماں بردار ہونا، خدا کے لئے کمال انکسار کے ساتھ بندگی کرنا، عُقِرَ الحیوانُ عَقراً وعُقراً (ض) الحیوان، ذبح کرنا، جواد عمدہ نسل کا گھوڑا، ج جیاد، اھریق واھرق الدم، (افعال) خون بہانا۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس دین پر آپ کے ساتھ کون ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک آزاد، اور ایک غلام'' میں نے کہا کہ اسلام کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ پاکیزہ کلامی اور کھانا کھلانا'' میں نے کہا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''صبر اور سخاوت'' میں نے کہا کہ اسلام میں سب سے بہتر کون ہے؟ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ ہیں'' میں نے کہا کہ ایمان میں بہترین عمل کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اچھے اخلاق'' راوی کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ سب سے بہتر نماز کون سی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دیر تک کھڑے رہنا'' میں نے کہا کونسی ہجرت سب سے افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ تمہارے رب کو جو چیز ناپسند ہے اس کو چھوڑ دینا'' راوی کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ سب سے

افضل جہاد میں کون سا شخص ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ شخص افضل ہے جس کا گھوڑا ماردیا جائے اور وہ خود بھی شہید ہو جائے'' میں نے کہا کہ سب سے افضل کون سا وقت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نصف شب کا آخری حصہ''۔

تشریح: حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور سوال کیا کہ آپ کے ساتھ اس دین میں کون کون ہیں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب ارشاد فرمایا کہ ''حر اور غلام''

اس حدیث شریف میں سوال و جواب دونوں کے دو دو پہلو ہیں۔

سوال کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ میں نے پوچھا کہ آپ کے ساتھ دین میں کون کون شریک ہوئے ہیں؟

حُرٌّ وَعَبْدٌ کا مطلب

جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک حر یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں اور ایک غلام یعنی حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ یا زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مراد ہیں۔

اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو مستورات میں ہونے کی بنا پر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کمسنی کی بنا پر ذکر نہیں فرمایا اگرچہ وہ بھی اس وقت مسلمان تھے۔

سوال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یہ دین احرار کے لئے ہے یا غلاموں کے لئے؟ عرب کے لئے ہے یا عجم کے لئے؟

جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ دین آزاد اور غلام عرب و عجم سب کے لئے ہے۔ یعنی حر و عبد سے مراد جنس ہے کہ ہر قسم کے لوگ حر عبد میرے ساتھ ہیں،

اور میری موافقت اور مجھ پر ایمان لانے کے مامور ہیں۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جوابات ارشاد فرمائے تو کچھ اور ہمت ہوئی اور پھر چند سوال کئے جن میں پہلا سوال تھا۔

ما الاسلام: اسلام کیا ہے؟

اعتـــراض: اس سوال سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ کیا وہ اسلام کے معنی نہیں جانتے تھے، جبکہ اس کے معنی تو آج ہم بھی جانتے ہیں، اور وہ تو عربی النسل تھے، عربی ان کی مادری زبان تھی تو کیا انہیں اسلام کے معنی معلوم نہیں تھے؟

جواب: اس سوال سے سائل کی مراد لغوی معنی دریافت کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کے تقاضوں کے متعلق استفسار ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: "**طیــب الــکـلام و اطـعـام الطعام**"[1]

طیـب الکلام: لوگوں سے اچھی طرح کلام کرو یہ نہیں کہ ترش رو ہو کر بیٹھے رہو، لوگوں سے ایسا اچھا اور عمدہ کلام کرو جس میں نہ اتنا اختصار ہو کہ لوگ گھبرا جائیں، اور نہ اتنا اطناب ہو کہ لوگ اکتا جائیں۔

ان دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھ کر جو کلام کیا جاتا ہے وہ طیب الکلام ہوتا ہے۔

اطعام الطعام: [کھانا کھلانا]

لیکن کس کو کھلانا، پہلے پیٹ پوجا، یعنی پہلے خود کو کھلائے اور پھر **الاقرب فالاقرب** کو یہ نہیں کہ خود بھوک ہڑتال کر کے بیٹھ جائیں۔

---

[1] **طیب الکلام و اطعام الطعام:** ان دونوں میں اشارہ ہے مکارم اخلاق اور اظہار احسان پر انسان کو ابھارنے کی طرف اگرچہ وہ زبان کی شیرینی ہی کے ذریعہ سے ہو۔ (مرقاۃ: ۱۱۸/۱، کتاب الایمان)

جتنی وسعت ہو اتنا ہی کھانا کھلاؤ عام کرو۔ غریبوں اور مسکینوں کو بقدر وسعت کھلاتے رہو۔ اگر زیادہ وسعت نہیں تو اپنے کھانے ہی میں کسی ایک کو شریک کرلیا کریں، اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک شخص کا کھانا دو کو کافی ہو جاتا ہے، پس اس طرح بھی اس حدیث پاک پر عمل ہو جائے گا۔

یہ نہیں کہ وسعت تو اتنی ہے نہیں اور پھرتے ہیں قرضہ کرتے۔

"طیب الکلام واطعام الطعام" کو بیان کرنے کی وجہ

طیب الکلام و اطعام الطعام: یہاں اسلام کی صفت حسنہ اور مکارم اخلاق بیان کرنا مقصود ہے، اور ان میں سے صرف ان دونوں کو بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اثر مخلوق پر ظاہر ہوتا ہے۔ اور طیب الکلام سے درجہ تحلیہ بیان کیا اور اطعام سے درجہ تخلیہ عن البخل بیان کیا۔ پھر تحلیہ کو مقدم کیا کیونکہ زبان ہی اصل ہے اس سے انسان فضائل کی طرف ترقی کرتا ہے اور رذائل سے پاک ہوتا ہے۔ (مرقاۃ)

انہوں نے دوسرا سوال کیا۔

ما الایمان: کہ حضرت جی ایمان کی بھی کوئی چھوٹی سی نشانی بتادو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: "الصبر و السماحۃ"

الصبر والسماحۃ سے ایمان کی تفسیر کی وجہ

الصبر و السماحۃ: ایمان کی تفسیر ان دونوں سے اس لئے کی کہ اول ترک منہیات پر دلالت کرتا ہے اور ثانی فعلِ مامورات پر حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صبر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے رکجانا ہے اور "سماحت" اللہ تعالیٰ کی واجب کردہ چیز کو ادا کرنا پھر

ان دونوں عادتوں کو خلق حسن کے ساتھ جمع فرمادیا بناء کرتے ہوئے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے فرمان پر "کان خلقہ القرآن" یعنی وہ پابند ہیں اس چیز کے کرنے کے جس کا اللہ تعالیٰ ان کو قرآن میں حکم دیتا ہے اور رکنے والے ہیں اس چیز سے جس سے اللہ تعالیٰ ان کو منع کرتا ہے۔(شرح الطیبی:۱۸۱/۱، کتاب الایمان)

صبر کی اقسام

صبر کی تین قسمیں ہیں:

(۱)صبر علی الطاعۃ (۲)صبر علی المصائب (۳)صبر عن المعصیۃ

یہاں صبر سے صبر کی تینوں قسمیں مراد ہیں۔

صبر علی الطاعات: یعنی عبادت کو دل نہیں چاہتا تو دل کو عبادتوں پر جماؤ۔

صبر علی المصائب: نفس کو مصیبتوں اور پریشانیوں سے گرانی ہوتی ہے تو نفس کو ان کے تحمل کا خوگر بناؤ۔اور تکالیف کے باوجود شکوہ وشکایت زبان پر نہ لاؤ۔

صبر عن المعاصی: نفس گناہ کرنیکا تقاضا کرتا ہے تو نفس کو اس سے روکو۔

معلوم ہوا کہ انسان صبر اس وقت کریگا جب اس کے اندر ایمان ہوگا اور جتنا ایمان ہوگا اتنا ہی صبر کریگا۔

چونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں سب سے زیادہ ایمان ہوتا ہے اسی لئے وہ سب سے زائد صبر کرتے ہیں حتی کہ آروں سے کاٹے جاتے ہیں، مگر ان کی زبان سے ''سی'' تک نہیں نکلتی۔

سماحت کے معنی

و السماحۃ: [درگذر کرنا] چشم پوشی کرنا۔

متعلقین سے بڑوں سے اور چھوٹوں سے چشم پوشی کرو، کوئی ایسا کام کر رہا ہے جس سے تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو اس سے درگذر کرو۔

اسی طرح اگر کوئی تمہارے حق کو ادا نہیں کرتا، تو تم کو ضروری ہے کہ اس سے چشم پوشی کرو، اور تم اس کا حق ادا کرو۔

یہ نہیں کہ اس نے میرے حق کو ادا نہیں کیا، تو اس کو کہدیں کہ چل یہاں سے۔

تو معلوم ہوا کہ انسان چشم پوشی اسی وقت کرتا ہے جب اس میں ایمان ہو اور جتنا زیادہ ایمان ہوگا اتنی ہی چشم پوشی کریگا۔

جس طرح حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان بڑا ہے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی چشم پوشی بھی بڑی ہوتی تھی۔

چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو رہا کردیا۔ جبکہ سمجھا یہ جارہا تھا کہ آج خون کی ندیاں بہادی جائیں گی۔

مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چند لوگوں کے علاوہ جن کو قتل کرنے کا حکم منجانب اللہ آ گیا تھا۔ سب کو رہا فرمادیا۔ اور معاف کردیا۔

صبر وسماحت کی جامعیت

قوله الصبر و السماحة: صبر سے ترک منہیات کی طرف اشارہ ہے اور سماحت سے فعل مامورات کی طرف اشارہ ہے۔ تو گویا اس میں تمام دین کو سمودیا۔ اور بعض نے کہا کہ یہاں صبر سے صبر کی تمام اقسام مراد ہیں۔ **الصبر علی الطاعات و الصبر عن المعصیة، و الصبر فی المصیبات.**

اور سماحت سے جود و بخشش مراد ہے تو پہلے سے تمام حقوق اللہ کی طرف اشارہ ہے خواہ

مامورات کے قبیل سے ہو یا منہیات کے قبیل سے۔ اور دوسرے سے تمام حقوق العباد کی طرف اشارہ ہے۔ اور بعض نے کہا "الصبر عن المفقود والسخاوة بالموجود" مراد ہے۔ (مرقاۃ)

پھر انہوں نے سوال کیا کہ:

ای الاسلام افضل؟

ای الاسلام افضل: [کون سا اسلام افضل ہے؟] یعنی اسلام میں کونسی خوبی وصفت افضل ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب ارشاد فرمایا۔

من سلم المسلمون من لسانه ویده: یعنی اسلام کی یہ خوبی سب سے افضل ہے کہ صاحب اسلام یعنی مسلمان اس طرح رہے کہ اس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، کسی کو اس سے تکلیف نہ پہونچے، باقی حدیث سے متعلق پوری تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

انہوں نے پھر سوال کیا کہ ایمان کونسا افضل ہے؟ یعنی ایمان کی کونسی خصلت افضل ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

خلق حسن: [اچھے اخلاق]

تو گویا یہ انٹرویو ہو رہا تھا۔ وہ سوال کر رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جواب عنایت فرمارہے تھے۔

انہوں نے پھر سوال کیا۔ ای الصلاة افضل؟ [کونسی نماز افضل ہے؟]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

طول القنوت[1]: قنوت یہاں قراءت کے معنی میں ہے۔

یعنی وہ نماز افضل ہے جس میں قراءت دراز ہو اور قراءت دراز ہوگی طول قیام سے پس جس نماز میں طول قیام ہو وہ افضل صلوٰۃ ہے۔ جیسا کہ احناف کا مسلک ہے، پس حدیث پاک سے احناف کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔

انہوں نے پھر سوال کیا:

ای الهجرة افضل: [ہجرت کونسی افضل ہے؟]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

ان تهجر ما کره ربک: [جسے تیرا رب برا سمجھے تو اس کو چھوڑ دے] مکروہات رب کو چھوڑ دینا ہجرت کہلاتا ہے۔ جس کی ترجمانی مفتیان کرام کرتے ہیں۔

ای الهجرة افضل: چونکہ ہجرت کی مختلف قسمیں ہیں۔

(۱)......ایذاء کفار سے بچنے کے لئے جیسا کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ہجرت کرنا حبشہ کی جانب۔

(۲)......یا اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے جیسا کہ ہجرت کرنا حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مکہ سے مدینہ کی جانب اور اس معنی میں ہجرت دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف ہے۔

(۳)......قبیلوں کا ہجرت کرنا حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مسائل سیکھنے کیلئے۔

(۴)......اور ہجرت کرنا ان چیزوں سے اور رکجانا جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ چونکہ

---

[1] قولہ طول القنوت: لغت میں قنوت کے بہت معانی آتے ہیں، قرائن سے تعیین کی جائے گی۔ طاعت، قیام، صلوۃ، سکوت، دعا، خشوع، قراءت۔ یہاں قنوت سے قیام مراد ہے، کیونکہ دوسری روایت میں بجائے قنوت کے قیام آیا ہے۔ اور یہ حدیث دلیل ہوگی احناف کی اس مسئلہ میں کہ طول قیام والی نماز افضل ہے یا کثرت سجدہ والی نماز۔ (مرقاۃ)

یہاں افضل ہجرت سے متعلق سوال کیا گیا۔ اور یہ چوتھی قسم تمام قسموں میں افضل ہے۔ چونکہ یہ قسم سب سے عام اور سب کو ہی شامل ہے، اسلئے اس نوع کو بیان فرمایا۔
(مرقاۃ:۱۱۹/۱، کتاب الایمان)

پس انسان اپنے دل سے پوچھ لے وہ خود بتلائے گا کہ یہ کام کرنے کے لائق ہے یا نہیں۔ اگر دل میں کھٹکے تو اس کو چھوڑ دو۔ ورنہ مفتی سے پوچھ لو وہ جسے مکروہ کہدیں اس سے رک جاؤ۔

انہوں نے پھر سوال کیا:

ای الجهاد افضل: [کونسا جہاد افضل ہے؟]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ:

من عقر جواده الخ: [وہ جس کا گھوڑا زخمی کردیا جائے]

اور اس کا خون بہادیا جائے، جس کا گھوڑا زخمی ہوجائے اور خود وہ بھی شہید ہوجائے اس کو افضل مجاہد کہتے ہیں[1]۔

اور مراد اس سے یہ ہے کہ تمام امکانی وسائل کو راہ خدا میں مٹادے اور خرچ کردے۔ یہاں تک کہ جان بھی نکل جائے۔ ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

انہوں نے پھر سوال کیا کہ حضرت!

ای الساعات افضل: [کونسا وقت کونسی گھڑی زیادہ بہتر ہے؟]

---

[1] **افادہ**: یہ جہاد افضل اس وجہ سے ہے کہ یہ دو جہادوں کو شامل ہے۔ (۱) جہاد فارس (۲) جہاد راجل۔ یا اس وجہ سے کہ اس میں انفاق فی سبیل اللہ اور شهادة فی مرضاة الله دونوں چیزیں جمع ہوگئیں۔
(مرقاۃ:۱۱۹/۱، کتاب الایمان)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

جوف اللیل الآخر: یعنی[رات کا آخری حصہ]اس وقت مخلوق سوئی ہوئی ہوتی ہے سکون ہوتا ہے اور ہوا بھی اچھی ہوتی ہے اور عبادت میں بھی خوب جی لگتا ہے اس وقت عبادت کرو اگر ایک دن دو دن توجہ نہ ہوگی تو تیسرے دن ضرور توجہ ہو جائیگی۔

اور اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ دیکھو میرا بندہ روزانہ مجھے پکارتا ہے۔

کونسا وہ دنیا کا انسان ہے کہ اس کے پاس کوئی تین دن تک جائے اور وہ اس کو معاف نہ کردے گا۔اور اس کی درخواست قبول نہ کریگا۔

جوف اللیل الآخر کے افضل ہونے کی وجہ

اسلئے کہ یہ وقت اخلاص کے زیادہ قریب ہے اور ریا کاری اور دکھلاوے سے بہت دور ہے اور نفس پر بھی گراں ہے اور مخلوق سے تنہائی کا وقت ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے نزول کا وقت ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی خاص تجلی دنیوی آسمان کی طرف ہوتی ہے اور اعلان ہوتا ہے کہ کوئی ہے مغفرت طلب کرنے والا میں اسکی مغفرت کروں، کوئی ہے رزق طلب کرنے والا میں اسکو رزق دوں وغیرہ وغیرہ اسلئے یہ وقت تمام اوقات میں افضل ہے۔(مرقاۃ:۱/۱۱۹،کتاب الایمان)

اس کو کسی نے اس طرح نظم کیا ہے۔

تہجد کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا

میں نور کے تڑکے میں جس وقت اٹھا سوکر
اللہ کی رحمت کے دروازے کھلے پائے
آتی تھی صدا پیہم جو مانگنے والا ہو
ہاتھ اپنی عقیدت کے آگے میرے پھیلائے

جو رزق کا طالب ہو میں رزق اسے دوں گا
جو طالب جنت ہو جنت کی طلب لائے
جس جس کو گناہوں سے بخشش کی تمنا ہو
وہ اپنے گناہوں کی کثرت سے نہ گھبرائے
وہ مائل توبہ ہو میں مائل بخشش ہوں
میں رحم سے بخشوں گا وہ شرم سے پچھتائے
یہ سن کے ہوئے جاری آنکھوں سے مری آنسو
قسمت ہے محبت میں رونا جسے آجائے
آقائے گدا پرور! سائل ہوں تیرے در پر
میں اور تو کیا مانگوں تو ہی مجھے مل جائے

﴿جو مشرک نہیں ہے وہ جنتی ہے﴾

﴿۴۳﴾ وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ لَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَيُصَلِّي الْخَمْسَ وَيَصُومُ رَمَضَانَ غُفِرَ لَهٗ قُلْتُ اَفَلَا اُبَشِّرُهُمْ يَارَسُولَ اللّٰهِ قَالَ دَعْهُمْ يَعْمَلُوا۔ (رواه احمد)

حواله: مسند احمد صفحہ:۲۳۲/۵۔

حل لغات: دَعْهم، امر حاضر، چھوڑنا، وَدَعَ، وَدْعًا (ف) المُسافِرُ النَّاس، مسافر کو عیش و آرام میں چھوڑ کر جانا۔

ترجمه: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا ہے، پانچوں نمازوں کی ادائیگی کرتا ہے، رمضان کے روزے رکھتا ہے، تو وہ بخش دیا جائیگا، میں نے کہا کہ میں لوگوں کو خوشخبری سنادوں، اے اللہ کے رسول!؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انکو انکے حال پر چھوڑ دو اور عمل میں لگا رہنے دو۔

دو ارکان ذکر کرنے کی وجہ

تشریح: یہاں صرف دو ارکان ذکر کئے گئے اور ان سے استیعاب کا ارادہ کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ دو کو بول کر کل کا ارادہ کیا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ شرک نہ کرتا ہو اور فرائض کو ادا کرتا رہے تو اس کی مغفرت کردی جائے گی۔

یہاں صرف دو ارکان کو ذکر کیا، حج اور زکوۃ کو ذکر نہیں کیا چونکہ ان کا تعلق صاحب استطاعت اور مالدار لوگوں سے ہے ہر شخص اس کی استطاعت نہیں رکھتا اس لئے ایسے ارکان کو ذکر کیا جن میں امیر و غریب کسی کی تخصیص نہیں یا اس وقت تک ان دونوں ارکان کی فرضیت کا حکم نہیں ہوا تھا۔ (مرقاۃ: ۱/۱۱۹، کتاب الایمان)

غفر اللہ لہ: اس سے مراد وہ صغیرہ گناہ ہیں جو ہر نماز اور ہر روزہ کے درمیان ہو جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عام لوگوں کو یہ خوشخبری سنانے کی اجازت چاہی تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادیا کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ اس پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں، اور عمل کرنا چھوڑ دیں اور گناہ و معصیت کا ارتکاب کرنے لگیں۔ (مظاہر حق جدید: ۱۰۹، ایمان کے ابواب)

حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ معمولی سی چیز معلوم ہوئی، کیونکہ شرک نہ کرنا (اس

میں تو کچھ زور ہی نہیں پڑتا) تو یہ کیا عمل ہوا۔

کسی عمل کے کرنے میں زور پڑتا ہے اور نہ کرنے میں کیا زور پڑتا ہے جیسے سبق پڑھنے میں زور پڑتا ہے نہ پڑھنے میں کیا زور پڑتا ہے۔

دوسری چیز فرائض کو وقت پر ادا کریں، وقت پر نماز پڑھ لی سال بھر میں زکوۃ ادا کردی، اسی طرح سال بھر میں روزے رکھ لئے تو ان چیزوں میں کیا زور پڑتا ہے۔ مگر ان کے نزدیک یہ آسان تھا، اور آج کے مسلمانوں کے نزدیک تو یہ بڑے مشکل اور کٹھن اعمال ہیں۔

تو حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ان کی خبر دوسرے لوگوں کو دیدوں؟

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ نہیں لوگ انہیں پر تکیہ کرلیں گے، انہیں محنت و جہاد کرنے دیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی وہی جواب دیا جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیا تھا، اور دھول مارا تھا۔

احکام عوام وخواص میں فرق

فائدہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خواص کے احکام اور ہوتے ہیں، عوام کے اور ہوتے ہیں، جو باتیں خواص کو بتائی جاتی ہیں، عوام کو نہیں بتائی جاتیں، اور خواص کے لئے بھی ضروری ہے کہ عوام کے عقل وفہم کے اعتبار سے ہی ان سے گفتگو کریں، جن باتوں کا وہ تحمل نہیں کرسکتے اور جو باتیں ان کی عقل وفہم سے باہر ہیں ایسی بتائی جائیں نہ ان کو بتائیں، نہ ان کے سامنے تذکرہ کیا جائے۔ فقط

﴿زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہنی چاہئے﴾

﴿۴۴﴾ وَعَنْهُ اَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ

اَفْضَلِ الْاِیْمَانِ قَالَ اَنْ تُحِبَّ لِلّٰہِ وَتُبْغِضَ لِلّٰہِ وَتُعْمِلَ لِسَانَکَ فِی ذِکْرِ اللّٰہِ قَالَ وَمَاذَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! قَالَ وَاَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَاتُحِبُّ لِنَفْسِکَ وَتَکْرَہَ لَھُمْ مَاتَکْرَہُ لِنَفْسِکَ۔ (رواہ احمد)

حوالہ: مسند احمد: ۵/۲۴۷۔

حل لغات: تُبْغِضَ، نفرت کرنا، انتہائی برا سمجھنا، افعال سے، تکرہ کَرِہَ: الشیَٔ (س) کُرْھاً نفرت کرنا، برا سمجھنا۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایمان کی سب سے افضل بات کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری محبت اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہو، اور تمہاری نفرت بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہو، اور تم اپنی زبان کو اللہ کے ذکر میں مشغول رکھو، انہوں نے عرض کیا اس کے علاوہ اور کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دوسروں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو، اور جو چیز اپنے لئے ناپسند کرتے ہو اس کو دوسروں کے لئے بھی ناپسند کرو۔

تشریح: قولہ وعنہ: انہیں سے روایت ہے یعنی یہ روایت بھی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی ہے کہ انہوں نے حضرت نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ایمان کے شعبوں میں کونسا شعبہ افضل ہے؟ تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو انہی کے مزاج کے مطابق جواب دیا۔

چونکہ ہر شخص کے اعتبار سے جداگانہ شیٔ ہوا کرتی ہے کسی شیٔ کی اہمیت انسان کے اعتبار سے جدا جدا ہوتی ہے، ایک انسان نماز سے محبت رکھتا ہے مگر وہ روزے سے گھبراتا ہے اسی طرح ایک شخص روزے میں تو چست ہے مگر نماز میں ست ہے۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

ان تحب للہ و تبغض للہ: کہ تیری محبت اور تیری دشمنی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور دونوں کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔

یہاں دو چیزوں کو ذکر کر کے مراد یہ لیا گیا ہے کہ دل کی پوری کائنات اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور دل کی ہر حرکت اللہ تعالیٰ کے لئے ہو تو یہ سب سے بڑا عمل ہے جس نے اپنے دل کی تمام حرکتیں اللہ تعالیٰ کے لئے کر دیں تو اس کے تمام اعمال اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جائیں گے۔

اس لئے کہ دل بادشاہ ہے، جسم اس کی رعایا ہے، رعایا بادشاہ کے تابع ہوتی ہے اور جب اس کا دل بدل گیا اللہ تعالیٰ کی محبت سے لبریز ہو گیا، یہاں تک کہ کسی سے محبت اور کسی سے بغض سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جائے تو اس کی تمام کائنات بدل جائے گی، اور اب اس کا ہر ہر عمل یہاں تک کہ اس کا مرنا جینا سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگا، اور یہی کمال ایمان ہے، اور اسی کو قرآن پاک کی اس آیت مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے: "قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ. [کہدو! کہ بے شک میری نماز، میری عبادت، اور میرا جینا، مرنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اسی بات کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں اس کے آگے سب سے پہلے سر جھکانے والا ہوں۔]

تعمل لسانک فی ذکر اللہ: [اور استعمال کر اپنی زبان کو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں]

زبان ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو۔ کہ جب دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے رنگین اور لبریز ہو گیا تو اب زبان بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہے، اور جب زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہے گی پھر وہ زبان برائیوں میں گالی گلوچ میں غیبت چغلی وغیرہ میں مشغول نہیں ہوگی۔ اور ذکر کرنے سے بندہ اللہ تعالیٰ کا مذکور بن جاتا ہے، کہ بندہ زمین پر

اللہ کا ذکر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ عرش پر اس بندہ کا ذکر کرتا۔

باطن کے ساتھ ظاہر کا بنانا بھی ضروری ہے

فائدہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ باطن کے ساتھ ظاہر کا بنانا بھی ضروری ہے، پس ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی، جو کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا تو دل بنا ہوا ہے وہ کافی ہے، پس معلوم ہوگیا باطن کے ساتھ ظاہر کا بنانا بھی ضروری ہے۔

صحبت مشائخ کی ضرورت

اس شعبہ کو صوفیا اور مشائخ نے سنبھالا ہے کہ دل کو بنانے کے ساتھ ذکر اللہ پر بھی محنت کرائی جاتی ہے، اور عامۃً یہ چیز صحبت مشائخ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، اس لئے اس سے صحبت مشائخ کی ضروت بھی معلوم ہوگئی کسی نے کیا خوب کہا ہے: ؎

ہر دم اللہ اللہ کر، نور سے اپنا سینہ بھر

جینا ہے تو اسکا ہوکر جی، مرنا ہے تو اسکا ہوکر مر

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چیزیں ذکر فرمادیں، ایک دل کی کائنات اور دوسرے لسان کی۔ دو چیزوں کو ذکر کردیا اور خاموش ہوگئے۔

تا کہ ان کے اندر مزید طلب پیدا ہو اور جب طلب پیدا ہوگئی، تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے پھر سوال کیا کہ:

وَمَاذَا[1] یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! حضرت اس کے بعد اور کیا کروں؟

[1] ماذا: اس کو منصوب بنانا بھی درست ہے، اصنع فعل کے ذریعہ سے معنی ہوں گے "ایُّ شیءٍ اصنع بعد ذلک؟" اور مرفوع بنانا بھی صحیح ہے ابتداء کی وجہ سے معنی ہوں گے "ایُّ شیءٍ اصنعه؟" اول صورت میں وہ اس کا قول ہوگا۔ (شرح الطیبی: ۱۸۲/۱، کتاب الایمان)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ:

ان تحب للناس ماتحب لنفسک و تکرہ للناس ماتکرہ لنفسک: کہ ایمان کا ایک بڑا شعبہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کے لئے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہو اور ان کے لئے وہی چیز ناپسند کرے جس کو خود اپنے لئے ناپسند کرتا ہو۔

ان دو جملوں میں پوری معاشرت آ گئی، جب بندہ کا یہ حال ہو جائے کہ جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، وہی اپنے بھائی کے لئے پسند کرتا ہے۔ تو پوری معاشرت درست ہو جاتی ہے، اور پوری زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے اور اس پر عمل کرنے سے پوری دنیا میں امن وسلامتی، سکون، اطمینان پیدا ہو جاتا ہے، معلوم ہوا کہ مذہب اسلام ہی دنیا میں امن وامان قائم ہونے کا ضامن ہے، پس یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے، اور اس میں پورا دین سمٹ آیا ہے۔

یہ نہیں کہ اپنے لئے تو یہ چاہے کہ تجارت میں خوب نفع ہو اور دوسرے کے لئے یہ چاہے کہ اس کے مکانات بھی فروخت ہو جائیں۔

یا یہ جیسے طالب علم چاہا کرتے ہیں کہ میں باون نمبر سے پاس ہو جاؤں، اور دوسرے کو ایک بھی نہ ملے۔

اپنے واسطے تو اولاد چاہے کہ ایک تو ہو ہی جائے جس کی حضرات انبیاء علیہم السلام نے بھی تمنا کی ہے اور دوسرے کے لئے چاہے کہ یوں ہی رہیں۔

اگر کسی کے اولاد نہ ہو تو وہ شادیاں کرتا پھرتا ہے کہ کسی طرح ایک تو لونڈا ہو ہی جائے، اور جب یہ خبر اس کے بھائی کو پہونچتی ہے تو وہ لڑکی والوں کے گھر جا کر کہتا ہے کہ یہ تو بڑا بیمار آدمی ہے کہ اس کو تو ایسی تکلیف ہے۔

کیونکہ اسے فکر ہے کہ اگر شادی ہوگئی تو جائداد تقسیم ہو جائیگی، ورنہ سب مجھ کو ملے گی۔

باب الکبائر

وعلامات النفاق

جس میں از ۴۵؍ تا ۵۶؍ کل گیارہ احادیث مبارکہ کی شرح اور ان کے احکام وفوائد کا تذکرہ ہے۔ صغیرہ، کبیرہ کی تعریف۔ ہر ایک کا حکم اور دونوں کی فہرست بیان کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بَابُ الْکَبَائِرِ وَعَلَامَاتِ النِّفَاقِ

﴿الفصل الاول﴾

سب سے بڑا گناہ شرک ہے

﴿۴۵﴾ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَجُلٌ یَارَسُولَ اللّٰهِ! اَیُّ الذَّنْبِ اَکْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ قَالَ: "اَنْ تَدْعُوَ لِلّٰهِ نِدًّا، وَهُوَ خَلَقَكَ" قَالَ: ثُمَّ اَیٌّ قَالَ: "اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ خَشْیَةَ اَنْ یَطْعَمَ مَعَكَ" قَالَ: ثُمَّ اَیٌّ قَالَ: "اَنْ تُزَانِیَ حَلِیْلَةَ جَارِكَ" فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَصْدِیْقَهَا "وَالَّذِیْنَ لَایَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهاً اٰخَرَ وَلَایَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ۔ الآیة۔ (متفق علیه)

حواله: بخاری شریف ۱۰۱۴/۲، باب قوله تعالیٰ "ومن یقتل مومنا متعمدا الخ" کتاب الدیات ، حدیث نمبر: ۶۸۶۱، مسلم شریف: ۶۳/۱، باب کون الشرک اقبح الذنوب وبیان اعظمها بعده، کتاب الایمان، رقم الحدیث: ۸۶. عالمی حدیث نمبر: ۴۹۔

حل لغات: نداً، مثل، نظیر، ہم سر، ج، انداد، حَلِیْلَةٌ، بیوی، پڑوسن، ج حلائل.

تـرجـمـه: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے تم کو پیدا فرمایا تم اس کا شریک ٹھہراؤ'' (یہ سب سے بڑا گناہ ہے) پھر اس شخص نے کہا کہ ''اس کے بعد سب سے بڑا کون سا گناہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس اندیشہ سے قتل کردو کہ تمہارے ساتھ کھائے گی'' پھر اس نے پوچھا: اس کے بعد سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی کے ساتھ زنا کرو'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی تصدیق میں اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی۔[وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے ہیں، جس جان کو اللہ تعالی نے قتل کرنا حرام قرار دیا ہے، اس کو ناحق قتل نہیں کرتے ہیں، اور زنا نہیں کرتے ہیں۔

کبائر کا بیان اور نفاق کی نشانیاں۔

تشریح: "الکبائر'' کبیرۃ کی جمع ہے، یہ صفت ہے موصوف محذوف کی۔ "ای معصیۃ کبیرۃ"

کبیرۃ میں معنی وصفی غالب آ گئے اور کثرت استعمال کی وجہ سے صفت ہی موصوف کی جگہ استعمال ہونے لگی۔

گناہ کبیرہ کے اندر علماء کا اختلاف

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ گناہ کبیرہ اس کو کہتے ہیں جس گناہ پر دنیا میں شرعی حد مقرر کی گئی ہو جیسے شراب، زنا اور چوری کہ ان سب چیزوں پر حد ہے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ گناہ کبیرہ کی تعریف نہیں بلکہ نشانی ہے۔

گناہ کبیرہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایسا گناہ ہے جس پر کوئی وعید سنائی گئی ہو۔

حد: اگر کسی گناہ پر دنیا میں سزا دیجائے تو اس کو حد کہتے ہیں۔

وعید: اگر کسی گناہ پر آخرت کی دھمکی دی گئی ہو تو اس کو وعید کہتے ہیں۔

مگر یہ دونوں تعریفیں جامع نہیں ہیں۔ کیونکہ گناہ کبیرہ اپنی ذات کے اعتبار سے تو کبیرہ ہے مگر مافوق کے اعتبار سے صغیرہ ہے۔ جیسے زنا کہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے تو کبیرہ ہے مگر غیبت کے اعتبار سے صغیرہ ہے۔

حقیقی تعریف گناہ کبیرہ کی یہ ہے کہ

جس گناہ کو عارفین حق کبیرہ کہیں وہ کبیرہ ہیں، اور جس کو صغیرہ کہیں وہ صغیرہ ہے، ہم ان کو شمار نہیں کر سکتے بس یہ عارفین پر ہی موقوف ہے۔

ان یعد العارفون صغیرۃ فصغیرۃ وان یعد العارفون کبیرۃ فکبیرۃ.

اور بعضوں نے یہ تعریف کی ہے کہ گناہ کا کبیرہ اور صغیرہ ہونا شخصیات کے اعتبار سے ہے بعض کبیرہ بعض کے لئے صغیرہ اور بعض صغیرہ بعض کے لئے کبیرہ ہیں۔

اگر ایک شخص اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق رکھتا ہے اور وہ تہجد پڑھتا ہے حالانکہ تہجد نہ پڑھنا کوئی گناہ نہیں مگر جس نے شروع کردی اس کو نہ پڑھنا بڑا گناہ ہے، ایک شخص کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مگر تعلق کر کے پھر تعلق ختم کر دینا یہ بڑا گناہ ہے۔

تو دو قسمیں بیان کردیں کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں ایک صغیرہ اور دوسرے کبیرہ۔

کسی شئی کی تقسیم سے اس کا تعارف ہوتا ہے تعریف نہیں ہوتی۔

تعریف تو حد تام رسم تام جنس اور فصل وغیرہ سے ہوتی ہے کہ کوئی فرد تعریف سے نکل نہ سکے۔

یہ تعارف ہے تعریف نہیں ہے، جیسے استثناء متصل اور استثناء منقطع کے ذریعہ سے۔

صغیرہ وکبیرہ میں مختلف اقوال

جمہور کے آپس میں کبیرہ وصغیرہ میں مختلف اقوال ہو گئے ہیں۔

(۱)......حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حسن بصریؒ کے نزدیک جس گناہ پر اللہ تعالیٰ نے نار، غضب یا لعنت کے ساتھ وعید کی وہ کبیرہ ہے ورنہ صغیرہ۔

(۲)...... جو گناہ فضائل اعمال سے معاف نہیں ہوتے وہ کبیرہ ہے۔ اور جو معاف ہو جاتے ہیں وہ صغیرہ ہے۔

(۳)...... قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ جس گناہ پر شریعت نے خاص کوئی حد مقرر کی ہے وہ کبیرہ ہے۔

(۴)...... امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جس گناہ کو کرنے والا بے پروائی کے ساتھ کرتا ہے وہ کبیرہ ہے اور جس گناہ کو کرتے وقت دل میں خوف و ڈر ہوتا ہے صرف وسوسہ شیطان سے مغلوب ہو کر مرتکب ہو جاتا ہے وہ صغیرہ ہے۔

(۵)......بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جس گناہ پر لفظ فاحشہ کا اطلاق کیا گیا ہو وہ کبیرہ ہے۔

(۶)......ابن صلاحؒ فرماتے ہیں کہ جس پر اسم کبیرہ یا عظیم کا اطلاق کیا گیا ہے وہ کبیرہ ہے۔

(۷)......ابن السلامؒ کہتے ہیں کہ جس گناہ کا مفسدہ وخرابی منصوص علیہ کبائر کے مفسدہ وخرابی سے زیادہ یا برابر ہو وہ کبیرہ ہے اگر کم ہو تو صغیرہ ہے۔

(۸)......جس گناہ میں کسی مسلمان کی عزت دری یا دین کے کسی حکم کی بے حرمتی ہو وہ کبیرہ ہے۔

(۹)......امام غزالیؒ سے دوسرا قول ہے کہ کبیرہ وصغیرہ امور اضافیہ میں سے ہے ہر گناہ اپنے ماتحت کے اعتبار سے کبیرہ ہے اور مافوق کے اعتبار سے صغیرہ ہے۔

(۱۰)......ابوالحسن الواحدیؒ نے کہا کہ صحیح بات یہ ہے کہ کبیرہ کی کوئی خاص تعریف نہیں ہے بلکہ شریعت نے بعض معاصی کو کبائر سے تعبیر کیا اور بعض کو صغائر سے تعبیر کیا اور بہت سے گناہوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا کبیرہ ہے یا صغیرہ، لیکن وہ بھی کسی ایک میں ضرور داخل ہے، اور عدم بیان میں یہ حکمت ہے کہ خالص بندہ اس کو کبیرہ خیال کر کے

پرہیز کرے۔"تلک عشرة کاملة"

ان کے علاوہ اور بہت سے اقوال ہیں مگر اکثر مرجوح ہیں۔(مرقاۃ)

کبیرہ گناہوں کی فہرست

حافظ ذہبیؒ نے اپنی کتاب میں ستر گناہ لکھے ہیں اور ان کے بارے میں جو وعیدیں ہیں وہ بھی درج کی ہیں۔ان کی کتاب کا مراجعہ کرلیا جائے۔

اجمالی طور پر ہم حافظ ذہبیؒ کی کتاب سے کبیرہ گناہوں کی فہرست لکھتے ہیں۔

(۱)......شرک اور شرک کے علاوہ وہ عقائد و اعمال جن سے کفر لازم آتا ہے۔(کفر و شرک کی مغفرت کبھی نہ ہوگی:"کما جاء مصرحا فی کتاب اللہ تعالیٰ")

(۲)......کسی جان کو عمداً قتل کرنا۔

(۳)......جادو کرنا۔

(۴)......فرض نماز کو چھوڑنا یا وقت سے پہلے پڑھنا۔

(۵)......زکوۃ نہ دینا۔

(۶)...... بلا رخصت شرعی رمضان شریف کا کوئی روزہ چھوڑنا یا رمضان کا روزہ رکھ کر بلا عذر توڑ دینا۔

(۷)......فرض ہوتے ہوئے حج کئے بغیر مرجانا۔

(۸)...... والدین کو تکلیف دینا۔اور ان امور میں ان کی نافرمانی کرنا جن میں فرمانبرداری واجب ہے۔

(۹)......رشتہ داروں سے قطع تعلق کرنا۔

(۱۰)......زنا کرنا۔

(۱۱)......غیر فطری طریقے پر عورت سے جماع کرنا یا کسی مرد یا لڑکے سے اغلام کرنا۔

(۱۲)......سود کا لین دین کرنا یا سود کا کاتب یا شاہد بننا۔

(۱۳)......ظلماً یتیم کا مال کھانا۔

(۱۴)......اللہ تعالیٰ پر یا اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنا۔

(۱۵)......میدان جہاد سے بھاگنا۔

(۱۶)......جو اقتدار اعلیٰ پر ہو اس کا رعیت کو دھوکہ دینا اور خیانت کرنا۔

(۱۷)......تکبر کرنا۔

(۱۸)......جھوٹی گواہی دینا یا کسی کا حق مارا جا رہا ہو تو جانتے ہوئے گواہی نہ دینا۔

(۱۹)......شراب پینا یا کوئی نشہ والی چیز کھانا پینا۔

(۲۰)......جوا کھیلنا۔

(۲۱)......کسی پاک دامن عورت کو تہمت لگانا۔

(۲۲)......مال غنیمت میں خیانت کرنا۔

(۲۳)......چوری کرنا۔

(۲۴)......ڈاکہ مارنا۔

(۲۵)......جھوٹی قسم کھانا۔

(۲۶)......کسی بھی طرح سے ظلم کرنا۔ (مار پیٹ کر ہو یا ظلماً مال لینے سے ہو یا گالی گلوچ کرنے سے ہو)

(۲۷)......ٹیکس وصول کرنا۔

(۲۸)......حرام مال کھانا یا پینا یا پہننا یا خرچ کرنا۔

(۲۹)......خودکشی کرنا یا اپنا کوئی عضو کاٹ دینا۔

(۳۰)......جھوٹ بولنا۔

(۳۱)......قانونِ شرعی کے خلاف فیصلے کرنا۔

(۳۲)......رشوت لینا۔

(۳۳)......عورتوں کا مردوں کی یا مردوں کا عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا۔ (جس میں داڑھی مونڈنا بھی شامل ہے)

(۳۴)......اپنے اہل وعیال میں فحش کام یا بے حیائی ہوتے ہوئے دور کرنے کی فکر نہ کرنا۔

(۳۵)......تین طلاق دی ہوئی عورت کے پرانے شوہر کا حلالہ کروانا اور اس کیلئے حلالہ کر کے دینا۔

(۳۶)......بدن میں یا کپڑوں میں پیشاب لگنے سے پرہیز نہ کرنا۔

(۳۷)......دکھاوے کے لئے اعمال کرنا۔

(۳۸)......کسب دنیا کے لئے علم دین حاصل کرنا اور علم دین کو چھپانا۔

(۳۹)......خیانت کرنا۔

(۴۰)......کسی کے ساتھ سلوک کر کے احسان جتانا۔

(۴۱)......تقدیر کو جھٹلانا۔

(۴۲)......لوگوں کے خفیہ حالات کی ٹوہ لگانا۔تجسس کرنا۔اور کنسوئی لینا۔

(۴۳)......چغلی کھانا۔

(۴۴)......لعنت بکنا۔

(۴۵)......دھوکہ دینا اور جو عہد کیا ہو اس کو پورا نہ کرنا۔

(۴۶)......کاہن اور منجم (غیب کی خبریں بتانے والے) کی تصدیق کرنا۔

(۴۷)......شوہر کی نافرمانی کرنا۔

(۴۸)......تصویر بنانا یا گھر میں لٹکانا۔

(۴۹)......کسی کی موت پر نوحہ کرنا۔منہ پیٹنا۔کپڑے پھاڑنا۔سر منڈانا ہلاکت کی دعا کرنا۔

(۵۰)......سرکشی کرنا۔اللہ کا باغی ہونا،مسلمانوں کو تکلیف دینا۔

(۵۱)......مخلوق پر دست درازی کرنا۔

(۵۲)......پڑوسی کو تکلیف دینا۔

(۵۳)......مسلمانوں کو تکلیف دینا اور ان کو برا کہنا۔

(۵۴)......خاص کر اللہ کے نیک بندوں کو تکلیف دینا۔

(۵۵)......ٹخنوں پر یا اس سے نیچے کوئی کپڑا پہنا ہوا لٹکانا۔

(۵۶)......مردوں کو ریشم اور سونا پہننا۔

(۵۷)......غلام کا آقا سے بھاگ جانا۔

(۵۸)......غیر اللہ کے لئے ذبح کرنا۔

(۵۹)......جانتے بوجھتے ہوئے اپنے باپ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو باپ بنالینا۔(یعنی دعویٰ کرنا کہ فلاں میرا باپ ہے،حالانکہ وہ اس کا باپ نہیں)

(۶۰)......فساد کے طور پر لڑائی جھگڑا کرنا۔

(۶۱)......(بوقت حاجت) بچا ہوا پانی دوسروں کو نہ دینا۔

(۶۲)......ناپ تول میں کمی کرنا۔

(۶۳)......اللہ کی گرفت سے بے خوف ہو جانا۔

(۶۴)......اولیاء اللہ کو تکلیف دینا۔

(۶۵)......نماز با جماعت کا اہتمام نہ کرنا۔

(۶۶)......بغیر شرعی عذر نماز جمعہ چھوڑ دینا۔

(۶۷)......ایسی وصیت کرنا جس سے کسی وارث کو ضرر پہنچانا مقصود ہو۔

(۶۸)......مکر کرنا اور دھوکہ دینا۔

(۶۹)......مسلمانوں کے پوشیدہ حالات کی ٹوہ لگانا اور ان کی پوشیدہ چیزوں پر دلالت کرنا۔

(۷۰)......کسی صحابی کو گالی دینا۔

یہاں تک حافظ ذہبیؒ کی کتاب سے اقتباس ختم ہوا۔ ہم نے ترتیب سے نمبر ڈالے ہیں، بعض چیزیں مکرر بھی آ گئی ہیں، اور بعض مشہور چیزیں ان سے رہ گئی ہیں، اور ان کی کتاب کے بعض نسخوں میں بعض چیزیں زائد ہیں (جو ذیل میں درج شدہ فہرس میں آ گئی ہیں) صغائر وکبائر کے بیان میں علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی صاحب البحر الرائق رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک رسالہ ہے جو الاشباہ والنظائر کے آخر میں چھپا ہوا ہے۔ انہوں نے مزید کبیرہ گناہوں کی فہرست دی ہے جو حافظ ذہبیؒ کی فہرست سے زیادہ ہے۔ مثلاً

(۷۱)......کسی ظالم کا مددگار بننا۔ قدرت ہوتے ہوئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کرنا۔

(۷۲)......جادو سیکھنا اور سکھانا یا اس پر عمل کرنا۔

(۷۳)......قرآن کو بھول جانا۔

(۷۴)......کسی حیوان کو زندہ جلانا۔

(۷۵)......اللہ کی رحمت سے ناامید ہو جانا۔

(۷۶)......مردار یا خنزیر بغیر اضطرار کے کھانا۔

(۷۷)......صغیرہ گناہ پر اصرار کرنا۔

(۷۸)......گناہوں پر مدد کرنا اور ان پر آمادہ کرنا۔

(۷۹)......گانے کا پیشہ اختیار کرنا۔

(۸۰)......لوگوں کے سامنے ننگا ہونا۔

(٨١)......ناچنا۔

(٨٢)......دنیا سے محبت کرنا۔

(٨٣)......حاملین قران اور علماء کرام کے حق میں بدگوئی کرنا۔

(٨٤)......اپنے امیر کے ساتھ غدر کرنا۔

(٨٥)......کسی کے نسب میں طعن کرنا۔

(٨٦)......گمراہی کی طرف دعوت دینا۔

(٨٧)......اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرنا۔

(٨٨)......اپنے غلام کوخصی کرنا یااس کے اعضاء میں سے کوئی عضو کاٹ دینا۔

(٨٩)......کسی محسن کی ناشکری کرنا۔

(٩٠)......حرم میں الحاد کرنا۔

(٩١)......نردسے کھیلنا۔اور ہروہ کھیل کھیلنا جس کی حرمت پر امت کا اجماع ہے۔

(٩٢)...... بھنگ پینا۔(ہیروئن اسی کے حکم میں ہے)

(٩٣)......کسی مسلمان کوکافر کہنا۔

(٩٤)......بیویوں کے درمیان عدل نہ کرنا۔

(٩٥)......مشت زنی کرنا۔

(٩٦)......حالت حیض میں جماع کرنا۔

(٩٧)......مسلمانوں کے ملک میں مہنگائی ہو جائے تو خوش ہونا۔

(٩٨)......جانور کے ساتھ بدفعلی کرنا۔

(٩٩)......عالم کا اپنے علم پر عمل نہ کرنا۔

(١٠٠)......کھانے کوعیب لگانا۔

(۱۰۱)...... بے ریش حسین لڑکے کی طرف دیکھنا۔

(۱۰۲)...... کسی کے گھر میں بلا اجازت نظر ڈالنا اور بلا اجازت اندر چلے جانا۔

علامہ ابن نجیمؒ کی فہرست متعلقہ کبائر ختم ہوئی۔ ہم نے مکررات کو ختم کر دیا ہے، یعنی حافظ ذہبی کے رسالہ میں جو چیزیں آئی تھیں، ان کو نہیں لیا اور بعض دیگر چیزوں کو بھی چھوڑ دیا ہے۔

صغیرہ گناہوں کی فہرست

اس کے بعد حافظ ابن نجیمؒ نے صغائر کی فہرست دی ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

(۱)...... جہاں نظر ڈالنا حرام ہو وہاں دیکھنا۔

(۲)...... بیوی کے سوا کسی کا شہوت سے بوسہ لینا، یا بیوی کے سوا کسی کو شہوت سے چھونا۔

(۳)...... اجنبیہ کے ساتھ خلوت میں رہنا۔

(۴)...... سونے چاندی کے برتن استعمال کرنا۔

(۵)...... کسی مسلمان سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرنا، یعنی سلام کلام بند رکھنا۔

(۶)...... کسی نمازی کا نماز پڑھتے ہوئے اپنے اختیار سے ہنسنا۔

(۷)...... کھڑے ہو کر پیشاب کرنا۔

(۸)...... مصیبت پر نوحہ کرنا، اور منہ پیٹنا، (یا گریبان پھاڑنا اور جاہلیت کی دہائی دینا۔)

(۹)...... مرد کو ریشم کا کپڑا پہننا۔

(۱۰)...... تکبر کی چال چلنا۔

(۱۱)...... فاسق کے ساتھ بیٹھنا۔

(۱۲)...... مکروہ وقت میں نماز پڑھنا۔

(۱۳)...... مسجد میں نجاست داخل کرنا، یا دیوانے کو یا بچے کو مسجد میں لے جانا جس کے جسم یا

کپڑے پر نجاست ہونے کا غالب گمان ہو۔

(۱۴)...... پیشاب پاخانہ کے وقت قبلہ کی طرف منہ کرنا یا پشت کرنا۔

(۱۵)...... تنہائی میں بطور عبث شرم گاہ کو کھولنا۔

(۱۶)...... لگاتار نفلی روزے رکھنا جس میں بیچ میں افطار نہ ہو۔

(۱۷)...... جس عورت سے ظہار کیا ہو کفارہ دینے سے پہلے اس سے وطی کرنا۔

(۱۸)...... کسی عورت کا بغیر شوہر اور محرم کے سفر کرنا۔

(۱۹)...... کسی دوسرے خریدار سے زیادہ قیمت دلوانے کے لئے مال کے دام زیادہ لگا دینا، جب کہ خود خریداری کا ارادہ نہ ہو۔

(۲۰)...... ضرورت کے وقت مہنگائی کے انتظار میں غلہ روکنا۔

(۲۱)...... کسی مسلمان بھائی کی بیع پر بیع کرنا یا کسی کی منگنی پر منگنی کرنا۔

(۲۲)...... باہر سے مال لانے والوں سے شہر سے باہر ہی سودا کر لینا (تاکہ سارا مال اپنا ہو جائے اور پھر دام چڑھا کر بیچیں)

(۲۳)...... جو لوگ دیہات سے مال لائیں ان کا مال اپنے قبضہ میں کر کے مہنگا بیچنا۔

(۲۴)...... اذان جمعہ کے وقت بیع وشراء کرنا۔

(۲۵)...... مال کا عیب چھپا کر بیچنا۔

(۲۶)...... شکار یا مویشیوں کی حفاظت کی ضرورت کے بغیر کتا پالنا۔

(۲۷)...... مسجد میں حاضرین کی گردنوں کو پھاند کر جانا۔

(۲۸)...... زکوۃ کی ادائیگی فرض ہو جانے کے بعد ادائیگی میں تاخیر کرنا۔

(۲۹)...... راستے میں بیع وشراء یا کسی ضرورت کے لئے کھڑا ہونا جس سے راہ گیروں کو تکلیف ہو یا راستے میں پیشاب پاخانہ کرنا۔ (سائے اور دھوپ میں جہاں لوگ اٹھتے بیٹھتے

ہوں اور پانی کے گھاٹ پر پیشاب پاخانہ کرنا بھی اسی ممانعت میں داخل ہے۔)

(۳۰)......بحالت جنابت اذان دینا، یا مسجد میں داخل ہونا یا مسجد میں بیٹھنا۔

(۳۱)......نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھنا اور کپڑے وغیرہ سے کھیلنا۔

(۳۲)......نماز میں گردن موڑ کر دائیں بائیں دیکھنا۔

(۳۳)......مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا، اور وہ کام کرنا جو عبادت نہیں ہیں۔

(۳۴)......روزے دار کو بوس وکنار کرنا، اگر اپنے نفس پر اطمینان نہ ہو۔

(۳۵)......گھٹیا مال سے زکوۃ ادا کرنا۔

(۳۶)......ذبح کرنے میں اخیر تک (پوری گردن) کاٹ دینا۔

(۳۷)......بالغ عورت کا اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کر لینا۔

(۳۸)......ایک سے زیادہ طلاق دینا۔

(۳۹)......زمانہ حیض میں طلاق دینا۔

(۴۰)......جس طہر میں جماع کیا ہو اس میں طلاق دینا۔

(۴۱)......اولاد کو لینے دینے میں کسی ایک کو ترجیح دینا۔ الا یہ کہ علم یا صلاح کی وجہ سے کسی کو ترجیح دے۔

(۴۲)......قاضی کو مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان برابری نہ کرنا۔

(۴۳)......سلطان کا یا جس کے مال میں غالب حرام ہو ہدیہ قبول کرنا اور اس کا کھانا اور اس کی دعوت قبول کرنا۔

(۴۴)......کسی کی زمین میں بغیر اجازت کے چلنا۔

(۴۵)......انسان یا کسی حیوان کا مثلہ کرنا۔ (یعنی ہاتھ پاؤں ناک کان کاٹ دینا۔)

(۴۶)......نماز پڑھتے ہوئے تصویر پر سجدہ کرنا یا ایسی صورت میں نماز پڑھنا کہ نمازی کے

مقابل یا اس کے برابر تصویر ہو۔

(۴۷)......کافر کو سلام کرنا۔

(۴۸)......بچہ کو وہ لباس پہنانا جو بالغ کے لئے جائز نہ ہو۔

(۴۹)......پیٹ بھر نے کے بعد بھی کھاتے رہنا۔

(۵۰)......مسلمان سے بدگمانی کرنا۔

(۵۱)......لہو ولعب کی چیزیں سننا۔

(۵۲)......غیبت سن کر خاموش رہ جانا (غیبت کرنے والے کو منع نہ کرنا اور تردید نہ کرنا)

(۵۳)......زبردستی امام بننا (جب کہ مقتدیوں کو اس کی امامت گوارا نہ ہو اور اس کی ذات میں دینی اعتبار سے کوئی قصور ہو)

(۵۴)......خطبے کے وقت میں باتیں کرنا۔

(۵۵)......مسجد کی چھت پر یا مسجد کے راستے میں نجاست ڈالنا۔

(۵۶)......دل میں یہ نیت رکھتے ہوئے کسی سے کوئی وعدہ کر لینا کہ پورا نہیں کروں گا۔

(۵۷)......مزاح یا مدح میں افراط کرنا۔

(۵۸)......غصہ کرنا۔(ہاں اگر دینی ضرورت سے ہو تو جائز ہے)

عام طور سے جن چیزوں میں لوگ مبتلا ہیں وہ ہم نے ذکر کر دی ہیں، بعض چیزیں جو ابن نجیمؒ کی کتاب میں ہیں وہ ہم نے چھوڑ دی ہیں اور صغائر میں انہوں نے بعض وہ چیزیں ذکر کی ہیں جن کو حافظ ذہبیؒ نے کبائر میں شمار کیا ہے، اور یوں بھی مذکورہ گناہوں میں بعض کو صغائر میں شمار کرنا محل نظر ہے، خاص کر کسی مسلمان سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرنا اور سلام کلام بند رکھنا اس کو صغائر میں شمار کرنا نادرست ہے، اس پر حدیث شریف میں سخت وعید آئی ہے۔ اور یہ ایک اجتہادی امر ہے کہ صغیرہ گناہ کون کون سے ہیں اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق

حضرات اکابر نے تعیین فرمادی ہے۔

حج یا عمرہ کا احرام میں داخل ہو کر اسے فاسد کر دینا یا ممنوعات احرام کا قصداً ارتکاب کرنا یا نماز شروع کر کے بغیر عذر شرعی کے توڑ دینا اس کا ذکر نہ حافظ ذہبی نے کیا نہ ابن نجیم نے، اگر دیگر احادیث شریفہ پر نظر ڈالی جائے تو بہت سے اور گناہ بھی سامنے آجائیں گے۔

صغیرہ گناہ بھی گناہ ہے، اس سے بھی بچنا واجب ہے، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی بچو کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا بھی مواخذہ کرنے والے ہیں، یعنی فرشتے جو نیکی بدی لکھنے پر مامور ہیں، وہ ان کو بھی لکھتے ہیں۔ (مشکوۃ المصابیح: ۴۵۸)

فائدہ: صغیرہ گناہ کا ارتکاب اگر عذاب اور مواخذہ سے ڈرتے ہوئے کر لیا جائے تو صغیرہ ہے، اگر لاپرواہی سے کیا جائے اور یہ سمجھ کر کرے کہ اس میں کوئی بات نہیں تو پھر کبیرہ ہو جاتا ہے، اسی طرح صغیرہ پر اصرار کرنے یعنی بار بار ارتکاب کرنے سے بھی صغیرہ کبیرہ ہو جاتا ہے، اور جس عمل کی جو ممانعت قرآن وحدیث میں وارد ہوئی ہے اس ممانعت کو کوئی حیثیت نہ دینا یہ کفر ہے۔ خواہ گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا:

ای الذنب[۱] اکبر: [کونسا گناہ بڑا ہے]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

ان تدعو للّٰہ ندا: [کہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرو پکارو]

---

[۱] **افادہ:** الذنب: اس کے معنی ہیں جرم۔ اور حسب مغفرت اس کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جس کی معافی نہیں اور وہ شرک باللہ ہے، دوسری قسم جس کی معافی کی امید ہے توبہ استغفار کے ذریعہ سے اور وہ اللہ اور بندہ کے درمیان ہیں (یعنی حقوق اللہ) اور یہ تیسری قسم یہ ہے کہ صاحب حق کی طرف رجوع کرنا اور لوٹانا ضروری ہے اور وہ لوگوں کے حقوق ہیں۔ (شرح الطیبی: ۱۸۳/۱، باب الکبائر)

دراں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو پیدا کیا ہے، بھلا جس نے پیدا کیا اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کریں۔

ان معبودوں کو پوجنے والوں سے پوچھو کہ انہوں نے تم کو پیدا کیا ہے انہوں نے تمہاری ناک بنائی ہے؟ آنکھ بنائی ہے؟ زبان بنائی ہے؟ چہرہ بنایا ہے؟ یا کوئی اور عضو جسم بنایا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں تو پھر تم ان کو کیوں پوجتے ہو۔ پھر ایسی چیزوں کو پوجنا کتنی بڑی نادانی اور حماقت ہے۔

اس شخص نے پھر سوال کیا کہ حضرت جی اس کے بعد کونسا گناہ بڑا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ

ان تقتل ولدک الخ: کہ تم اپنی اولاد کو اس خوف سے قتل کرو کہ وہ تمہارے ساتھ کھاویں گے۔

اس لئے کہ یہ معصیت قتل کے ساتھ قطعیت رحم کو بھی شامل ہے، رشتہ داروں کے قتل کی انواع میں سب سے زیادہ برا باپ کا قتل کرنا ہے، پھر اولاد کا، تو اولاد کا قتل کرنا اکبر الکبائر ہوگیا، کفر کے بعد مطلق نفس مومنہ کا قتل گناہ کبیرہ ہے۔ حدیث ہذا میں ولد کو اپنے ساتھ کھانے کے ڈر سے قتل کرنے کی زیادہ قباحت کو ظاہر کرنے کے لئے خاص کر کے بیان کیا گیا۔ اس لئے کہ اس میں ایک ساتھ تین گناہ پائے جاتے ہیں۔ ایک تو قتل، دوسرا اپنے ولد کو قتل کرنے میں قطع رحمی ہے۔ پھر کھانے کے ڈر سے۔ تیسرا گناہ خدا کی رزاقیت پر عدم ایمان پایا جاتا ہے۔ نیز اہل عرب کے رواج کی بناء پر بھی قتل ولد کو خاص کیا گیا کہ وہ بچوں کو زندہ درگور کر لیتے تھے، اس طرف بھی اشارہ مقصود ہے۔ (مرقاۃ: ۱۲۱/۱، باب الکبائر)

اور قتل اولاد کی ہی ایک قسم نسبندی ہے جو آج کل شروع کر رکھی ہے کہ جب اتنی اولاد ہوگی تو کھانے کو کہاں سے آئیگا۔

قتل جنین

آج کل زمانہ حمل ہی میں مشینوں کے ذریعہ سے پتہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ اور اگر لڑکی ہونا معلوم ہوتا ہے تو زمانہ حمل ہی میں اس کو ضائع کر دیتے ہیں، اور یہ رجحان بڑھتا جا رہا ہے، جو بہت ہی خطرناک ہے۔

اولاً تو زنا اور پھر وہ بھی پڑوسی کی بیوی سے یہ سخت ترین گناہ ہے۔

حلیلۃ: [حلال شدہ] مراد بیوی۔

چونکہ وہ آپ کا پڑوسی ہے اس نے آپ کی امانت پر اعتماد کیا ہے اور اس کے اور آپ کے درمیان حق جوار ثابت ہو چکا ہے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے حضرت جبرئیل علیہ السلام برابر وصیت کرتے رہے پڑوسی کے بارے میں یہاں تک کہ میں سمجھنے لگا کہ وہ اس کو وارث بنا دیں گے تو زنا اپنے پڑوسی کی بیوی سے کرنا ایک تو زنا دوسرے پڑوسی کے حق کو باطل کرنا تیسرے اس نے آپ کو امین سمجھا تھا تو اس کے ساتھ خیانت سے پیش آنا تو اس لئے یہ سب سے زیادہ قبیح زنا ہوا۔ (شرح الطیبی: ۱۸۵/۱، باب الکبائر)

اس شخص نے پھر سوال کیا کہ اس کے بعد کونسا گناہ اکبر ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

ان تزنی حلیلۃ جارک: [اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا]

اس کی تصدیق کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی ہے:

”الذین یدعون مع اللہ الھاً اٰخر. ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق ولا یزنون“

[اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کبھی بھی دوسرے معبود کی عبادت نہیں کرتے اور جس جان

کو اللہ تعالیٰ نے حرمت بخشی ہے اسے ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ وہ زنا کرتے ہیں اور جو شخص بھی یہ کام کریگا اسے اپنے گناہ کے وبال کا سامنا کرنا پڑیگا۔] (آسان ترجمہ قرآن)

والدین کی نافرمانی سخت گناہ ہے

﴿۴۶﴾ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْكَبَائِرُ اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَالْيَمِيْنُ الْغَمُوْسُ، رَوَاهُ الْبُخَارِي وَفِي رِوَايَةِ اَنَسٍ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ بَدَلَ الْيَمِيْنِ الْغَمُوْسِ۔ (متفق عليه)

حواله: بخاری شریف: ۲/۹۸۷، باب اليمين الغموس، كتاب الايمان والنذور، حديث نمبر: ۶۶۷۵، مسلم شريف: ۱/۶۴، باب بيان الكبائر واكبرها، كتاب الايمان، رقم الحديث: ۸۸، عالمی حدیث نمبر: ۵۰-۵۱۔

حل لغات: الكبائر، واحد كبيرة، وہ بڑا گناہ جس کی شرعاً باصراحت ممانعت کی گئی ہو، عقوق، عق (ن) عقاً وعقوقاً، اَبَاہ نافرمانی کرنا۔ اليمين، قسم، ج اَيْمَنٌ، وَاَيْمَانٌ، وَاَيَامِنٌ، اَلْغَمُوْسَ، سنگین اور سخت معاملہ، اليمين الغموس، جھوٹی قسم، الزور، باطل گواہی، جھوٹ، جعل سازی۔

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے ساتھ شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی کو قتل کرنا، اور جھوٹی قسم کھانا، بہت بڑے گناہ ہیں'' یہ بخاری شریف کے الفاظ ہیں، اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے اس میں جھوٹی قسم کھانے کے بجائے جھوٹی گواہی دینے کے الفاظ ہیں۔

تشریح: عمرو: میں را کے بعد واو لکھا جاتا ہے تا کہ عمر سے ممتاز ہو جائے۔

قولہ الکبائر الاشراک باللہ الخ: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا سب سے بڑا گناہ ہے۔

شرک کی دو قسمیں ہیں۔

(۱)...... ایک شرک اکبر وہ اللہ کی ذات وصفات وعبادت میں شریک کرنا۔ یہ بغیر توبہ معاف نہیں ہوگا۔ بلکہ تجدید ایمان کی ضرورت ہوگی۔

(۲)...... دوسری قسم شرک اصغر، شرک خفی جیسے عبادت میں ریاء کرنا یا شرک فی التسمیہ وغیرہ۔ یہ بلا توبہ نیک اعمال سے معاف ہو جاتا ہے۔ اب حدیث ہذا میں بحث ہوئی کہ اس شرک سے کفر باللہ مراد ہے یا شرک ہی مراد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہاں شرک سے کفر باللہ مراد ہے۔ کیونکہ اس کو اکبر الکبائر کہا گیا۔ اور مطلق شرک کفر سے اکبر نہیں ہے مگر اہل عرب میں شرک کے بکثرت موجود ہونے کی بناء پر خاص کر کے اس کو ذکر کیا گیا۔ اور بعض کے نزدیک شرک سے مطلق شرک ہی مراد ہے۔ الراجح هو الاول. (مرقاۃ)

عقوق الوالدین: والدین کی نافرمانی کرنا۔

عق کے معنی قطع کرنا یعنی والدین کے حقوق کو قطع کرنا بڑا گناہ ہے۔

والدین کی نافرمانی ان کے ایسے حکم کی مخالفت کر کے جس سے معصیت اور اللہ کی نافرمانی لازم نہ آتی ہو اور ان ہی دونوں کے درجہ میں ہیں اجداد اور جدات۔ (مرقاۃ:۱۲۲/۱، باب الکبائر)

چونکہ اللہ تعالیٰ کو جیسے ایجاد میں دخل ہے اسی طرح والدین کو بھی ایجاد بندہ میں دخل ہے اگر چہ دونوں میں فرق ہے کہ اللہ تعالیٰ سبب حقیقی ہے اور والدین سبب ظاہری ہیں تو سببیت میں اشتراک کی بنا پر اشراک باللہ کے بعد ہی کبائر میں عقوق الوالدین کو دوسرے مرتبہ میں رکھا گیا۔ اسی لئے قرآن وحدیث میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ذکر کیا گیا وہاں ساتھ

ساتھ اطاعت والدین کا بھی ذکر کیا گیا۔ جیسے "واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا وبالوالدین احسانا. وان اشکر لی ولوالدیک." وغیرھا. (مرقاۃ)

وقتل النفس الخ: اور قتل نفس یعنی مومن کا ناحق قتل کرنا بھی گناہ کبیرہ ہے۔

قولہ والیمین الغموس الخ: اور یمین غموس یہ بھی گناہ کبیرہ ہے۔

غمس کہتے ہیں مکھی کو غوطہ دینے کو۔

کیونکہ جب وہ برتن میں گرتی ہے تو پہلے اپنے زہریلے پر کو ڈبوتی ہے اس لئے تم اس کے دوسرے پر کو بھی ڈبو دو تاکہ زہر ختم ہو جائے۔

اقسام یمین

یمین کی تین قسمیں ہیں

(۱) یمین غموس (۲) یمین لغو (۳) یمین منعقدہ

یمین غموس: [یعنی جھوٹی قسم] ماضی میں جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانا یمین غموس کہلاتا ہے۔ اس پر گناہ ہوگا کفارہ نہیں۔

یمین لغو: بغیر ارادہ کے جھوٹی قسم کھانا اس پر نہ کوئی گناہ ہے اور نہ کفارہ۔

یمین منعقدہ: مستقبل میں کسی امر پر قسم کھانا۔ اس کو توڑ دینے سے کفارہ لازم ہو جاتا ہے۔

یمین غموس: وہ جھوٹی قسم جس پر کسی کا نفع نقصان مرتب ہو۔

مثلاً کوئی شخص قسم کھائے کہ خدا کی قسم فلاں کے پانچسو روپئے ادا کر دئے حالانکہ ادا نہیں کئے تو یہ یمین غموس۔ [جھوٹی قسم] ہے۔ یہ بھی گناہ کبیرہ ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں "یمین غموس" کے بجائے "شہادت

زور“ [جھوٹی گواہی] ہے۔ چونکہ جھوٹی گواہی کے ذریعہ کسی کی حق تلفی ہوتی ہے اس لئے یہ بھی گناہ کبیرہ ہے۔

سات ہلاک کردینے والے گناہ

﴿٤٧﴾ وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ قَالُو يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَمَا هُنَّ؟ قَالَ الشِّرْكُ بِاللّٰهِ وَالسِّحْرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِی حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَكْلُ الرِّبَا وَاَكْلُ مَالِ الْيَتِيْمِ والتَّوَلِّی يَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغٰفِلٰتِ۔ (متفق علیه)

حواله: بخاری شریف: ٣٨٨/١، باب قوله تعالیٰ "ان الذين يأكلون ظلما الخ، كتاب الوصايا“ حديث نمبر: ٢٧٦٦، مسلم شریف: ٦٤/١، باب بيان الكبائر واكبرها، كتاب الايمان، رقم الحديث: ٨٩، عالمی حدیث نمبر: ٥٢۔

حل لغات: الزحْفُ، لشکر جرار، ج زُحُوف، پیش قدمی، قَذَفَ (ض) قَذفاً، المحصنة پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت لگانا۔ المُحْصَنَاتُ واحد مُحْصَنَة، پاک دامن عورت، اَحْصَنَ الرَّجُلُ، شادی شدہ ہونا۔ تولی فلانٌ هارباً، پیٹھ پھیر کر بھاگنا۔

ترجمه: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ ”سات ہلاک کردینے والی چیزوں سے بچو“ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے دریافت کیا اے اللہ کے رسول! وہ سات چیزیں کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (١) اللہ کے ساتھ شریک بنانا، (٢) جادو کرنا، (٣) جس جان کو قتل کرنے

سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا اس کو ناحق قتل کرنا، (۴) سود کھانا، (۵) یتیم کا مال کھانا، (۶) جہاد کے دن دشمن کو پشت دکھانا، (۷) پاک دامن، ایمان والی، بے خبر عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔

تشریح: حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات گناہوں سے بچو جو ہلاک کردینے والے ہیں۔ روح کو برباد کردیتے ہیں، آخرت کو برباد کردیتے ہیں۔

روح کو برباد کرنا آخرت کو برباد کردیتا ہے۔ اور آخرت کو برباد کرنا روح کو برباد کردیتا ہے۔

اجتنبوا السبع الموبقات: یہ اجمال ہے تاکہ طالب علموں کا شوق بڑھے۔ اور شوق کے بعد جب کوئی چیز بیان کی جاتی ہے وہ اوقع فی النفس ہوتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجمال سے متوجہ کیا۔ چنانچہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے متوجہ ہوکر ذوق وشوق سے دریافت کیا۔

یارسول اللہ! وہ سات چیزیں کیا ہیں؟

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(۱) الشرک باللّٰہ: [اللہ کے ساتھ شریک کرنا] سب سے بڑا گناہ ہے۔ ہلاک کرڈالنے والا ہے۔ جو دنیا میں بھی مہلک ہے۔ آخرت میں تو ہے ہی مہلک۔

فائدہ: "**الشرک باللہ** یہ زیادہ بلیغ ہے "**لاتشرکوا**" سے۔ جیسے "**ولا تقربو الزنا ولا تقربا هذه الشجرة**" اس لئے کہ کسی شئی یا فعل کے قریب جانے سے منع کرنا اس فعل کے ارتکاب سے منع کرنے سے زیادہ بلیغ ہے۔" (شرح الطیبی: ۱/۱۸۷، باب الکبائر)

اگرچہ کچھ دنوں کے لئے لالہ جی بنے ٹھنے معلوم ہوتے ہیں مگر مرنے کے فوراً بعد ہی گھٹنے توڑ دیتے ہیں۔ اور اس کے خزانوں پر قبضہ کرلیا جاتا ہے۔ اور مرنے سے پہلے ہی اس کو

زمین پر ڈال دیا جاتا ہے۔

تا کہ معلوم ہو جائے کہ یہ ہے تیری حقیقت۔"منها خلقنكم الخ"

برخلاف مومن کے کہ جب تک آخری سانس باقی رہتا ہے اس وقت تک سب کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح شفا ہو جائے۔اس کے آرام رسانی کا پورا پورا خیال کیا جاتا ہے۔

اور آخرت میں بھی مشرک کے واسطے بڑے بڑے عذابات ہیں۔

(۲) و السحر : اور دوسرے ہلاک کر ڈالنے والا گناہ جادو ہے۔

یہ بھی بڑا ہی مہلک ہے جس پر جادو کیا ہے وہ تو ایسا ہے جیسا کہ سانپ نے کاٹ لیا اور وہ شہید ہو گیا۔

مگر جادو کرنے والا تو ہلاک ہی ہو جاتا ہے۔اس کی روح ہلاک ہو جاتی ہے۔

سحر کی تعریف: یہ ہے کہ اسباب خفیہ کے ذریعہ ایسے امور کو اپنے قابو میں لے آنا جو خارق للعادت ہوں اور اس کی نسبت خدا کی ذات یا صفات کی طرف نہ کی جائے اور اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔

جادو ایک حقیقت ہے عام علماء کے نزدیک برخلاف معتزلہ اور ابو جعفر استرآبادی وغیرہ کے نزدیک اس کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ یہ ایک خیالی امر ہے۔

جادو کا حکم

احناف کے یہاں اس کا کرنا فسق ہے اور اس کا سیکھنا حرام ہے کفر نہیں ہے مگر جب وہ عبادت مخلوق یا اس کی ایسی تعظیم پر مشتمل ہو جو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے تو اس کا کرنا اور سیکھنا کفر ہو جاتا ہے۔(مرقاۃ:۱/۱۲۳)

سحر، معجزہ، کرامت میں فرق

اب ظاہراً سحر ومعجزہ وکرامت میں خارق للعادت ہونے میں اشتراک ہے ان میں مابہ الامتیاز کیا ہے۔تو چند اعتبار سے ان میں فرق بیان کیا گیا۔

(۱)......سحر میں اسباب خفیہ کی ضرورت پڑتی ہے معجزہ وکرامت میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اتفاقاً ظاہر ہوجاتی ہے۔

(۲)......سحر کے لئے خاص زمان ومکان کی ضرورت ہوتی ہے، معجزہ وکرامت کے لئے کسی کی ضرورت نہیں۔جہاں چاہے جس وقت چاہے ظاہر ہوجاتی ہے۔

(۳)......سحر میں تعلیم وتعلم کی ضرورت ہوتی ہے ان دونوں میں اس کی ضرورت نہیں۔

(۴)......سحر کا مقابلہ ومعارضہ ممکن ہے، معجزہ وکرامت کا مقابلہ ممکن نہیں۔

اور معجزہ وکرامت میں فرق یہ ہے کہ معجزہ میں تحدی کی دعوت ہوتی ہے۔کرامت میں یہ نہیں ہوتی۔

پھر تینوں میں عام ایک فرق یہ ہے کہ جس شخص سے خارق للعادت امر ظاہر ہووہ اگر متبع شریعت نہ ہوتو یہ سحر واستدراج ہے اور اگر وہ شخص متبع شریعت ہے اور ساتھ ہی نبوت کا دعویٰ ہوتو وہ امر معجزہ ہے۔اگر نبوت کا دعویٰ نہ ہوتو کرامت ہے۔(مرقاۃ)

(۳)**وقتل النفس**: [یعنی کسی نفس محترم کا قتل کرنا] یہ بھی مہلک ہے۔

انسان ایک درجہ میں عالم اصغر ہے۔اللہ کی قدرت کا عظیم شاہکار ہے انسان کا ایک ایک عضو ایک ایک چیز زمین وآسمان کے خزانوں سے زیادہ قیمتی ہے، زمین وآسمان چاند سورج اور ہواؤں کی گردش کے بعد اور اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے پانی سے سیرابی کے بعد یہ غذائیں تیار ہوتی ہیں، ان غذاؤں سے خون تیار ہوتا ہے تو انسان میں خون کتنا قیمتی ہوا۔پس

انسان کو ناحق قتل کرنا اللہ تعالیٰ کی سخت ناراضگی کا ذریعہ ہے، کمہار کے کسی برتن کو کوئی توڑ دیتا ہے تو کمہار کو کتنی ناراضگی ہوتی ہے، چمن میں سے کوئی پھول توڑلیتا ہے تو چمن کے مالی کو کتنی ناراضگی ہوتی ہے۔ پس اسی طرح کسی انسان کا ناحق قتل بھی اللہ تعالیٰ کی سخت ناراضگی کا ذریعہ اور سخت ترین گناہ ہے۔

الا بالحق: ہاں اگر اللہ حکم دے تو گردن اڑادو۔ چونکہ مالک کا حکم ہے۔

جیسے اس کا قتل کردینا قصاص میں شرعاً اور ایمان سے پھر جانے کی وجہ سے یا اس کا زنا کرلینا شادی شدہ ہوتے ہوئے وغیرہ۔ (مرقاۃ: ۱۲۳/۱، باب الکبائر)

(۴) و اکل الربو ا: اور ربا کا کھانا، کہتے ہیں کہ یہ ربوی سے مشتق ہے۔

ایک کے دو لے لینا یہ تو ٹھیک ہے۔ ربوا کے مادے میں زیادتی کے معنی رکھے ہوئے ہیں۔ اور خالص زیادتی سے منع کیا ہے۔ "زيادتي خالي عن العوض" کو "سود" اور "ربوا" کہا جاتا ہے۔ مثلاً ہم نے کسی کو سو روپے دئے اور ایک مہینہ بعد سو روپے کے بجائے ایک سو دس روپے لیئے ہیں، تو یہ سود کہلاتا ہے۔ یہ ربوا حرام ہے، اور مہلک ہے۔ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ حرام کھاتے ہیں۔ اور قیامت میں یا مرنے کے وقت وہ باؤلے ہوجاتے ہیں۔ چاہے مرنے سے پانچ منٹ پہلے ہی سہی مگر وہ کتے کی طرح سے باؤلے ضرور ہوجاتے ہیں۔ سود لینا اور سود دینا دونوں حرام ہیں۔

اگر بغیر سود کے کوئی چیز نہ ملے اور ہلاکت کا اندیشہ ہو تو مانگ کر کھالو۔ یا مردار کھالو اس میں اتنا گناہ نہیں جتنا سود میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سود کے کھانے والے سے جنگ کا اعلان کیا ہے۔ اور کون شخص سورما ہے جو اللہ کی جنگ کا مقابلہ کرے۔

سود کھانے والے پر اللہ نے جنگ کا اعلان کیا ہے اور ایک اس پر جو اللہ کے ولی اور

اللہ کے دوست کو ستائے۔

مقاصد عظیم میں سے چونکہ کھانا ہی اصل ہے اس لئے حدیث شریف میں اسی کو ذکر کیا ورنہ تو پہننا اور دوسری چیزیں استعمال کرنا سبھی مراد ہیں۔

(۵) و اکل مال الیتیم: اور جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں۔

یتیم: وہ نابالغ چھوٹا بچہ جس کے والد نہ ہوں۔

اور کھانے سے مراد استعمال کی تمام صورتیں ہیں۔

"**ان الذین یاکلون اموال الیتامیٰ ظلماً انما یأکلون فی بطونهم نارا وسیصلون سعیراً**" [یقین رکھو کہ جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں، اور انہیں جلد ہی ایک دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہونا ہوگا۔] (آسان ترجمہ)

(٦) و التولی یوم الزحف: دم دبا کر بھاگنا۔ پیٹھ پھیر کر بھاگنا۔

زحف جمع ہے زاحف کی۔

"زاحف" کہتے ہیں سرین کے بل چلنے والے کو، جیسے بچے چلا کرتے ہیں۔ یہ شرم کی بات ہے نا۔ اسی وجہ سے اللہ نے اس کو غیر شعوری کے وقت رکھا جب بچہ کو شعور و سمجھ نہیں ہوتی۔ چونکہ سرین کے بل جب ہی چلتے ہیں جب بھیڑ زیادہ ہو۔

گھمسان کی لڑائی کے وقت بھاگ جانا۔ پس لڑائی یعنی جہاد سے بھاگ جانا یہ بڑا گناہ ہے، کیونکہ یہ بزدلی کی علامت ہے اور اس میں قوم کی تباہی ہے۔[1]

---

[1] **فائدہ**: کفار کے مقابلہ سے بھاگنا جب ہر مسلمان کے مقابلہ میں دو کافر ہوں تو گناہ کبیرہ ہے۔ اور اگر دو کافروں سے زیادہ ہر مسلمان کے مقابلہ میں ہوں تو بھاگنا جائز ہے، گناہ نہیں پھر بھی سخت شرم کی بات ہے۔ (شرح الطیبی: ۱۸۷/۱، باب الکبائر)

(۷) و قذف المحصنات المومنات الغافلات الخ:[۱]

"قذف" کے معنی ڈھیلا پھینکنا، کسی پاکدامن عورت کو جو بالکل بے خبر ہو کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس کو تہمت لگانا سخت گناہ ہے۔

یعنی تہمت لگانا مطلقاً سخت گناہ ہے مگر پاکدامن بھولی بھالی عورت کو تہمت لگانا بہت ہی سخت خطرناک گناہ ہے۔ اور کسی انسان کی عزت وآبرو کا ختم ہو جانا قتل کے قریب قریب ہی ہے، اس لئے سخت ترین گناہ ہے۔

الغافلات: یہ کنایہ ہے بریات سے اس لئے کہ بری غافل اور بے خبر ہوتا ہے اس زنا سے جس کی اس کے اوپر تہمت لگائی گئی ہے۔

المومنات: یہ احتراز ہے کافرات پر تہمت لگانے سے چونکہ ان پر تہمت لگانا گناہ کبیرہ نہیں ہے، پس اگر وہ کافرہ ذمیہ ہو تو اس پر تہمت زنا لگانا گناہ صغیرہ ہے، جو موجب حد نہیں ہے۔ (شرح الطیبی: ۱۸۷/۱، باب الکبائر)

یہ سات گناہ تھے ان سب کو ذکر کر دیا۔

نور ایمان کے زوال کے اسباب

﴿۴۸﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزْنِي الزَّانِي حِيْنَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَنْتَهِبُ نُهْبَةً يَرْفَعُ النَّاسُ إِلَيْهِ فِيْهَا

[۱] المحصنات یہ محصنہ کی جمع ہے صاد کے فتحہ کے ساتھ صیغہ اسم مفعول ہے یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے زنا سے محفوظ رکھا ہے اور صاد کے کسرہ کے ساتھ اسم فاعل یعنی جس نے اپنی شرمگاہ کو زنا سے محفوظ رکھا۔

اَبْصَارَهُمْ حِيْنَ يَنْتَهِبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَايَغُلُّ اَحَدُكُمْ حِيْنَ يَغُلُّ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاِيَّاكُمْ (متفق عليه) وَفِي رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَلَا يَقْتُلُ حِيْنَ يَقْتُلُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ قَالَ عِكْرَمَةُ قُلْتُ لِاِبْنِ عَبَّاسٍ كَيْفَ يُنْزَعُ الْاِيْمَانُ مِنْهُ، قَالَ هٰكَذَا وَشَبَّكَ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ ثُمَّ اَخْرَجَهَا فَاِنْ تَابَ عَادَ اِلَيْهِ هٰكَذَا وَشَبَّكَ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ، وَقَالَ اَبُوعَبْدِاللّٰهِ لَايَكُوْنُ هٰذَا مُؤْمِناً تَامّاً، وَلَا يَكُوْنُ لَهٗ نُوْرُ الْاِيْمَانِ۔ (هذا لفظ البخاری)

حواله: بخاری شریف:۳۳۶/۱،باب النهب بغير اذن صاحبه، كتاب المظالم، حدیث نمبر:۲۴۷۵،مسلم شریف:۵۵/۱،باب بيان نقصان الايمان، كتاب الايمان، رقم الحديث:۵۷، عالمی حدیث نمبر:۵۴۔

حل لغات: الخمر انگوروغیرہ کارس،شراب،لفظ مؤنث ہے،کبھی مذکر بھی مستعمل ہوجاتا ہے۔اِنْتَهَبَ الشيءَ لے لینا،مجرد میں نَهَبَ الشيء (ف) لوٹنا زبردستی لے لینا غَلَّ (ن) غلولاً خیانت کرنا،چپکے سے کوئی چیز اپنے سامان میں ملالینا نَزَعَ (ض) نَزْعاً من جيبه ہاتھ گریبان سے نکال لینا ،یہاں مجہول ہے معنی نکلنا،شَبَّكَ الشيءَ تَشْبِيْكاً تفعیل سے بغیرہ جوڑنا،ملانا۔

ترجمه: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ ”زانی جب زنا کرتا ہے اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا، چوری کرنے والا جب چوری کرتا ہے اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا،شراب پینے والا جب شراب پیتا ہے، اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا،اورلوٹ مار کرنے والا جب لوٹ مار کرتا ہے،اورلوگ اس کو دیکھ رہے ہوتے ہیں اس وقت وہ مؤمن نہیں ہوتا،اورتم میں سے جب کوئی خیانت کرتا ہے، اس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا،لہذا ان گناہوں سے دوررہو،(بخاری ومسلم) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ قاتل جس وقت قتل کرتا ہے اس کا ایمان باقی نہیں رہتا۔عکرمہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا "مومن سے ایمان کیسے نکل جاتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا اس طرح اور پھر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کر دیں اس کے بعد انہوں نے انگلیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر لیا، اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ اگر مؤمن توبہ کر لیتا ہے تو ایمان اس طرح واپس آ جاتا ہے، اس کے بعد انہوں نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کر لیا، ابو عبداللہ (امام بخاری) نے کہا ہے کہ "وہ کامل مؤمن نہیں رہتا ہے اور اس سے نور ایمان نکل جاتا ہے"۔ (بخاری)

تشریح: لا ینتھب: ڈاکہ ڈالنا۔

فایاکم ایاکم: [پس تم اپنے کو بچاؤ اپنے کو بچاؤ]

اس حدیث میں زنا چوری شرب خمر ڈکیتی خیانت وغیرہ کے بارے میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مومن ان گناہوں کو کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا۔

کیونکہ کوئی مومن ان کو نہیں کر سکتا۔ اگر کرتا ہے تو وہ مومن ہی نہیں۔

اشکال مع جواب

اس سے معتزلہ اور خوارج کے مذہب کی تائید ہوتی ہے۔

کیونکہ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ان گناہوں کے کرنے سے مؤمن کافر ہو جاتا ہے۔ مومن نہیں رہتا۔ ان گناہوں کے کرنے سے انسان کفر کی حدوں میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس حدیث شریف کا ظاہر تو یہی ہے مگر حقیقتاً یہ اہل سنت والجماعت کے خلاف نہیں ہے بلکہ اہل سنت والجماعت کے مذہب کے موافق ہے۔

حدیث پاک کی چند توجیہات

(۱)......پہلی توجیہ امام بخاریؒ نے کی ہے کہ ان گناہوں کے کرنے سے انسان مومن کامل

نہیں رہتا، آپ نے کمال کی نفی کی ہے نفس ایمان کی نہیں کہ ان گناہوں کے کرنے سے کمالِ ایمان ختم ہو جاتا ہے۔

اور کمال کے مفقود ہونے سے ہم روزمرہ جنس کی نفی کرتے رہتے ہیں۔

جیسے یوں کہتے ہیں کہ یہاں کوئی طالب علم نہیں ہے۔تو کیا واقعی کوئی طالب علم نہیں ہے سب چلے گئے؟ نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ کامل طالب علم نہیں ہیں، جیسے ہونے چاہئے تھے ویسے نہیں ہیں۔

(۲)......شیخ نجم الدین کبریٰؒ نے کہا "وھو مؤمن" سے مراد یہ ہے کہ بوقت زنا وہ حاضر القلب نہیں، اگر ایمان حاضر القلب ہوتا تو وہ زنا ہی نہیں کر سکتا تھا۔

(۳)......حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ مراد یہ ہے کہ جب قلب پر بہیمیت سبعیت کا عظیم پردہ پڑ کر ملکیت کالعدم ہو جاتی ہے اور اس قسم کے افعال قبیح سرزد ہوتے ہیں تو اس وقت ملکیت کالعدم ہونے کی وجہ سے ایمان زائل کے درجہ میں ہو جاتا ہے نہ کہ حقیقۃً زائل ہوتا ہے۔(تنظیم الاشتات:۸۷/۱)

(۴)......یا مراد یہ ہے کہ جب آدمی زنا کرتا ہے تو ایمان اس سے نکل کر اس کے سر کے اوپر سائے کی طرح رک جاتا ہے اور جب وہ اس سے علیحدہ ہو جاتا ہے تو ایمان اس کے اندر لوٹ آتا ہے۔حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی منقول ہے۔

(۵)......یا مومن سے مراد مستحی ہے یعنی اللہ سے حیا کرنے والا اس لئے کہ حیا ایمان کا ایک شعبہ ہے، اگر زانی اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتا اور اعتقاد رکھتا کہ وہ اس کی اس حالت کو دیکھ رہا ہے تو وہ اس فعلِ شنیع کا ارتکاب ہی نہیں کرتا اور اس لئے کہ جب ایمان کا ایک بڑا شعبہ جو کہ حیاء ہے ختم ہو گیا تو ایمان کا کمال ختم ہو گیا چونکہ جز کے ختم ہونے سے کل ختم ہو جاتا ہے اور اس کی نفی ہو جاتی ہے، اس کی نظیر "لا ایمان لمن لا امانۃ

له ولا دين لمن لا عهد له" ہے۔(مرقاۃ:۱۲۴/۱،باب الکبائر)

اوراس کامصداق حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے"الاستحیاء من الله حق الحياء ان يحفظ الرأس وما وعىٰ والبطن وما حوىٰ"

وما وعىٰ: وہ زبان اور منھ اور کان اور آنکھ ہے۔

اور وما حوىٰ: وہ پیٹ اور ناف اور جو چیز اس کے اردگرد ہے، یعنی دل شرمگاہ ہاتھ پیر اگر یہ شخص اللہ سے حیاء کرتا جیسا کہ حیا کا حق ہے تو یقیناً یہ محفوظ رکھتا ہے۔ شرمگاہ کو زنا سے اور آنکھ کو محارم کی جانب دیکھنے سے اور ہاتھ کو چوری اور غصب سے اور پیر کو زنا کے اڈے کی طرف چلنے سے، اور لوٹنے اور ڈاکہ زنی سے مسلمانوں کے مالوں کو اور منھ کو شراب پینے اور حرام مال کے کھانے سے اور دل کو خیانت اور کینہ اور دھوکہ سے جو اکسانیوالے ہیں آدمی کے قتل اور خیانت پر۔(شرح الطیبی: ۲۰۲/۱، باب الکبائر)

فائدہ: مشہور قاعدہ مسلمہ ہے ضدین کاملین کا اجتماع محال ہے بخلاف ضدین ناقصین کے، ایمان وہ کامل ہے جو متلبس بالمعاصی نہ ہو اور زنا کامل وہ ہے جو حلال سمجھ کر کیا ہو ان دونوں کا اجتماع محال ہے لیکن ایمان ناقص جو مع المعاصی ہو اور زناء ناقص جو حلال سمجھ کر نہ ہو یہ دونوں جمع ہو سکتے ہیں لہذا حدیث میں گناہ کبیرہ کے ارتکاب کی بنا پر مطلق ایمان کا سلب مراد نہیں بلکہ کمال ایمان کا ہی سلب مراد ہے۔

(٦)......ایک توجیہ یہ ہے کہ ان گناہوں سے ایمان کا نور جاتا رہتا ہے۔ ایمان تو ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کی روشنی ختم ہو جاتی ہے جیسا کہ لالٹین بجھ جاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ لالٹین نہیں رہی۔ نہیں لالٹین تو موجود ہے مگر روشنی نہیں رہی۔

ذرا سی روشنی دکھاؤ دیا سلائی لگاؤ تو فوراً جل جاتی ہے۔ اور روشنی ہو جاتی ہے۔

اسی طرح یہ ذرا نیکی دکھائے تو ایمان منور ہو جائیگا۔

(۷)......ایک توجیہ یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کرنے سے ایمان کی بشاشت ایمان کی لذت اور مزہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ کوئی ضروری تھوڑا ہی ہے کہ جو لذت نہ رکھتا ہو تو اس کے پاس وہ شئی بھی نہ ہو۔

ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک انسان کے پاس حلوہ تو موجود ہو۔ مگر وہ اس کی لذت سے نا آشنا رہے جیسے شیخ سنوسی کو غلام بنایا گیا تھا، اور ان کو ایک باغ میں رکھا گیا تھا۔ ایک بار مالک نے انار منگایا، انہوں نے ترش انار لا کر دیا مالک نے کہا کہ تمہیں اب تک یہاں رہکر اتنا بھی پتہ نہیں چلا کہ کونسا عمدہ اور کونسا کھٹا ہے۔

انہوں نے جواب دیا کہ مجھ کو حفاظت کے لئے ملازم رکھا ہے کھانے کے لئے نہیں میں نے آج تک ان کو چکھا ہی نہیں، پس وہاں پھل موجود ہیں مگر وہ لذت سے نا آشنا ہیں۔

اسی طرح یہاں بھی لذت کی نفی کی گئی ہے کہ جب ایمان کی لذت نہیں، جب ہی تو وہ گناہ کرتا ہے۔ اور جب ایمان کی لذت ہوتی ہے تو اس وقت کوئی گناہ نہیں کرتا، مسور کی دال اس وقت مزیدار لگتی ہے جب گوشت موجود نہ ہو۔

جیسے کہا جاتا ہے کہ تمہارے گھر میں لالٹین موجود نہیں ہے۔ حالانکہ لالٹین موجود ہے مگر چونکہ وہ روشن نہیں اس وجہ سے اس کی نفی کردی گئی ہے۔ اسی طرح یہاں ایمان تو موجود ہے مگر روشنی نہیں اس میں نور نہیں اس وجہ سے اس کی نفی کردی گئی۔

(۸)...... یہ صرف تہدید و وعید کے لئے ہیں۔ تاکہ مسلمان ان افعال سے پرہیز کریں۔

(۹)......حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مؤمن جو ایک اچھا لقب تھا وہ باقی نہیں رہتا بلکہ اس کو دوسرے برے القاب سے یاد کیا جائے گا۔ مثلاً اس کو سارق، زانی، شراب نوش کہا جائیگا۔

(١٠)......شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ اس ایمان سے ایمان بالمشاہدہ مراد ہے اور وھو مؤمن کا مطلب موقن بالعذاب ہے کیونکہ جس کو پورا یقین ہو کہ مجھے اللہ دیکھ رہا ہے اور عذاب کو آنکھ سے خود دیکھ رہا ہو تو وہ ہرگز ایسا کام نہیں کرتا۔

(١١)......علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں نفی بمعنی نہی کے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان کی حالت میں ایسا کام نہ کرو۔ چنانچہ بعض روایت میں نہی کے صیغے سے آیا ہے۔

(١٢)......علامہ قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ مؤمن سے مامون من العذاب مراد ہے یعنی ایسی حالت میں وہ عذاب سے مامون نہیں ہوگا۔

(١٣)......علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ مؤمن مطیع کے معنی مراد ہیں کہ اللہ کے فرمانبردار ہوکے ایسا کام نہیں کرسکتا۔ اور بندہ جب یہ کام کرتا ہے تو اس وقت مطیع وفرماں بردار نہیں رہتا۔

(١٤)...... یہ حکم مآل اور انجام کے اعتبار سے ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر یہ حرکتیں جاری رہیں تو ایمان کے نکلنے اور کفر آ جانے کا خطرہ ہے، گناہوں میں یہ تاثیر ہے کہ اس سے مزید گناہ کرنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، اگر کبائر سے توبہ نہ کی جائے تو کفر کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

(١٥)...... یہ وعید ان گناہگاروں کے لئے ہے جو ان گناہوں کو حلال سمجھ کر کریں، اور گناہ کو حلال سمجھنے سے واقعۃً انسان کافر ہو جاتا ہے۔

ان توجیہات اور تطبیق کے بعد اس حدیث سے معتزلہ اور خوارج کا مذہب ثابت نہیں ہوتا۔

لہٰذا حدیث مذکور ''لایزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی زنا کار زنا نہیں کرتا دراں حالیکہ وہ مؤمن ہو۔

یعنی مومن ہونو رِ ایمانی کے ساتھ اسی طرح دوسرے گناہوں کا بھی یہی مطلب ہے۔

چونکہ اس سے پہلے آپ نے حدیث پڑھی ہے کہ "من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنة و ان زنیٰ و ان سرق" تو اس حدیث اور اس حدیث میں اسی طرح تطبیق ہوگئی ہے۔

اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے استاذ صاحب سے پوچھا کہ ایمان کس طرح نکل جاتا ہے تو آپ نے ایمان کے بالکلیہ نکل جانے کی نفی نہیں کی ہے بلکہ کمالِ ایمان نورِ ایمان لذت ایمان کے نکل جانے کی مثال دی ہے۔ کہ ایمان کی لذت اس طرح نکل جاتی ہے اور جب وہ توبہ کرلیتا ہے تو پھر اس طرح لوٹ آتی ہے۔

توبہ: نام ہے تین چیزوں کے مجموعہ کا۔

(۱)...... کئے ہوئے فعل پر ندامت ہو۔

(۲)...... آئندہ نہ کرنیکا عزم مصمم ہو۔

(۳)...... اور فی الحال اس کا مرتکب نہ ہو۔

یہ نہیں کہ زبان سے توبہ توبہ توبہ اور منھ سے شراب کی بوتل لگی ہوئی۔ اس کو توبہ نہیں کہا جائیگا۔ یہ تو ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی صبح سے شام تک لڈو لڈو لڈو پکارے مگر پیٹ میں تو کچھ بھی نہیں پہنچے گا، جب تک کھائیں گے نہیں۔ ایسے ہی صرف زبان سے آدمی توبہ توبہ کرتا ہے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

لا ینتھب نھبة[1]: کوئی ڈاکو ڈاکہ نہیں ڈالتا ایسا ڈاکہ جس میں لوگوں کی نگاہیں اس

[1] نھب ماضی اور مضارع دونوں میں عین کلمہ کے فتحہ کے ساتھ اس کے معنی ہیں کسی کو لوٹنا اور اس کے مال کو زبردستی لینا۔ النھبة نون کے فتحہ کے ساتھ مصدر ہے اور ضمہ کے ساتھ وہ مال جس کو لشکر لوٹ کر لے جائے۔

ابصارھم مفعول ہے۔ یعنی آدمی کا قوم کے مال کو لینا قہر سے اور ظلم سے اور وہ اس کی طرف دیکھ رہے ہوں اور مجبور ہوکر رو رہے ہوں اور اس ظلم کے دفع کرنے پر قادر نہ ہوں تو یہ ظلم عظیم ہے۔ جو مؤمن کے حال کے مناسب نہیں ہے۔ (شرح الطیبی: ۲۰۳/۱، باب الکبائر)

کی طرف اٹھی ہوں۔

یرفع الناس الیہ فیہا ابصارھم: کی قید اتفاقی ہے اس سے ڈاکہ کی برائی کو بتانا مقصود ہے ورنہ مطلقاً ڈاکہ مراد ہے چاہے اس میں نظریں اٹھی ہوں یا نہ اٹھی ہوں۔

لا یغل[1]: مالِ غنیمت میں خیانت کرنا۔ مراد یہاں مطلقاً خیانت کرنا ہے۔

پس ان گناہوں سے ایمان نہیں رہتا یعنی اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے اگر اس کی احتیاط اور حفاظت نہ کی گئی تو وہ گر ہی جائیگا۔

جوشئ آنے کے قریب ہوتی ہے اس کو آنے سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی کا مکان گرنے کے قریب ہو رہا ہو تو اس کو کہد یا جاتا ہے کہ بھائی تمہارا مکان گر ہی گیا یعنی گرنے کے بالکل قریب ہے اگر اس کی حفاظت نہ کی گئی تو یہ گر ہی جائیگا۔

نماز میں پانچ منٹ باقی ہیں مگر کہد یتے ہیں کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ امتحان میں حالانکہ ابھی سترہ دن باقی ہیں مگر کہد یا جاتا ہے کہ امتحان آ ہی گیا۔

چنانچہ جب انسان ایک دفعہ گناہ کرتا ہے تو اس کو کچھ ملال ہوتا ہے۔ دوسری مرتبہ کچھ کم اور تیسری مرتبہ اس سے بھی کم یہاں تک رفتہ رفتہ وہ بالکل ختم ہو جاتا ہے اور پھر گناہ میں لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔ جب یہ حالت ہو جائے تو سمجھ لو کہ اب ایمان ختم ہو گیا۔ اور کفر آ گیا۔

منافق کی پہچان

﴿۴۹﴾ وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ زَادَ مُسْلِمٌ اِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ ثُمَّ اتَّفَقَا اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا ائْتُمِنَ خَانَ۔ (متفق علیہ)

---

[1] غَلَّ غین کے فتحہ کے ساتھ ماضی میں اور غین کے ضمہ کے ساتھ مضارع میں اس کے معنی ہیں مالِ غنیمت سے کوئی چیز چرانا یا خیانت کرنا۔ (شرح الطیبی: ۲۰۳/۱، باب الکبائر)

حوالہ: بخاری شریف ص ۱۰/۱، علامۃ المنافق، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۳۳، مسلم شریف: ۵۶/۱، باب بیان خصال المنافق، کتاب الایمان، رقم الحدیث: ۵۹، عالمی حدیث نمبر: ۵۵۔

حل لغات: زَعَمَ (ن) زَعْماً گمان کرنا، خیال کرنا، اَخْلَفَ وَعدَہ وبوَعْدِہ، (افعال) وعدہ خلافی کرنا، اِئتمن، فلاناً علی الشیءِ (افتعال) امانت میں دینا، امین بنانا، خان الشیءَ (ن) خوناً وخیانۃً خیانت کرنا۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "منافق کی تین علامتیں ہیں" اس کے بعد "مسلم" کی روایت میں یہ اضافہ ہے، "اگر چہ وہ نماز پڑھے اور روزہ رکھے، اور وہ اس بات کا دعویٰ بھی کرے، کہ میں مسلمان ہوں" اس کے بعد "بخاری" و "مسلم" دونوں میں یہ بات ہے کہ "جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے، اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے"۔

تشریح: نفاق ایک وصف قلبی ہے، جو ظاہر نہیں ہوتا، البتہ اسکی علامتیں ہوتی ہیں۔

اسی طرح ایمان بھی مخفی ہے اور اس کو بھی علامتوں سے پہچانا جاتا ہے نفاق کو بھی علامتوں سے پہچانا جاتا ہے۔

غرضیکہ ہر مخفی چیز کو علامات ونشانات سے ہی پہچانا جاتا ہے۔

اشکال مع جوابات

اس قسم کی احادیث پر اعتراض ہوتا ہے کہ یہ علامت تو اس مومن میں بھی پائی جاتی ہے جس کے ایمان اور عدم کفر پر اتفاق ہے؟

علماء نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں۔

جواب (۱)......ابن تیمیہؒ کا قول ہے کہ مریض میں جیسا کہ خصلتِ صحت اور تندرست میں خصلتِ مرض پائی جاتی ہے ایسے ہی مومن میں خصلتِ کفر ونفاق بھی پائی جاسکتی ہیں۔ "**لقوله من كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق**" اور یہ قول صراحت کے ساتھ دلالت کرتا ہے کہ مسلمان میں اشیاء کفر پائی جاسکتی ہیں، لیکن اس کے باوجود مومن ہی باقی رہے گا۔

(۲)...... یہ علاماتِ نفاق حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھیں جس وقت منافقین بھی تھے۔

(۳)......حدیث مذکور سے جو معلوم ہوتا ہے کہ جس میں یہ خصال ثلٰثہ ہوں وہ منافق ہو جائے گا۔ یہ مسلمانوں کو نفاق سے بچانے کیلئے تحذیر وتہدید کے طور پر کہا گیا ہے۔ حقیقۃً منافق نہیں ہوگا۔ جیسا کہ ترک صلوٰۃ سے بچانے کیلئے "**فقد كفر**" بطور وعید شدید کے کہا گیا ہے۔ حقیقۃً کافر ہونا مراد نہیں۔ (تنظیم الاشتات: ۱/۷۹ باب الکبائر)

(۴)......امام نوویؒ نے کہا کہ نفاق سے نفاقِ کفر ہی مراد ہے جو **مخرج عن الاسلام** ہوتا ہے۔ لیکن یہاں جو خصائل ثلٰثہ کی بنا پر منافق کہا اس سے مراد مجازاً منافق ہے۔ یعنی "**كالمنافق في هذه الخصال و متخلق باخلاقهم**" کیونکہ نفاق اظہار **خلاف ما ابطن** کا نام ہے جو خصال ثلٰثہ کے صاحب میں موجود ہیں، لیکن یہ منافق فی الاسلام یعنی **مظهر الاسلام ومبطن الكفر** نہیں ہے۔

(۵)...... یہاں نفاق عملی مراد ہے نفاق اعتقادی مراد نہیں چونکہ نفاق شرعی ہی اعتقادی ہے اور وہ کفر کا چھپانا اور اسلام کو ظاہر کرنا ہے اور عملی معصیت کا چھپانا اور طاعت کا ظاہر کرنا ہے۔ اور عملی کو مراد لینا اولیٰ ہے۔ اور نفاق کا اطلاق عملی پر ایسا ہی ہے جیسا کہ کفر کا اطلاق بعض کبائر پر کر دیا جاتا ہے۔

(۶)...... حرف "اذا" دوام واستمرار پر دلالت کرتا ہے، یہاں بھی "اذا" ہے لہٰذا منافق وہ ہوگا جس کے یہ خصالِ ثلٰثہ دائماً یا مستمراً بطور عادت اور طبیعتِ ثانیہ بن گئے ہوں۔ اور ایسا کوئی فاسد الاعتقاد شخص ہی ہوگا جو کہ **طبع علی قلبہ وختم علی سمعہ وبصرہ** کے مرتبہ کو پہنچ گیا ہو تو اس کو منافق حقیقی کہا جائے گا۔ لیکن جو مومن ان خصال سے مقترن تو ہو لیکن عادی نہیں بلکہ "**ان فعلها مرة ترکها اخریٰ وان اصر فی زمان امتنع عنها زمانا آخر**" اس لئے اس کو منافق نہیں کہا جائے گا۔ (تنظیم الاشتات: ۱/۸۰)

(۷)...... حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ علامت وعلت میں فرق ہے۔ علت پائے جانے سے معلول کا ہونا ضروری ہے لیکن علامت موجود ہونے سے ذوالعلامۃ کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا ایک چیز کی علامت دوسری چیز میں پائی جاتی ہے مگر دوسری چیز پہلی چیز نہیں ہو جاتی۔ بناءبریں یہ چیزیں منافق کی علامت تو ہیں لیکن کسی مسلمان کے اندر پائے جانے سے اس کا منافق ہونا لازم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اصل ایمان ونفاق کا تعلق قلب کے ساتھ ہے۔ (درس مشکوۃ)

نفاق کی تین علامتیں بیان کی ہیں ان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ صرف یہی علامتیں ہیں بلکہ نفاق کی جملہ علامات میں سے یہ تین علامتیں بھی ہیں۔

تین پر اکتفاء کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان تینوں سے ماسوئی پر اطلاع ہوتی ہے چونکہ اصل دیانت تین میں منحصر ہے۔ یعنی قول، فعل، نیت۔ "**اذا حدث کذب**" سے فسادِ قول پر آگاہی ہوئی۔ اور "**اذا أتمن خان**" سے فسادِ فعل پر آگاہی ہوئی۔ اور "**اذا وعد اخلف**" سے فسادِ نیت پر اطلاع ہوئی۔

اور مسلم نے اس حدیث پر اتفاق کیا ہے مگر اس میں یہ زائد کیا ہے **وان صام وصلی وزعم انه مسلم**. کہ چاہے وہ روزے بھی رکھتا ہو نماز بھی پڑھتا ہو اور اپنے کو صاحب

ایمان بھی گمان کرتا ہو۔ مگر پھر بھی وہ منافق ہی ہے۔

نفاق کی تین علامتیں

اذا حدث کذب: جب کلام کرے تو جھوٹ بولے۔

کذب خلافِ واقعہ کی خبر دینا ہے۔ (مرقاۃ: ۱۲۷)

جھوٹ بولنا دل کی خرابی کی علامت ہے۔ اگر کوئی جھوٹ بولے تو سمجھ لو کہ یہ منافق ہے۔

و اذا وعد اخلف: اور جب وعدہ کرے تو خلاف ہی کرے۔

جب کوئی شخص اس کو کہے کہ بھائی ہمیں قرض دیدو گے؟ تو وہ کہے کہ جی ہاں! ضرور دوں گا۔ مگر دل میں یہ ہے کہ نہیں دوں گا۔ تو یہ وعدہ خلافی ہے۔ اس کی عادت ڈالنا اور وعدہ خلافی کرنا یہ بھی منافقت ہے۔ جس طرح ایفائے عہد ایمان کی علامت ہے ایسے ہی وعدہ خلافی نفاق کی علامت ہے۔

خلفِ وعدہ اس وقت مذموم ہے جب بوقت وعدہ ہی ایفاء وعدہ کی نیت نہ ہو جو مکروہ تحریمی ہے۔ اور اگر بوقت وعدہ ایفاء کی نیت ہو پھر کوئی مانع درپیش ہو گیا تو وہ مکروہ نہیں ہے اور نہ اس میں قباحت ہے۔ "**كما في رواية ابي داؤد والترمذي عن زيد بن ارقم مرفوعا انه عليه السلام قال اذا وعد الرجل اخاه ومن نيته ان يفي له فلم يف له ولم يجيء للميعاد فلا اثم عليه**" (تنظیم الاشتات: ۱/۸۰، باب الکبائر)

و اذا اؤتمن خان: اور جب کوئی شخص اس کے پاس امانت رکھ جائے تو اس میں خیانت کرے۔ خیانت کرنا نفاق کی علامت ہے۔ اور اس میں حقوق بھی داخل ہیں۔ جس کے ذمہ جو حقوق ہیں ان کو پورا نہ کرنا بھی خیانت ہی ہے۔ اگر استاذ بغیر مطالعہ کے درس دیتا ہے تو یہ بھی خیانت ہے۔ اسی طرح اگر پیر مرید کو روک ٹوک نہیں کرتا تو یہ بھی خیانت ہے۔

منافق خالص کی پہچان

﴿۵۰﴾ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا، اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔ (متفق علیه)

حواله: بخاری شریف:۱۰/۱،باب علامة النفاق، کتاب الایمان، حدیث نمبر:۳۴،مسلم شریف:۵٦/۱،بـاب بیـان خـصـال الـمـنـافق، کتاب الایمان، رقم الحدیث:۵۸، عالمی حدیث نمبر:۵٦۔

حل لغات: غدر فلاناً، وبه (ض) غدرا وغدراناً کسی کے ساتھ بے وفائی کرنا،عہد شکنی کرنا،خـاصـمـه مـخـاصـمةً وخصاماً جھگڑا کرنا،مجرد میں خَصِمَ (س) خَصَماً جھگڑے میں ماہر ہونا،فجر (ن) فجراً وفجوراً گناہ کرنا،بدکاری کرنا،فلانٌ عن الحق حق سے پھرنا۔

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جس شخص میں چار باتیں ہوں گی، وہ منافق کامل ہے، اور جس میں ان میں سے ایک عادت ہے تو اس میں نفاق کی ایک عادت ہے، یہاں تک کہ اس کو ترک کردے، جب امانت رکھی جائے تو خیانت کرے، جب گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، جب معاہدہ کرے تو دھوکے بازی کرے، اور جب جھگڑا کرے تو گالیاں دے‘‘۔

تشریح: مـن کـن فیه: یعنی ان کی حلت کا اعتقاد رکھ کر ان کا مرتکب

ہو اور ممکن ہے کہ کسی مومن میں یہ خصلتیں علی وجہ العادت جمع نہ ہوں اور اس کی تائید نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرمان سے ہوتی ہے۔ ''ومن کانت فیہ خصلۃ منھن کانت فیہ خصلۃ من النفاق حتی یدعھا'' (مرقاۃ: ۱/۱۲۷)

تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ جس کے اندر یہ عادتیں استمرار اور دوام کے ساتھ جمع ہوگئیں تو ممکن ہے کہ وہ منافق ہو۔ البتہ مومن جو ان عادتوں کے ساتھ مفتون ہو تو وہ ان پر مصر نہیں رہیگا، اگر ایک خصلت پائی جائے گی تو دوسری معدوم ہوگی۔

اور ممکن ہے کہ منافق کے ساتھ تشبیہ دینا مقصود ہو اور حرف تشبیہ کو حذف کردیا ہو۔ جیسے زید اسد۔ اصل عبارت ہے زید کالاسد۔ (مرقاۃ: ۱/۱۲۸)

تین چیزیں تو مذکورہی ہیں۔

اذا اؤتمن خان'' ''اذا حدث کذب'' ''واذا وعد اخلف'' یا ''واذا عاھد غدر'' یہ تین علامتیں تو وہاں بیان کردی گئی تھیں۔

اور جیسا کہ پہلی حدیث میں بیان کیا گیا تھا کہ ان تین ہی میں نفاق کی علامتوں کا حصر نہیں ہے اور بھی علامتیں ہیں۔ بعض کے ذکر کرنے سے دوسرے بعض کی نفی نہیں ہوتی۔

☆......نیز عدد میں بالاتفاق مفہوم مخالف معتبر نہیں ہوتا۔ جیسے:

اول تین آدمی آئے ان کو بیان فرمادیا بعد میں چار آدمی آئے ان کو بیان فرمادیا۔ ایسے ہی یہاں بھی مثلاً اولاً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو تین باتوں کا علم دیا گیا ان کو بیان فرمادیا، بعد میں چار باتوں کا علم دیا گیا ان چاروں کو بیان فرمادیا۔

☆......تین خالص نفاق کی علامتیں ہیں اور چوتھی نفاق میں کمال پیدا کرنے کے لئے ہے۔ فلا تعارض۔

لہٰذا اس حدیث میں ایک نئی اور چوتھی علامت یہ بیان کی:

وإذا خاصم فجر: کہ جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ دیوے۔ یہ منافقت کی علامت ہے۔

جس میں یہ چاروں چیزیں پائی جائیں تو وہ اعلیٰ درجہ کا منافق ہوگا۔ چونکہ سب نشانیاں اس میں موجود ہیں۔

اور اس کا بھی احتمال ہے کہ مراد منافق عرفی ہو اور وہ وہ شخص ہے کہ جس کا باطن ظاہر کے مخالف ہو مطلقاً اور نبی علیہ الصلوۃ والسلام کا فرمان مذکور اس کی تائید کرتا ہے۔ (شرح الطیبی: ۲۰۵/۱، باب الکبائر)

منافق کی مثال

﴿۵۱﴾ وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ الْمُنَافِقِ كَالشَّاةِ الْعَائِرَةِ بَيْنَ الْغَنَمَيْنِ، تَعِيْرُ إِلٰى هٰذِهٖ مَرَّةً وَإِلٰى هٰذِهٖ مَرَّةً۔ **(رواہ مسلم)**

حوالہ: مسلم شریف: ۳۷۰/۲، کتاب صفات المنافقین، حدیث نمبر: ۲۷۸۴، عالمی حدیث نمبر: ۵۷۔

حل لغات: العائرة، عَائِر کی تانیث ہے، شاۃ عائرۃ، پریشان بکری، عار (ض) عَیْراً شش وپنج کے ساتھ آنا جانا، الغنمین غنم کا تثنیہ ہے جمع اغنام وغنوم بھیڑ بکریوں کا ریوڑ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”منافق کی مثال اس بکری کی سی ہے، جو دو ریوڑوں کے درمیان پھرتی

ہے، کبھی اس طرف آ جاتی ہے، کبھی اس طرف چلی جاتی ہے"۔(مسلم)

تشــریح: اس حدیث شریف میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے منافقت کی مثال دی ہے اور اس کی بڑی قباحت بیان فرمائی ہے، تا کہ لوگ مثال کو دیکھ کر اس سے اپنے آپ کو دور رکھیں اور اپنے کو اس سے بچائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ منافق کا حال ایسا ہوتا ہے جیسے جب کوئی بکری اٹھ جاتی ہے یعنی اس کو خواہش جفتی ہوتی ہے اور وہ خواہش بڑھ جاتی ہے اور دو بکرے دو ریوڑوں میں ہوں تو وہ کبھی اس ریوڑ میں دوڑ کر جاتی ہے اور کبھی اس ریوڑ میں۔

کہ اگر اس سے کام نہ چلے تو اس سے اور اس سے نہ چلے تو اس سے یعنی یہ منافق بھی ایسے ہیں۔

الی ھؤلاء و الی ھؤلاء: کبھی مسلمانوں کے ساتھ اور کبھی کافروں کے ساتھ۔ مطلب نکالتے ہوئے پھرتے ہیں کہ کسی طرح کام نکل جائے۔ ع

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مثال سے نفاق کی قباحت بیان فرمائی ہے کہ یہ بہت برا فعل ہے بڑا برا کام ہے اس سے بچنا بہت ضروری ہے۔

﴿الفصل الثانی﴾

نو واضح احکام

﴿۵۲﴾ وَعَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ قَالَ قَالَ یَهُودِیٌّ لِصَاحِبِہٖ اِذْهَبْ بِنَا اِلٰی هٰذَا النَّبِیِّ فَقَالَ لَہٗ صَاحِبُہٗ لَا تَقُلْ نَبِیٌّ اِنَّہٗ لَوْ سَمِعَكَ لَكَانَ لَہٗ اَرْبَعُ اَعْیُنٍ فَاَتَیَا رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَسَاَلَاهُ عَنْ تِسْعِ آیَاتٍ بَیِّنَاتٍ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاتُشْرِکُوا بِاللّٰہِ شَیْئًا، وَلَا تَسْرِقُوا، وَلَا تَزْنُوا وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِی حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا تَمْشُوا بِبَرِیءٍ اِلٰی ذِی سُلْطَانٍ لِیَقْتُلَہٗ، وَلَا تَسْحَرُوا وَلَا تَأْكُلُوا الرِّبَا، وَلَا تَقْذِفُوا مُحْصَنَةً، وَلَا تَوَلَّوْا لِلْفِرَارِ یَوْمَ الزَّحْفِ، وَعَلَیْكُمْ خَاصَّةَ الْیَهُودِ اَنْ لَّا تَعْتَدُوا فِی السَّبْتِ قَالَ فَقَبَّلَا یَدَیْہِ وَرِجْلَیْہِ وَقَالَا "نَشْهَدُ اَنَّكَ نَبِیٌّ" قَالَ فَمَا یَمْنَعُكُمْ اَنْ تَتَّبِعُونِی؟ قَالَا اِنَّ دَاوُدَ عَلَیْہِ السَّلَامُ دَعَا رَبَّہٗ اَنْ لَا یَزَالَ مِنْ ذُرِّیَّتِہٖ نَبِیٌّ وَاِنَّا نَخَافُ اِنْ تَبِعْنَاكَ اَنْ یَقْتُلَنَا الْیَهُودُ۔ (رواہ الترمذی، وابوداؤد، والنسائی)

حوالہ: ترمذی شریف: ۲/۱۰۲، باب ماجاء فی قبلة الید والرجل، کتاب الاستئذان، رقم الحدیث: ۲۷۳۳، نسائی شریف سنن کبریٰ، کتاب السیر، باب: ۵۴، رقم الحدیث: ۸۶۵۶.

تنبیہ: صاحب مشکوٰۃ نے اس حدیث کو صفوان بن عسال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سند سے نقل کیا ہے، اور حوالے کے طور پر ترمذی، ابوداؤد، اور نسائی کو ذکر کیا ہے، بعد والوں نے

صاحب مشکوۃ پر اعتماد کرتے ہوئے اسی طرح برقرار رکھا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ابوداؤد نے صفوان بن عسال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا راوی بنایا ہی نہیں ہے، یعنی ابوداؤد شریف میں صفوان بن عسال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سند سے ایک بھی روایت نہیں ہے، لہٰذا حوالے میں ابوداؤد شریف کا ذکر درست نہیں ہے۔ نیز مشکوۃ شریف کے متداول نسخے میں "تسع" کا لفظ نہیں ہے، لیکن ترمذی شریف اور مشکوۃ شریف کی شروحات میں یہ لفظ ہے، اسی لئے یہاں بھی باقی رکھا ہے۔

حل لغات: بری بے قصور، جمع ابریاء، السلطان حکمران، بادشاہ، جمع سلاطین، **فقبلا**، تثنیہ ماضی مذکر غائب، تفعیل سے چومنا، بوسہ لینا۔

ترجمہ: حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ آؤ اس نبی کے پاس چلیں[1]۔ اس کے ساتھی نے کہا کہ ان کو نبی مت کہو، کیوں کہ اگر انہوں نے سن لیا تو ان کی چار آنکھیں ہو جائیں گی، پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے نو واضح احکام کے بارے میں دریافت کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، چوری مت کرو، زنا نہ کرو، جس جان کے قتل کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا ہے اس کو ناحق مت قتل کرو، کسی بے گناہ کو قتل کرنے کے لئے حاکم کے پاس مت لے جاؤ، جادو نہ کرو، سود نہ کھاؤ، کسی پاک دامن عورت پر تہمت مت لگاؤ، میدان جنگ سے راہ فرار نہ اختیار کرو، اور یہودیوں تمہارے لئے خاص طور پر حکم ہے کہ ''شنبہ'' کے دن کے بارے میں حد سے تجاوز نہ کرو'' راوی کہتے ہیں کہ ''ان دونوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پیر چومے'' اور بولے ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حقیقتاً نبی ہیں'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میری اتباع کیوں نہیں کر رہے ہو؟'' انہوں نے کہا کہ ''سچی بات یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے

[1] **اذهب بنا:** با مصاحبت کے لئے ہے، یا متعدی بنانے کے لئے ہے۔ (**مرقاۃ: ۱/۱۲۸، باب الکبائر**)

اپنے رب سے دعا کی تھی کہ ان کی اولاد سے نبوت کا سلسلہ ختم نہ ہو، لہٰذا ہم کو اس بات کا خطرہ ہے کہ اگر ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے ہیں تو یہود ہم کو قتل کر دیں گے۔

تشریح: حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

عسال عسل والا جیسے تمار تمر والا۔

عسل شہد کو کہتے ہیں یہ شہد کا کام کرتے تھے اس لئے ان کو عسال کہتے ہیں۔ حضرت صفوان نام ہے اور پتھر کی چٹان کو بھی صفوان کہتے ہیں۔

پہلے آدمی بہت سخت ہوتے تھے اس لئے نام بھی سخت رکھتے تھے۔ اور آج کیا نام رکھیں گے: گل بلبل طوطی ہندو غیرہ۔

یہودی نے اپنے ساتھی سے کہا اور اس کا ساتھی بھی یہودی ہی ہوگا۔

جیسے طالب علم کا ساتھی طالب علم ہوگا لیکن آج کل تو طالب علموں کی دوستیاں بازاروں اور قصبوں میں ہوتی ہیں۔ حالانکہ طالب علم کی اٹھ بیٹھ طالب علم ہی کے ساتھ ہونی چاہئے۔

تو ایک ساتھی نے دوسرے سے کہا کہ بھائی ہم کو بھی اس نبی کے پاس لے چلو۔ تو دوسرے نے کہا کہ ارے نبی نہ کہہ اگر وہ اس بات کو سنیں گے تو چار آنکھیں ہو جائیں گی۔

چار آنکھ ہونا کنایہ ہے بہت خوش ہونے سے[1]۔

کیونکہ جب رنج ہوتا ہے تو دو کی بھی ایک ہی رہ جاتی ہے اور خوشی میں اور زیادہ کھل جاتی ہیں[2]۔

---

[1] اربع اعین: چار سے مراد یہاں دو کا تثنیہ نہیں ہے بلکہ استمرار مراد ہے، کما فی قولہ تعالیٰ ثم ارجع البصر کرتین. (الملک) الطیبی: ۲۰۷/۱، باب الکبائر.

[2] اسی وجہ سے کہا جاتا ہے اس شخص کے لئے جس کو غموں نے گھیر رکھا ہو "اظلمت علیه الدنیا" [اس پر تو دنیا تاریک ہو گئی] (مرقاۃ: ۱۲۸/۱، باب الکبائر)

جب آدمی اپنی تعریف سنتا ہے تو خوشی محسوس ہوتی ہے۔اور پھر دشمن تعریف کریں تو اس کو خوشی میں اور بھی زیادہ دخل ہے۔

تو انہوں نے سوچا کہ اگر یہ نبی سنے گا کہ یہ اہل علم اور اہل کتاب بھی نبی کہتے ہیں تو اور بھی زیادہ خوش ہونگے۔

یا یہ کنایہ ہے انتظار کرنے سے کیونکہ انسان جب کسی چیز کا انتظار کرتا ہے تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جب سنے گا کہ تم نے نبی کہدیا تو انتظار کریگا تمہارے ایمان لانے اور اتباع کرنے کا۔

یہ قصہ انہوں نے اس وقت بتلایا جب یہ مسلمان ہو گئے تھے۔

تو انہوں نے پوچھا: عن آیات بینات [دلائل واضحہ کے بارے میں سوال کیا]

اس کے دو مطلب ہیں۔

پہلا مطلب تو یہ ہے کہ انہوں نے دلائل بینہ اور دلائل واضحہ معلوم کئے۔[۱]

دوسرا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے وہ معجزات پوچھے جو موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کئے گئے تھے ان کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کیا معجزات تھے۔[۲]

اشکال مع جواب

اعتــراض: یہ ہے کہ انہوں نے سوال کیا نو چیزوں کے بارے میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا دس کے متعلق تو یہ تو سوال کے مطابق جواب نہ ہوا۔

---

[۱] **دلائل واضحہ:** تو وہ احکام عامہ ہیں جو تمام ملتوں اور شریعتوں کو شامل ہوں اور اس کے بعد ان کا بیان ہے "لا تشرکو باللہ شیئا" سے۔

[۲] اور وہ آیات تسعہ یہ ہیں: الید، والعصا، والطوفان، والجراد، والقمل، والضفادع، والدم، والسنون، اورنقص ثمرات۔ (الطیبی: ۲۰۸، باب الکبائر)

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ سوال پر زیادتی کرنا جائز ہے چنانچہ اس کی مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں موجود ہے، **وقد سئل عن ماء البحر .**

جواب میں آپ نے فرمایا: **طهورٌ ماءهٗ وحل میتته.**

دوسرا جواب: اظہر بات یہ ہے کہ یہود نے ان دس آیات منصوصہ کے بارے میں سوال کیا جو ان کے پاس تھیں، ان میں سے نو آیات تو مسلمان اور یہود کے مابین متفق تھیں اور ایک یہود کے ساتھ خاص تھی تو انہوں نے متفق علیہا کے متعلق دریافت کیا اور جو انکے لئے خاص تھی اس کو انہوں نے چھپالیا امتحان کے طور پر تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان آیات کا جواب بھی مرحمت فرمایا اور جس کو انہوں نے چھپایا اس کو بھی بتلایا تاکہ یہ بتانا آپکے معجزہ کی تصدیق کرنے والی بن جائے اور اسی وجہ سے انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ (الطیبی: ۲۰۸/۱، باب الکبائر)

اشکال دوم مع جوابات

دوسرا اشکال یہاں یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے سوال کیا تھا، موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات کے بارے میں، مگر جواب میں معجزات کو بیان نہیں فرمایا بلکہ دیگر احکام کو بیان فرمایا۔ تو جواب سوال کے مطابق نہ ہوا۔

جواب: اس کے متعدد جوابات ہیں۔

(۱)...... میرے نبی ہونے کو بھی تم پہچانتے ہو۔ اور یہ بھی جانتے ہو کہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بتلادوں گا کیا تم میرا امتحان لیتے ہو؟

(۲)...... ایک مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو بیان فرما کر مزید احکام بیان فرمائے۔ مگر راوی نے اختصار کی وجہ سے ان معجزات کو یہاں بیان نہیں فرمایا۔

(۳)......ایک مطلب یہ ہے کہ نو معجزات کو قرآن کریم کے ذکر پر اکتفا کرتے ہوئے حذف فرمادیا اور ان سے متعلق احکام بیان فرمائے۔

(۴)......سوال تو معجزات کے بارے میں ہی کیا تھا مگر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے معجزات کا جواب نہیں دیا۔ بلکہ آپ نے علی اسلوب الحکیم جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ معجزات کے جواب سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا اپنے فائدہ کی باتیں سنو۔ تم اپنے بارے میں سوچو اور سوال کرو چونکہ مدبر انسان کا کام یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی اس سے پوچھے کہ آسمان حرکت کرتا ہے یا زمین؟ تو وہ جواب دیتا ہے کہ بھائی تم خود کو دیکھو کہ میں کہاں حرکت کرتا ہوں۔

تو ایسے ہی آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

جوابات عشر

یہود کے سوالات کے جوابات میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دس باتیں ارشاد فرمائیں۔

(۱)......**لاتشرکوا**: [تم شرک نہ کرو] اس میں شرک کی تمام قسمیں آگئیں۔ معلوم ہوا کہ یہ شرک بھی کرتے تھے، ایک تو وہی شرک کہ یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو "**عزیر ابن اللہ**" کہتے تھے اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "**مسیح ابن اللہ**" کہتے تھے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۲)......**ولا تسرقوا**: [اور چوری نہ کرو] معلوم ہوا کہ وہ چوری بھی کرتے تھے چاہے سب نہ کرتے ہوں مگر کچھ ضرور کرتے ہوں گے، اس سے پتہ چلا کہ چوری کرنا یہود کی عادت ہے۔

اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۳)......**ولا تزنوا:** [اور زنا نہ کرو] معلوم ہوا کہ ان کے اندر زنا بھی پایا جاتا تھا۔

اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۴)......**ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق:** [اور نہ قتل کرو نفس محترم کو مگر حق کے ساتھ]

اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۵)......**ولا تمشوا ببریئ الی ذی سلطان لیقتلہ:** [اور نہ لیجاؤ تم کسی بری اور بے گناہ انسان کو بادشاہ کی طرف تاکہ وہ اس کو قتل کردے] جیسے آج بھی اگر کسی نے کچھ کہہ دیا تو جج کے پاس گئے روپئے بھرے اور اس بے گناہ کو سزا کرادی۔ تو یہ بھی یہودیت کی خصلت ہے۔

اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۶)......**ولا تسحروا:** [اور جادو نہ کرو] اس لئے کہ اس کا بعض صورتوں میں سیکھنا سکھانا اور کرنا کفر ہے اور بعض صورتوں میں فسق ہے۔ (مرقاۃ: ۱۲۹/۱، باب الکبائر)

اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۷)......**ولا تاکلوا الربوا:** [اور سود نہ کھاؤ] معلوم ہوا کہ یہ بھی ان کی عادت تھی۔ جیسا کہ آج بھی یہ وبا عام ہورہی ہے گھر گھر میں سود کھایا جارہا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ سود تھوڑا ہی ہے یہ تو نفع ہے۔

ارے بھائی اگر پائخانہ کا نام حلوہ رکھ لو اور اس میں تیز سی خوشبو ڈالدو تو وہ حلوہ تھوڑا ہی بن جائیگا، وہ تو پائخانہ ہی رہے گا۔

اسی طرح سود کو اگر نفع کہیں تو وہ حلال نہیں ہوگا حرام ہی رہیگا۔

اور فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے:

(۸)...... **ولا تقذفوا محصنة:** [اور کسی پاکدامن عورت کو تہمت نہ لگاؤ] اگرچہ مرد کو تہمت لگانا بھی بڑا گناہ ہے مگر عورت کو تہمت لگانا تو اس کو بالکل ہی برباد کر دیتا ہے۔ پھر اس کو کوئی نہیں پوچھتا۔

اور فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے:

(۹)...... **ولاتولوا للفرار یوم الزحف:** [اور نہ پیٹھ پھراؤ بھاگنے کیلئے میدان کے دن] عرب کے اندر اگر کسی کا لڑکا مر جاتا تو عورتیں اور والدہ اس کے سینہ کو دیکھتیں اگر سینہ پر تیر ہوتا تو خوش ہوتیں اور کہتیں کہ میں نے تجھ کو اسی دن کے لئے جنا تھا، اور اگر پیٹھ پر تیر ہوتا تو روتیں اور چلاتیں کہ تو نے ہمیں بدنام کر دیا اور خاندان کو رسوا کر دیا۔

یہ تو تمام کی تمام مشترک تعلیم تھی، ان چیزوں پر عمل کرنا مسلمانوں یہودیوں اور نصرانیوں سب ہی کے لئے ضروری ہے۔

اور یہ سب وہ نصیحتیں ہیں جو توراۃ وانجیل وغیرہ میں مذکور تھیں اور فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص یہودیوں کے لئے۔

(۱۰)...... **وعلیکم خاصة الیهود ان لا تعتدوا فی السبت:** [اور اے یہودیوں تم پر لازم ہے کہ نہ حد سے بڑھو یوم سبت کے بارے میں[1]]

پس ان دونوں نے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہاتھ پیروں کو چوما اور بوسہ دیا۔

و قالا نشهد انک نبی: اور کہا ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نبی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تمہیں کیا چیز مانع ہے اس بات سے کہ تم مجھ پر کھلے طور سے ایمان لاؤ اور میری اتباع کرو۔

---

[1] یوم السبت میں انکو مچھلی کے شکار سے منع کیا گیا تھا مگر وہ حیلہ کر کے شکار کرتے تھے۔

(تو چونکہ وہ تھے تو یہودی اس وجہ سے فوراً جھوٹ بول گئے کہ ابھی تصدیق کر رہے ہیں اور ابھی جھوٹ بھی بول رہے ہیں) کہنے لگے اصل میں بات یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ اللہ میری اولاد میں ہمیشہ نبی ہوتا رہے اور ہم انہیں کی اولاد سے ہیں اس لئے انتظار کر رہے ہیں کہ ہمارے واسطے کوئی علاحدہ نبی آ جائے[1]۔

حالانکہ حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ دعاء کبھی نہیں کی، اور نہ توراۃ وغیرہ میں یہ مذکور ہے یہ تو ان کی جھوٹی بات تھی مگر ساتھ ہی ایک سچی بات بھی کہدی۔

کیونکہ نرا جھوٹ تو نہیں چلتا۔ اگر کچھ جھوٹ کچھ سچ ہو تو کچھ کام چل جاتا ہے۔

اسی طرح انہوں نے ایک بات سچ بھی کہدی کہ حضرت سچ بات تو یہ ہے کہ ہمیں خوف ہے کہ اگر ہم آپ کا اتباع کرلیں تو یہودی ہمیں قتل کر ڈالیں گے۔

تو اس حدیث پاک میں دس چیزیں ذکر کی گئیں ہیں اگر انہوں نے انہیں چیزوں کے بارے میں سوال کیا تھا تب تو آپ کا جواب سوال کے مطابق ہو گیا۔

اشکال: اور اگر انہوں نے سوال کیا تھا معجزات موسیٰ کے بارے میں تو آپ کا یہ جواب سوال کے مطابق نہیں ہوا حالانکہ جواب سوال کے مطابق ہوتا ہے۔

---

[1] یہ حضرت داؤد علیہ السلام پر افتراء ہے چونکہ داؤد علیہ السلام نے نہ یہ دعا کی ہے اور نہ ہی اس دعا کا اعتقاد رکھنا داؤد علیہ السلام کے بارے میں کسی کے لئے جائز ہے چونکہ داؤد علیہ السلام نے زبور کے اندر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق اور آپ کے خاتم النبیین ہونے کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے تمام آسمانی کتب اور تمام ادیان کا منسوخ ہونا پڑھ لیا تھا، اور جب اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اوصاف کے ساتھ مبعوث ہونے کی خبر دیدی تو آپ پھر اس خبر کے خلاف دعا کیسے مانگ سکتے تھے۔ (الطیبی: ۲۰۹/۱، باب الکبائر)

پس حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں انکا یہ کہنا سخت ترین بہتان ہے اور اس سے قبل جو انہوں نے "نشهد انک نبی الخ" [ہم گواہی دیتے ہیں کہ بیشک آپ نبی ہیں] یہ بطور نفاق کہا تھا اسی وجہ سے صاحب مصابیح اس حدیث کو علامت نفاق کے باب میں لائے ہیں۔

اس کے جوابات اوپر گذر چکے ہیں اور ایک جواب یہ بھی ہے کہ

جواب: مدبر آدمی سوچ سمجھ کر جواب دیتا ہے، سائل کی صلاحیت کے مطابق ایسے موقع پر وہ یہ ہی کہتا ہے کہ جو کچھ تم سوال کر رہے ہو یہ تمہارے کام کی بات نہیں تم ان باتوں میں نہ پڑو اور وہ دوسری چیزیں بیان کر دیتا ہے کہ یہ ہیں تمہارے کام کی چیز تم ان کو سمجھو اور ان پر عمل کرو۔ جیسے اللہ تعالیٰ سے لوگوں نے سوال کیا کہ چاند کیا ہے۔ تو اللہ نے جواب میں یہ نہیں بتلایا کہ اس کی ترکیب کس طرح ہوئی بلکہ اس کی حکمتیں اس کے منافع ذکر کر دئے اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مفاد وصلاحیت کے پیش نظر یہ حکمتیں اور کام کی باتیں ذکر فرما دیں۔

گناہ کی وجہ سے کسی مسلمان کو کافر نہیں کہا جا سکتا

﴿۵۳﴾ وَعَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلٰثٌ مِنْ اَصْلِ الْاِیْمَانِ اَلْکَفُّ عَمَّنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ لَا تُکَفِّرْہُ بِذَنْبٍ وَلَا تُخْرِجْہُ مِنَ الْاِسْلَامِ بِعَمَلٍ وَالْجِہَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِیَ اللّٰہُ اِلٰی اَنْ یُقَاتِلَ اٰخِرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ الدَّجَّالَ لَا یُبْطِلُہٗ جَوْرُ جَائِرٍ وَلَا عَدْلُ عَادِلٍ وَالْاِیْمَانُ بِالْاَقْدَارِ۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۲/۳۴۳، کتاب الجہاد، باب فی الغزو مع ائمۃ الجور، رقم الحدیث: ۲۵۳۲۔

حل لغات: ماض جاری، جمع مواضٍ مضی (ض) مُضِیًّا الشیءُ، گذر جانا، چلا جانا، الدجال، انتہائی جھوٹا فریب کار، یُبْطِلُہ، ابطل الشیءَ (افعال) منسوخ کرنا، باطل

قرار دینا، الجور، ظلم وزیادتی، جمع جَوَرَة، الجائر، ظالم، قانون شکن، جمع جَوَرَة، وجارة۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تین باتیں ایمان کی جڑ ہیں، (۱) جو شخص کلمہ لا الـٰـہ الا اللہ کا اقرار کرے، اس سے جنگ نہ کرنا، کسی گناہ کی وجہ سے اس کو کافر نہ کہنا، کسی عمل کی وجہ سے اس کو اسلام سے بے دخل نہ کرنا، (۲) جب سے اللہ نے مجھ کو رسول بنا کر بھیجا ہے جہاد ہمیشہ ہمیش جاری رہے گا، یہاں تک کہ اس امت کے آخر میں ایک شخص'' دجال سے جنگ کریگا۔ جہاد کسی ظالم بادشاہ کے ظلم اور کسی عادل بادشاہ کے عدل کی وجہ سے ختم نہیں کیا جائے گا۔ (۳) تقدیر پر ایمان لانا۔

تشــریح: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ایمان کی بنیاد تین چیزیں ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف یہی تین چیزیں ایمان کی بنیاد ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایمان کی جملہ بنیادی چیزوں میں سے یہ تین چیزیں بھی ہیں، جیسے ہر حقیقت کے لئے کچھ اوائل ہوا کرتے ہیں، اور کچھ اوساط اور کچھ اواخر۔ مثلاً انسان کا اوائل بچپن ہے اور اواسط اس کی جوانی اور اواخر اس کا بڑھاپا تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایمان کی تین بنیادی چیزیں بیان فرمائی ہیں۔

(۱)......پہلی چیز ''الکف عمن قال لا الہ الا اللہ الخ''[1] [لا الہ اللہ کہنے والے سے رک جانا اور اس سے تعرض نہ کرنا]

(۲)......دوسری چیز ''لاتکفره بذنب'' [کسی گناہ کی وجہ سے اس کو کافر نہ کہنا]

(۳)......تیسری چیز ''لاتخرجه من الاسلام بعمل'' [اس کے کسی عمل کی وجہ سے اس کو اسلام سے خارج نہ کرنا]

---

[1] ''الکف عمن قال لا الہ الا اللہ'' اس میں اشارہ ہے اعتقاد رکھنے کی طرف کہ مؤمن کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہیں ہوتا اور ولاتخرجه من الاسلام یہ رد ہے خوارج اور معتزلہ پر اسلئے کہ خوارج کافر قرار دیتے ہیں اس شخص کو جس سے کوئی گناہ صادر ہوجائے اور معتزلہ اس کے لئے دو درجوں کے درمیان ایک درجہ ثابت کرتے ہیں۔

تو ایمان کی ایک بنیاد یہ ہے کہ جو کلمہ پڑھتا ہو خلوص سے یا بغیر خلوص کے تو تم اس سے تعرض نہ کرو اور نہ اس کی تکفیر کرو۔ چاہے وہ کتنا ہی بڑا گناہ کرتا ہو چاہے شراب کی بھٹیاں ہی اس نے اپنے گھر میں کھدوا رکھی ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ایسا ایٹم بم چھوڑا کہ جو معتزلہ اور خوارج کے ایوانوں پر ایساگرا کہ وہ دھڑام سے گر کر ریزہ ریزہ ہو گئے۔

یہ بالکل صاف وصریح حدیث ہے۔ اس کی وجہ سے تمام حدیثوں کو مؤول کرنا پڑیگا۔ تا کہ مضمون وارد درست رہے۔

تم کسی کی تکفیر نہ کرو نہ مودودیوں کی نہ دوسرے فرقہ والوں کی اور یہ نہیں کہ قادیانی فرقہ کی بھی تکفیر نہ کرو۔ وہ تو کافر ہے ہی چونکہ وہ ختم نبوت کے قائل نہیں اس وجہ سے ان کے اعمال خراب نہیں بلکہ ان کے عقائد غلط ہیں اور عقائد کا غلط ہونا یہی تو کفر ہے۔ اس لئے وہ تو کافر ہیں ہی۔

والجهاد ماضٍ منذ بعثني الله الى ان يقاتل آخر هذه الامة الدجال:

کہ ہمیشہ ہمیش جہاد باقی رہے گا جو اس کا منکر ہو تو سمجھ لو کہ اس کو کچھ نہیں آتا وہ تو جاہل ہے اور جہاد قیامت تک رہے گا۔ اور چاہے جہاد کسی بھی طرح کا ہو۔ یعنی دین میں جد وجہد کرنا چاہے کسی بھی طریقہ سے ہو یہاں تک کہ دجال کو قتل کیا جائے اور دجال کو قتل کرنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے۔

اور دجال کو قتل کرنے کے بعد جہاد باقی نہیں رہے گا بہر حال یاجوج ماجوج کے خلاف تو ان سے مقابلہ کی طاقت اور قدرت نہ ہونیکی وجہ سے اور ان کو اللہ تعالیٰ کے ہلاک کر دینے کے بعد زمین پر کوئی کافر باقی نہیں رہے گا، جب تک حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام زندہ رہیں گے اور اس شخص کے خلاف لڑنا اور جہاد کرنا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کفر کو اختیار کرے تو عنقریب تمام مسلمانوں پر ایک پاکیزہ ہوا کے ذریعہ سے موت طاری ہو جائے گی اور

قیامت کے قائم ہونے تک کفار ہی باقی رہ جائیں گے۔(مرقاۃ،۱۳۰/۱،باب الکبائر)

اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس جہاد کو نہیں باطل کر سکتا کسی کا ظلم یعنی اگر جہاد وقتال کے ساتھ ہو اور بادشاہ فاسق و فاجر ہی ہو پھر بھی جہاد ضروری ہے جس طرح اگر بادشاہ عادل ہو تو بھی جہاد ضروری ہے یہ نہیں کہ جب ہمارا بادشاہ ہی ایسا ہے تو کیا جہاد کریں۔

ولا یبطلہ جور جائر ولا عدل عادل: [یعنی جہاد ساقط نہیں ہوگا خواہ امامِ وقت اور بادشاہ انصاف پرور ہو یا ظالم اور فاسق ہو] اور حدیث شریف میں جو وارد ہوا ہے "**الجہاد واجب علیکم مع کل امیر برا کان او فاجرا**" اس میں رد ہے منافقین اور بعض کفار پر جو یہ گمان رکھتے ہیں کہ چند دن کے بعد اسلام کی حکومت ختم ہو جائے گی تو گویا کہہ دیا گیا کہ جہاد جاری رہے گا، یعنی حکومت اسلام کی نشانیاں زندہ ہیں اور اس کے اولیاء امت مددگار رہیں گے اور ملت اسلام کے دشمن قیامت تک غصہ میں رہیں گے۔
(مرقاۃ:۱۳۰/۱،باب الکبائر)

ایک بنیادی اصول یہ ہے: "**الایمان بالاقدار**" [کہ تقدیروں پر ایمان رکھنا] کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ تقدیر سے ہوتا ہے۔

الایمان بالاقدار: معتزلہ کہتے ہیں کہ بندہ گناہ اور معصیت کرنے میں مختارِ کل ہے اس میں تقدیر کا کوئی دخل نہیں۔ اس لئے اس جملہ میں ان پر رد ہے۔
(مرقاۃ:۱۳۱/۱،باب الکبائر)

ایمان بالاقدار نام ہے ایک مستقل عقیدہ کا۔ تدبیر ایک علیحدہ چیز ہے۔
تدبیر اور ایمان بالتقدیر میں تصادم نہیں ہے اور نہ کچھ تعارض۔

تدبیر تو نام ہے ہاتھ پیر کی حرکت کا۔ اور تقدیر نام ہے ایک عقیدہ کا تو ان دونوں میں کیا تصادم ہوا؟

زنا ایمان کے منافی ہے

﴿۵۴﴾ وَعَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا زَنَی الْعَبْدُ خَرَجَ مِنْهُ الْاِيْمَانُ فَكَانَ فَوْقَ رَأْسِهٖ كَالظُّلَّةِ فَاِذَا خَرَجَ مِنْ ذٰلِكَ الْعَمَلِ رَجَعَ اِلَيْهِ الْاِيْمَانُ۔ (رواه الترمذی وابوداؤد)

حواله: ترمذی شریف: ۲/۹۰، باب ما جاء لا یزنی الزانی وهو مؤمن، کتاب الایمان، رقم الحدیث: ۲۶۲۷، بعد تعلیقاً یہ روایت ہے ابو داؤد: ۲/۶۴۴، باب الدليل على زيادة الايمان، کتاب السنة، عالمی حدیث نمبر: ۶۰۔

حل لغات: فوق، تحت کی ضد ہے، اوپر، الظلة، سایہ سائبان ج ظللٌ.

ترجمه: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب بندہ زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان نکل جاتا ہے اور اس کے سر پر سائبان کی طرح معلق رہتا ہے، اور جب وہ اس بدفعلی سے فارغ ہو جاتا ہے تو ایمان اس کی طرف لوٹ آتا ہے۔

تشریح: فكان فوق رأسه كالظلة: اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف اگر چہ وہ ایمان کے حکم کی خلاف ورزی کر رہا ہے لیکن پھر بھی وہ اس کے سایہ میں ہے اس ارتکاب سے اس پر ایمان کا حکم ختم نہیں ہوگا۔ (المرقاۃ: ۱/۱۳۱، باب الکبائر)

رجع اليه الايمان: اس میں اشارہ ہے کہ مومن اشتغال بالمعصیة کی حالت میں اس شخص کی طرح ہوتا ہے جو اپنے ایمان کو گم کرنے والا ہے اور جب وہ اس معصیت سے فارغ ہو جاتا ہے تو ایمان اس کی جانب لوٹ آتا ہے۔ (مرقاۃ: ۱/۱۳۱، باب الکبائر)

اس حدیث میں زنا کو بطور مثال ذکر کیا ہے ورنہ ہر گناہ کے وقت ایمان نکل جاتا ہے اور ایمان نکل جانے کا مطلب وہی ہے جو پیچھے گذر چکا "لایزنی الزانی حین یزنی وھو مومن" کے تحت کہ ایمان کا کمال، ایمان کی روشنی چلی جاتی ہے اور روشنی جانے سے شی کی نفی کر دی گئی۔

جیسے اگر لالٹین میں روشنی نہ ہو تو کہہ دیا جاتا ہے کہ لال ٹین ہی نہیں اور ایمان نکل کر یوں نہیں کہ کہیں چلا جائے۔نہیں بلکہ جس طرح کوئی شریف آدمی عورت سے بگڑ کر اس سے منہ پھیر لیتا ہے کروٹ بدل لیتا ہے اور زیادہ کرتا ہے تو باہر والی بیٹھک میں بیٹھ جاتا ہے اسی طرح ایمان بھی اس کے دل سے نکل کر اس کے سر پر سایہ فگن ہو جاتا ہے۔

﴿الفصل الثالث﴾

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو چند وصیتیں

﴿۵۵﴾ عَنْ مُعَاذٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ اَوْصَانِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِعَشْرِ کَلِمَاتٍ قَالَ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَیْئاً وَاِنْ قُتِلْتَ وَحُرِّقْتَ وَلَا تَعُقَّنَّ وَالِدَیْكَ وَاِنْ اَمَرَاكَ اَنْ تَخْرُجَ مِنْ اَهْلِكَ وَمَالِكَ وَلَا تَتْرُکَنَّ صَلَاةً مَکْتُوْبَةً مُتَعَمِّداً فَاِنَّ مَنْ تَرَكَ صَلَاةً مَکْتُوْبَةً مُتَعَمِّداً فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَلَا تَشْرَبَنَّ خَمْراً فَاِنَّهُ رَأْسُ کُلِّ فَاحِشَةٍ وَاِیَّاكَ وَالْمَعْصِیَةَ فَاِنَّ بِالْمَعْصِیَةِ حَلَّ سَخَطُ اللّٰهِ وَاِیَّاكَ وَالْفِرَارَ مِنَ الزَّحْفِ وَاِنْ هَلَكَ النَّاسُ وَاِذَا اَصَابَ النَّاسَ مَوْتٌ وَاَنْتَ فِیْهِمْ فَاثْبُتْ وَاَنْفِقْ عَلٰی عِیَالِكَ مِنْ طَوْلِكَ وَلَا تَرْفَعْ عَنْهُمْ عَصَاكَ اَدَباً وَاَخِفْهُمْ فِی اللّٰهِ۔ (رواہ احمد)

حوالہ: مسند احمد: ۵/۲۳۸۔

حل لغات: حرقت النار، الشیء مصدر تحریق جلادینا، المکتوبة، رات ودن کی پانچ فرض نمازیں، تعمد الشیءَ کوئی کام دیدہ ودانستہ کرنا، فاحشة، فاحش کی تانیث ہے، برا اور قابل نفرت قول وفعل، جمع فواحش، السُخط والسَّخَط، ناگواری، ناراضگی، غصہ، سَخِطَ علیہ (س) کسی سے ناراض ہونا، اَنفِقْ امر حاضر، المالَ ونحوہ مال وغیرہ خرچ کرنا، عیالٌ، واحد عَیِّلٌ، اہل خانہ، بال بچے، الطول دولت مندی، مالی وسعت۔

ترجمہ: حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دس باتوں کی وصیت فرمائی، (۱) اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اگر چہ تم قتل کردئے جاؤ، اور جلا دئے جاؤ، (۲) اپنے والدین کی نافرمانی ہرگز مت کرو، اگر چہ وہ تم کو اہل ومال سے دستبردار ہونے کا حکم کریں، (۳) فرض نماز جان بوجھ کر مت چھوڑو، اس وجہ سے کہ جو شخص فرض نماز جان بوجھ کر چھوڑتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے بری الذمہ ہے، (۴) شراب مت پیو، اس وجہ سے کہ یہ ہر برائی کی جڑ ہے، (۵) اللہ کی نافرمانی سے بچو کیونکہ نافرمانی یہ اللہ کے غضب کے نزول کا سبب ہے، (۶) جہاد میں راہ فرار اختیار کرنے سے باز رہو، (۷) جب لوگ وبا کے پھیل جانے کی وجہ سے ہلاک ہونے لگیں اور تم ان میں موجود ہو تو وہیں جم جاؤ، (۸) اپنے اہل وعیال پر اپنی وسعت کے بقدر خرچ کرو، (۹) ان سے ادب کی اپنی لاٹھی مت ہٹاؤ، (۱۰) اللہ تعالیٰ کے معاملے میں ان کو ڈراتے رہو۔

تشریح: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ کو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دس چیزوں کی وصیت فرمائی۔

وصیت: وصیت کسی تاکیدی حکم کو کہتے ہیں۔

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کے ساتھ دس باتوں کی ہدایت فرمائی۔
اور یہ دس باتیں حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے لئے خصوصی سرمایہ نہیں تھیں۔
بلکہ سب کے لئے عام ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر کلام جب تک اس کی خصوصیت پر کوئی قرینہ یا لفظ دال موجود نہ ہو تو عام ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی عام ہے۔

(۱)...... **شرک باللہ**: پہلی چیز "**لا تشرک باللہ شیئا**" [کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا]

اس کا یا تو یہ مطلب ہے کہ جس طرح تم اس وقت شرک نہیں کر رہے ہو ایسے ہی آخر دم تک بھی شرک نہ کرنا۔
کیونکہ اس وقت جب کہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شرک نہیں کر رہے تھے ان کو شرک سے منع کرنے کی کیا وجہ ہے؟ اس لئے کہنا پڑیگا کہ یہ امر استمراری ہے۔
کیونکہ امر کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) امر ہنگامی (۲) امر استمراری
تو یہاں امر سے استمراری مراد ہے۔
یا پھر یوں کہو کہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو اس امر کے مخاطب برائے نام ہیں۔
اور مقصد یہ ہے کہ اس امر کو دوسروں تک پہنچا دو کہ تم شرک نہ کرو، اور اس تاکید کے ساتھ حکم کرو '**ان حرقت او قتلت**' [اگر چہ جلا دیا جائے اور قتل کر دیا جائے، مگر ہرگز شرک نہ کرنا]

بحالت اکراہ کلمۂ کفر زبان سے کہنا

اس صورت میں عزیمت تو یہی ہے کہ چاہے جل جائے اور قتل ہو جائے مگر کلمۂ کفر کو زبان پر نہ لائے۔ اس حدیث شریف میں اسی عزیمت کا بیان ہے۔
اور فقہاء نے ایسے موقع پر رخصت بھی دی ہے کہ جب دل ایمان پر مطمئن ہو تو ایسے

موقع اکراہ پر اپنی جان کی حفاظت کے لئے زبان سے کلمہ کفر کہہ دینا بھی جائز ہے۔

اور چونکہ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اصحاب عزیمت حضرات میں سے تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عزیمت ہی کا حکم دیا۔

مگر چونکہ دنیا میں بالعموم اصحاب عزیمت نہیں ہوتے بہت بڑی تعداد اہل رخصت کی بھی ہوا کرتی ہے اس لئے ایسے مواقع پر ان کے لئے رخصت کی بھی اجازت ہے۔

(۲)......**اطاعت والدین:** دوسری چیز "**لا تعقن والديک وان امراک ان تخرج من اهلک ومالک**"[۱] [کہ تم اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرنا اگرچہ وہ حکم دیں کہ تم اپنے مال وعیال سے جدا ہو جاؤ]

چونکہ بیوی تو اور بھی مل سکتی ہے، مال اور بھی مل سکتا ہے مگر والدہ اور والد ایسی چیزیں ہیں کہ جو مرنے کے بعد واپس نہیں آتیں ان کے ساتھ تعلق بھی نسبی ہے جو دوسرے کے ساتھ نہیں ہوتا۔ یہاں بھی عزیمت کا بیان ہے۔

والدین کے حکم سے بیوی کو طلاق

اس کی تفصیل کتب فقہ میں ہے کہ ماں باپ کے کہنے سے کن صورتوں میں بیوی کو طلاق دینی جائز ہے اور کن صورتوں میں ناجائز۔ یہاں تو صرف عزیمت کو بتانا مقصود ہے کہ والدین کی نافرمانی نہ کرنا۔

پہلے حکم دیا گیا توحید کا اور پھر حقوق والدین کا۔

---

[۱] **لا تعقن والديک:** والدین کی کسی ایسے حکم کی خلاف ورزی نہ کرنا جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم نہ آئے اور جس میں نافرمانی لازم آئے تو اس میں اطاعت ضروری نہیں۔ **لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق.**

(مرقاة: ۱/۱۳۲، باب الكبائر)

(۳)...... **ترک نماز کا وبال:** تیسری چیز "لاتترکن صلوٰۃ مکتوبۃ متعمداً"

ہے۔[کہ ہرگز جان بوجھ کرفرض نماز کو نہ چھوڑنا] چونکہ کوئی جان بوجھ کرفرض نماز کو

چھوڑ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا ذمہ اس سے بری اور اس سے جدا ہو جاتا ہے۔[۲]

اگر اللہ تعالیٰ اپنی ذمہ داری سے الگ ہو جائیں بتلا یئے پھر کونسا ٹھکانہ ہے؟ اللہ تعالیٰ کے بری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اللہ کھانے کو دیتا ہے لیکن اگر وہ اپنی ہوا کو روک دیں تو ہماری ہوا نکل جائے اگر وہ پانی کو بند کردیں تو کیا ہوگا؟

انسان کے ساتھ جو بہت سے فرشتے رہتے ہیں اگر ان کو ہٹالیں تو کیا ہو ایک ایک انسان کے ساتھ جو ہزاروں دشمن شیاطین کا ہجوم رہتا ہے اگر ان سے حفاظت نہ کریں تو کیا ہو، جبکہ وہ انسان کو اس طرح گھیر لیتے ہیں جس طرح شہد کی مکھیاں اپنے چھتہ کو گھیرے رکھتی ہیں اور پھر بھی اللہ تعالیٰ ان سے حفاظت کرتے ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی مہربانی ہے۔

ورنہ ضابطہ تو یہ ہے کہ جب کوئی آدمی نماز کو ترک کردے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے اپنی ذمہ داری اٹھالیں۔ مگر نہیں پھر بھی اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔

اور فرمایا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے:

(۴)...... **شراب کی ممانعت:** "ولا تشربن خمرا فانہ رأس کل فاحشۃ" [کہ ہرگز شراب نہ پی جیو، چونکہ شراب ہر برائی کی جڑ ہے] شراب پینے سے غصہ بیہودہ پن گالی گلوچ زنا کاری وغیرہ عام ہو جاتی ہے تو معلوم ہوا کہ سب

---

[۲] یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امن میں نہیں رہے گا۔ دنیا میں تعزیر اور ملامت کا مستحق ہونے کی وجہ سے اور آخرت میں عذاب کا مستحق ہونے کی وجہ سے ابن حجرؒ فرماتے ہیں یہ کنایہ ہے اس کے اکرام واحترام کے ختم ہونے سے، اسلئے کہ اسکی وجہ سے اس کو سزا کے طور پر قید میں ڈال دیا جائیگا۔ علماء کی ایک جماعت کے نزدیک، اور وہ مقتول ہوگا حد کے طور پر نہ کہ کفر کے طور پر۔ نماز کو وقت ضروری سے ٹال دینے کی اور وقت کے اندر نماز کا حکم ہونے کیوجہ سے شوافع کے یہاں۔ اور اسکو قتل کیا جائیگا کفر کی وجہ سے اور اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائیگی اور نہ ہی اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائیگا حنابلہ کے نزدیک۔ (مرقاۃ:۱۳۲/۱، باب الکبائر)

برائیوں کی جڑ شراب ہے۔

اس لئے کہ مانع من الفواحش عقل ہے اور اسی لئے اس کو عقل کہتے ہیں چونکہ وہ اپنے صاحب کو برائیوں سے روک دیتی ہے تو جب انسان کے اندر سے عقل زائل ہوگئی تو وہ ہر اس برائی میں ملوث ہو سکتا ہے جو اس کے سامنے آ جائے اسی وجہ سے اس کا نام ام الخبائث ہے جیسا کہ نماز ام العبادات ہے چونکہ وہ بے حیائی اور ناپسندیدہ امور سے روکتی ہے۔ (مرقاۃ:۱۳۲/۱، باب الکبائر)

اور فرمایا آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے:

(۵)...... **نافرمانی پر اللہ تعالیٰ کا غصہ**: **"وایاک والمعصیة"** [اور بچا اپنے کو معصیت سے]

چونکہ جب انسان معصیت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا غصہ اتر آتا ہے[۱]۔ حلّ اتر آتا ہے۔ ضابطہ کے طور پر تو غصہ ہوتا ہے مگر پھر بھی روٹیاں دیتا ہے۔ یہ اس کا احسان ہے کہ بندہ کی طرف غصہ اور ناراضگی کے کام کے باوجود اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں سے محروم نہیں کرتا۔

حضرت شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے: ؎

ولکن خداوند بالا و پست
بعصیان در رزق بر کس نہ بست
ادیم زمین سفرۂ عام اوست
چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست

---

[۱] فان بالمعصیة حل سخط اللّٰہ: لفظ ان کا اسم ضمیر شان ہے جو محذوف ہے یعنی فانہ ہے۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ ضمیر شان کو تو حذف نہیں کیا جاتا ہے اس لئے کہ اس سے کلام کی تعظیم مقصود ہوتی ہے۔؟

جواب: یہ انتصار کے لئے ایسا کیا گیا ہے ضمیر شان کا حذف انتصار کی وجہ سے درست ہے۔ (مرقاۃ:۱۳۲/۱، باب الکبائر)

[اور لیکن زمین وآسمان کا مالک، نافرمانی کی وجہ سے کسی پر رزق کا دروازہ بند نہیں کرتا، عام اس کی زمین اور عام اس کا دسترخوان ہے۔ سخاوت کے اس دسترخوان پر دوست ودشمن سب برابر ہیں۔]

(۶)......**میدان جنگ سے بھاگنے کی ممانعت**: **وایاک والفرار من الزحف**: [اور بچا تو اپنے آپ کو میدان جنگ سے بھاگنے سے] یعنی تو بزدلی کی وجہ سے میدان جنگ سے گھبرا کر نہ بھاگ جانا اگرچہ تمام لوگ ہلاک ہوجائیں۔

اس میں بھی عزیمت کا بیان ہے ورنہ تو اپنے سے دوگنے ہونے کی حالت میں فرار کی بھی گنجائش ہے، جیسا کہ خود قرآن پاک میں ہے: "**الآن خفف اللہ عنکم الآیة**"

(مرقاۃ: ۱۲۳/۱، باب الکبائر)

اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۷)......**طاعون زدہ بستی سے نکلنے کی ممانعت**: **وان اصاب الناس موت وانت فیھم فاثبت**: [اگر کہیں طاعون یا کوئی دوسری بیماری وغیرہ آجائے تو وہیں ثابت قدم رہو]

تو خیر اگر طاعون وغیرہ یا کوئی اور وبا پھیل جائے تو تم وہاں سے بھاگ نہ جائیو۔ ایک دوسری حدیث شریف میں ہے:

اذا وقع الطاعون ببلد وانتم فیہ فلا تخرجوا منہ واذا وقع ببلد ولستم فیہ فلا تدخلوا. حکم اول میں حکمت یہ ہے کہ اہل شہر اگر وہاں قیام پزیر ہوں اور یہ بھاگے تو وہ بھی غیر مطمئن ہو کر بھاگنے لگیں گے اور رضا بالقضاء کی دولت ہاتھ سے چھوٹ جائے گی اور دوسرے حکم کی حکمت یہ ہے کہ جو شخص وہاں جائے گا اور ناگاہ اس کو وہ مصیبت وتکلیف پہنچ جائے تو وہ اس مصیبت کو اپنے آنے کی جانب منسوب کریگا تو اس کا قدم پھسل جائے گا۔ اور

ثابت قدمی نہیں ہوگی، اور دونوں معاملوں میں سے ایک میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس لئے وہاں نہ دخول کی ضرورت ہے اور نہ خروج کی۔ (مرقاۃ: ۱۳۲/۱، باب الکبائر)

(۸)......**اہل وعیال پر میانہ روی سے خرچ: وانفق علی عیالک من طولک:** [اور خرچ کر اپنے عیال پر اپنی آمدنی سے] جیسی تمہاری آمدنی ہو اسی کے اعتبار سے خرچ کرو اگر ہزار روپے ماہانہ آمدنی ہے تو اسی کے اعتبار سے خرچ کرو، اور اگر تیس روپے آمدنی ہے تو اسی کے اعتبار سے خرچ کرو۔ یہ نہیں کہ قرض کرلو اور حلوے وغیرہ خوب کھلاؤ نہیں بلکہ جیسی آمدنی ہو ایسا ہی خرچ کرو۔ مطلب یہ ہے کہ میانہ روی اختیار کرو نہ اسراف ہو نہ بخل۔

(۹)......**اہل وعیال کی تادیب وتربیت: ولا ترفع عنهم عصاک ادبا:**[1] [اور اپنی لاٹھی ان سے نہ اٹھاؤ ادب کے واسطے] لاٹھی ان پر گھومتی رہے، جہاں ذرا سی بے ادبی اور گستاخی کریں فوراً روکو اور منع کردو۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے گھر والوں کی تربیت اور تادیب سے غفلت نہ کرو۔

(۱۰)......**اہل وعیال میں خوف خداوندی کی کوشش کرنا: واخفهم فی الله:** [اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں ان کو ڈراتے رہا کرو] حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے حالات سنادیا کرو، انہیں ایک حکایت روز یاد کرادو، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہم وغیرہ کی۔ مطلب یہ ہے کہ

---

[1] یعنی جب وہ ادب سیکھنے میں ضرب کے مستحق ہوں تو اس میں نرمی نہ برتو جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "واللاتی تخافون نشوزهن فعظوهن واهجروهن فی المضاجع واضربوهن" ترتیب وار ذکر کردیا۔ (مرقاۃ: ۱۳۳/۱، باب الکبائر)

ترجمہ: اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بد دماغی کا احتمال ہو تو ان کو زبانی نصیحت کرو اور ان کو ان کے لیٹنے کی جگہ میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ (بیان القرآن)

ان کو اللہ تعالیٰ کے اوامر اور منہیات کے بارے میں نصیحت اور تعلیم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے ڈراتے رہو، برے اخلاق بری اور گندی عادتوں کی مذمت اور ان کے نقصانات بتاتے رہو، مکارم اخلاق کے فوائد بتا کر ان پر ان کو ابھارتے رہو۔ محض سمجھانا اگر کافی نہ ہو تو تدابیر اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً تبلیغی جماعت میں بھیجنا، مشائخ سے تعلق قائم کرانا، اور ان کی صحبت میں رہنے کی تاکید کرنا، اسی طرح بری صحبت سے حفاظت کی کوشش کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرضیکہ خوف خداوندی حاصل ہونے کی جو تدبیر بھی مفید ہو سکتی ہو اس کو اختیار کرنا اس حکم میں داخل ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خوف خدا ہی ایسی چیز ہے کہ جس سے انسان معاصی اور برائیوں سے اکتاتا ہے، اور اس میں عبادات وطاعات کی رغبت پیدا ہوتی ہے، اور انسان کی اصلاح کے لئے یہی دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

جامعیت حدیث

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث پاک میں پورا دین آ گیا ہے، عقائد بھی عبادات بھی، معاشرت بھی، معاملات بھی، اخلاقیات بھی، تقویٰ بھی، خوف خدا بھی اور اہل وعیال کی تربیت بھی وغیرہ۔

اس زمانے میں یا تو کفر ہے یا ایمان

﴿۵٦﴾ وَعَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ اِنَّمَا النِّفَاقُ كَانَ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَّا الْيَوْمَ فَاِنَّمَا هُوَ الْكُفْرُ وَالْاِيْمَانُ۔ (رواه البخاری)

حواله: بخاری شریف:۲/۱۰۵۴، باب اذا قال عند قوم سیئا الخ، کتاب الفتن، حدیث نمبر:۷۱۱۴، عالمی حدیث نمبر:۶۲۔

حل لغات: عھد، جمع عھود، زمانہ،یوم جمع ایامٌ، دن۔

ترجمہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نفاق کا حکم حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا،اس زمانے میں یا کفر ہے یا ایمان۔

تشریح: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ تم حضرت رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے رازدار ہو،ہمیں بھی بتلادو،انہوں نے جواب دیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اسی وجہ سے تو مجھ سے بتلادیتے ہیں کہ میں کسی سے نہیں بتلاتا۔

انہوں نے پھر فرمایا: کہ اچھا یہ تو بتلادو کہ منافقین کے نام کیا کیا ہیں؟

انہوں نے جواب دیا اس کی تو اجازت نہیں ہے حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سے منافقین کے نام بتلادیئے تھے، چونکہ اگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بتلادیتے تو وہ تو تلوار لیکر پل پڑتے، چونکہ ان کے اوپر شان فاروقیت غالب تھی، جس کی وجہ سے وہ ادنی درجہ نافرمانی کو بھی برداشت نہیں کرسکتے تھے، چہ جائیکہ نفاق، اور اللہ تعالیٰ کی جو مصلحتیں ان کو مخفی رکھنے میں تھیں وہ ختم ہوجاتیں، اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بتلایا بھی نہیں تھا۔صرف حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بتلادیا تھا، تاکہ امت کے لوگوں کو معلوم بھی ہوجائے اور سب کو معلوم بھی نہ ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ اچھا یہ تو بتادو کہ میرا نام تو منافقین میں نہیں ہے، انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔اس وقت ان جیسے برگزیدہ ومقبول صحابی رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی یہ فکر تھا کہ شاید میرا نام منافقین میں ہو،مگر آج منافق بھی اپنے کو اعلیٰ درجہ کا مخلص

ومقبول سمجھتا ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمادیا کہ نہیں تمہارا نام نہیں ہے، کہ اس میں کوئی راز کی بات نہ تھی۔تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اطمینان ہوا، کسی کا جنازہ ہوتا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تحقیق فرمایا کرتے کہ جنازہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شریک ہیں یا نہیں، اگر معلوم ہوتا کہ شریک ہیں تو پھر خود بھی شرکت فرماتے، ورنہ نہیں۔

اپنے حکام اور امراء کے بارے میں دریافت فرماتے کہ کوئی منافق تو نہیں، حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بتادیتے مثلاً ایک منافق ہے، نام نہیں بتاتے تھے کہ اس کا حکم نہیں تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی فراست ایمانی سے پہچان لیتے تھے کہ فلاں منافق ہے اور اس کو برخواست فرمادیا کرتے تھے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا کہ نفاق حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا اور آج تو صرف ایمان ہے یا کفر۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ آج نفاق بالکل نہیں ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اب کوئی فرقہ نفاق کے نام کے ساتھ نامزد اور مشہور نہ ہوگا۔ان کے ساتھ منافقوں جیسا معاملہ اور برتاؤ نہیں کیا جائے گا۔ ورنہ آج بھی بہت سے آدمی ایسے ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ مسلمان اور کافروں کے ساتھ کافر۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چند حکمت و مصالح کے پیش نظر منافقین کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا کہ ان کی جان و مال سے تعرض نہیں کیا جاتا تھا، پھر آپ کے بعد وہ مصالح ختم ہو گئے لہذا ان کا وہ حکم بھی ختم ہو گیا، اب دو ہی صورتیں باقی رہیں، یا مسلمان ہونا یا قتل، اگر کسی کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہ ظاہراً مسلمان ہے مگر دل میں کفر ہے، تو اس کو کافر کہا جائے گا۔اور اس جیسا معاملہ کیا جائیگا۔

اب وہ مصالح کیا تھے؟تو مختلف مصالح بیان کیئے گئے ہیں۔

(۱)......ابتداءِ اسلام میں مسلمان کم تھے اسلیئے ظاہراً ان کے مسلمانوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے کم سے کم مسلمانوں کی کثرت تو معلوم ہوتی تھی جس سے کفار پر رعب پڑتا تھا۔

(۲)......ان منافقین کو کفار مسلمانوں میں شمار کرتے تھے۔اب اگر مسلمان ان کو قتل کرتے تو کفار سمجھتے کہ مسلمانوں کی آپس میں خانہ جنگی ہے، اپنے لوگوں کو قتل کر رہے ہیں۔ جس سے ان کی ہمت بڑھتی۔اور بہت سے کمزور قسم کے مسلمانوں کی ہمت پست ہوجاتی کہ مسلمان تو آپس میں مسلمانوں کو ہی قتل کر رہے ہیں۔

(۳)......قتل کی صورت میں جولوگ خالص ایمان لانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔وہ بھی اس ڈر سے مسلمان نہ ہوتے کہ معلوم نہیں کہ شاید ان کے مانند ہمیں بھی منافق سمجھ کر مارڈالا جائے، جس سے اسلام کی ترقی میں رکاوٹ ہوجاتی۔

(۴)......منافقین کے ساتھ اس حسن سلوک کی بناء پر بہت سے منافق وغیر منافق حلقہ اسلام میں داخل ہوجاتے تھے، کہ جب دشمنوں کے ساتھ اتنا حسن سلوک ہے تو پھر خاص مسلمان ہونے سے کتنا اچھا برتاؤ ہوگا۔وہ قیاس سے باہر ہے۔پھر مسلمانوں کی کافی تعداد بڑھ گئی کہ خود اپنے قدموں پر کھڑے ہو سکتے تھے۔دوسروں کی نصرت کی ضرورت نہ تھی تو منافقین کا یہ حکم بھی باقی نہ رہا۔(مرقاۃ، باب الکبائر)

باب فی الوسوسة

اس باب میں از ۷۵ تا ۷۲ کل پندرہ احادیث ہیں۔

باب فی الوسوسۃ

وسوسہ اور الہام

وہ خیالات جو دل میں ظاہر ہوں اگر وہ برائیوں اور معاصی کی جانب دعوت دینے والے ہوں تو ان کو وسوسہ کہتے ہیں اور اگر وہ خیالات اچھی عادتوں اور اطاعت وفرمانبرداری کی جانب دعوت دینے والے ہوں تو ان کو الہام کہتے ہیں۔

وسوسہ کی قسمیں

وسوسہ کی دو قسمیں ہیں:

(۱)......ضروریہ۔ (۲)......اختیاریہ

ضروریہ: وہ ہے جو خیال دل میں ابتداءً آئے اور انسان اس کے دفع کرنے پر قادر نہ ہو اور یہ تمام امتوں سے معاف کر دیا گیا۔

اختیاریہ: یہ ہے کہ خیال دل میں پیدا ہو اور جم جائے اور انسان اس پر عمل کرنے کا اور اس سے لذت حاصل کرنے کا ارادہ کرے جیسے کسی کے دل میں کسی عورت کی محبت کا گذر ہو اور وہ اس تک پہونچنے کا ارادہ کرتا ہے، جو معصیت کے مشابہ ہے، حق تعالیٰ شانہ نے بطور خاص حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طفیل وبرکت سے اس امت سے اس قسم کو بھی معاف فرمادیا۔ (الطیبی: ۱/۲۱۳)

"فَجَزَی اللّٰهُ سَيِّدَنَا مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا هُوَ اَهْلُهٗ"

﴿الفصل الاول﴾

وسوسوں پر مواخذہ نہیں ہوگا

﴿۵۷﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ مَاوَسْوَسَتْ بِهٖ صُدُوْرُهَا مَالَمْ تَعْمَلْ بِهٖ اَوْ تَتَكَلَّمْ"۔ (متفق علیه)

حوالہ: بخاری شریف: ۳۴۳/۱، باب الخطاء والنسیان فی العتاقة، کتاب العتق، حدیث نمبر: ۲۵۲۸، ومسلم شریف: ۷۸/۱، باب بیان الوسوسة، رقم الحدیث: ۱۲۷، عالمی حدیث نمبر: ۶۳۔

حل لغات: تجاوز واحد مذکر غائب باب تفاعل عن الذنب، گناہ پر گرفت نہ کرنا، درگذر کرنا، وسوست، وسوس الشیطان الیه وله فی صدره، وسوسةً (فعللۃ) شیطان کا کسی کے دل میں برا اور غلط خیال پیدا کرنا، نیکی سے ہٹا کر بدی پر ابھارنا، ورغلانا۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے میری امت سے ان وسوسوں کو معاف فرمادیا، جو ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، جب تک وہ ان وسوسوں کے مطابق عمل نہ

کریں، یا ان کو زبان پر نہ لائیں۔

تشریح: تتکلم کا عطف تعمل پر ہے، یہ لم کے ذریعہ سے مجزوم ہے۔

صدورھا رفع کے ساتھ ہے اور یہ جمع ہے اور اگر مفرد ہے تو بھی معنی میں جمع ہی کے ہے۔

صدورھا میں ھا ضمیر لوٹیگی امۃ کی طرف۔

ایک روایت میں صدورھا منصوب ہے۔

تجاوز عن امتی: [معاف کر چکا ہے اللہ تعالیٰ میری امت سے]

ماوسوست به صدورھا: [وہ چیزیں دلوں میں جن کا وسوسہ آئے]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اس کو نہ کرے یا اگر کہنے کی بات ہو تو اس کو نہ کہے یہ اس امت سے معاف کر دیا گیا، دوسری امتوں سے معاف نہیں تھا۔

وسوسہ کے اقسام

وسوسہ کے پانچ مراتب ہیں:

(۱)...... **ھاجس:** کہ وسوسہ آتے ہی گذر جائے، ٹھہرے نہیں۔

(۲)...... **خاطر:** کہ بار بار آئے اور چلا جائے مگر فعل وعدم فعل کی طرف بالکل متوجہ نہ کرے۔

(۳)...... **حدیث النفس:** کہ وسوسہ آکر فعل وعدم فعل کی طرف متوجہ کر دے مگر بغیر ترجیح احدھما علی الآخر.

(۴)...... **ھم:** کہ جانب فعل کو راجح کر دے مگر وہ رجحان قوی نہ ہو بلکہ کمزور ہو۔

(۵)...... **عزم:**[۱] کہ وسوسہ آکر جانب فعل کو راجح کر دیا اور اس پر عزم صمیم ہو گیا اور ہر قسم کے

---

[۱] اگر چھوڑ دے وہ اس کو اللہ کے خوف سے تو اس کے لئے ایک نیک لکھی جائے گی چونکہ اس کا ارادہ برائی کا تھا اور اس برائی سے رکجانا یہ نفس امارہ کے ساتھ مجاہدہ ہے، تو یہ ایسی نیکی ہے جو برائی پر غالب آگئی اور اگر اس کو ترک کرے کسی عارض کی وجہ سے یا عدم حصول کی وجہ سے وہ چھوٹ جائے..... (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسباب بھی مہیا کر لئے۔صرف موانع کی بناء پر وجود میں نہ لا سکا۔ان میں سے پہلے تینوں تمام امتوں کے لئے معاف ہیں اور آخری قسم پر تمام امتوں کا مواخذہ کیا جائے گا۔لیکن اسباب مہیا ہونے کے بعد خوف خداوندی کی بناء پر باز رہ گیا تو ثواب ملے گا۔اور چوتھی قسم پہلی امتوں کیلئے معاف نہیں ہے صرف امت محمدیہ کیلئے معاف ہے۔ تو حدیث مذکور میں یہی چوتھی قسم مراد ہے تا کہ امت محمدیہ کی خصوصیت ثابت ہو۔

احکام

پہلی تین قسموں پر نہ ثواب ہے نہ عقاب یعنی اگر یہ خیالات اچھے ہوئے تو ثواب نہیں ہوگا۔برے ہوئے تو عقاب نہیں ہوگا۔ثواب وعقاب کا تعلق ان باتوں سے ہوتا ہے جو آدمی کے اختیار سے ہوں،غیر اختیاری چیز پر نہ ثواب ہے نہ عقاب اور یہ تینوں درجے بالکل غیر اختیاری ہیں۔

هَمّ: اگر خیر کا ہو تو کچھ ثواب مل جائے گا اور اگر شر کا ہو تو عقاب نہیں ہوگا،بالاتفاق **هَمّ** پر کوئی مواخذہ نہیں۔

عزم: اگر خیر کا ہوا تو اس پر ثواب ہے اگر اس کام کو نہ بھی کر سکا تو ثواب عزم کامل ہی جائے گا۔اور اگر اس کام کو کر بھی لیا تو کرنے کا ثواب الگ ہوگا۔عزم شر پر مواخذہ نہیں۔البتہ جب اس فعل شر کا ارتکاب کرے گا تب مواخذہ ہوگا۔لیکن محققین کا مختار قول یہ ہے کہ عزم شر پر بھی مواخذہ ہے۔لیکن عزم شر پر عزم ہی کا مواخذہ ہوگا۔اتنا مواخذہ نہیں

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)۔۔۔تب بھی اس کی کوشش اور پختہ ارادہ کی وجہ سے اس کے لئے ایک برائی لکھی جائے گی اور دلیل اس پر وہ صحیح حدیث شریف ہے جو اپنی صحت پر متفق علیہ ہے۔"اذا التقی المسلمان بسیفھما فالقاتل والمقتول فی النار قیل یا رسول اللہ فما بال المقتول قال انہ کان حریصا علی قتل صاحبہ" یہ حدیث شریف صریح ہے کہ وہ شخص صرف پختہ ارادہ اور نیت کی وجہ سے جہنم میں جائے گا،اگر چہ وہ اس شخص کو قتل نہیں کر سکا اور خود ظلماً قتل کر دیا گیا۔

ہوگا جتنا فعل شر پر ہوتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عزمِ شر کے بعد اس شر کو کر بھی لیا جائے تو اس فعل کا مواخذہ زیادہ ہے، لیکن اگر صرف عزم ہی کیا تھا فعل نہیں ہوا تو پھر عزم پر مواخذہ ہوگا۔ مگر یہ مؤاخذہ کے مؤاخذہ سے کم ہوگا۔

جو حضرات عزمِ شر پر مواخذہ کے قائل ہیں ان کا آپس میں اختلاف ہوا ہے کہ اس مؤاخذہ کی نوعیت کیا ہوگی۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ ایسے عزائم کی سزا مصائب کی شکل میں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آخرت میں مؤاخذہ ہوگا، لیکن عتاب کی صورت میں ہوگا۔ (عقاب) عذاب کی صورت میں نہیں۔ اور بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ عزائم شر پر آخرت میں عذاب بالنار بھی ہوسکتا ہے، کسی شاعر نے خیالات کی ان پانچ قسموں اور ان کے حکموں کو نظم کردیا ہے: ؎

مَرَاتِبُ الْقَصْدِ خَمْسٌ هَاجِسٌ ذَكَرُوْا فَخَاطِرٌ فَحَدِيْثُ النَّفْسِ فَاسْتَمِعَا
يَلِيْهِ هَمٌّ فَعَزْمٌ كُلُّهَا رُفِعَتْ سِوَى الْاَخِيْرِ فَفِيْهِ الْاَخْذُ قَدْ وَقَعَا

عزائم قلبیہ کے درجات

عزائم قلبیہ کے تین درجے ہیں۔

(۱)...... وہ عزائم قلبیہ جن کا تعلق عقائد سے ہے جیسے اعتقاد توحید، اعتقاد رسالت، اعتقاد ختم نبوت وغیرہ وغیرہ۔ یہ اچھے عزائم ہیں، اعتقاد کفر اعتقاد شرک یا دوسرے غلط عقائد اور نظریات برے عزائم ہیں۔ ان کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ ایسے اچھے عزائم پر ثواب ہے اور برے عزائم و عقائد پر عقاب ہے۔

(۲)...... دوسرا درجہ یہ ہے وہ عزائم جن کا تعلق اخلاق حمیدہ یا اخلاق رذیلہ سے ہے۔ اخلاق حمیدہ کی مثالیں جیسے صبر، شکر، فکر آخرت، توکل، تفویض، رضا بر قضا، محبت حق، تواضع وغیرہ وغیرہ۔ ان پر بالاتفاق ثواب ہے، اس قسم کے برے عزائم اور برے اخلاق کی

مثالیں کبر، عجب (خود پسندی) حسد بغض وغیرہ وغیرہ۔ان پر بالا تفاق عقاب ہے۔

(۳)......تیسرا درجہ وہ عزائم جن کا تعلق افعال جوارح سے ہے، یہ عزم کرتا ہے کہ فلاں عضو سے میں یہ کام کروں گا یا نہیں کروں گا؟ ان پر مواخذہ ہوگا یا نہیں؟ اس میں بعض کے نزدیک مواخذہ ہے، عذاب بالنار کی شکل میں، بعض کے نزدیک عقاب کی شکل میں بعض کے نزدیک مصائب کی شکل میں۔

اس عنوان کا مقصد محل خلاف کی تعیین کرنا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ وہ عزائم جو عقائد سے متعلق ہیں ان پر بالا جماع اجر یا وزر ہوگا، وہ عزائم جو ملکات نفسانیہ یا اخلاق کے قبیل سے ہیں ان پر بھی بالا تفاق اجر و وزر ہوگا، اختلاف صرف تیسری قسم میں ہے، جوارح سے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا عزم اگر اچھے کام کا عزم ہے تو بالا تفاق ثواب ہے، اگر برے کام کا عزم ہے تو دو روایتیں ہیں، راجح اور مختار یہ ہے کہ مواخذہ ہوگا، کسی نہ کسی شکل میں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ عزائم شر پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، انہوں نے اپنی تائید میں کچھ روایات پیش کی ہیں، بعض روایتوں سے واقعی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عزم شر پر مواخذہ نہیں ہوگا، دوسرے فریق کی طرف سے ایسی روایات کے دو جوابات دیئے گئے ہیں۔

(۱)......جن روایتوں میں آتا ہے کہ ارادہ معصیت (گناہ) پر مواخذہ نہیں وہاں ارادہ سے مراد درجۂ ہم ہے، اور ہم پر واقعی مواخذہ نہیں۔

(۲)......اگر یہ کسی روایت سے ثابت ہو جائے کہ عزم پر مواخذہ نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ عزم پر اتنا مواخذہ نہیں جتنا فعل پر ہوتا ہے، عزم شر پر عزم ہی کا مواخذہ ہوگا، فعل شر والا مواخذہ نہیں ہوگا۔

وساوس کا حکم

غیر اختیاری چیزوں پر شریعت میں مواخذہ نہیں۔جو خیالات از خود دل میں آتے ہیں،

ان کو خود نہیں لایا اور نہ آنے پر ان کی مہمانی کی ہے تو خواہ کتنے ہی برے خیالات کیوں نہ ہوں ان پر کوئی مواخذہ نہیں۔ اسکی تصریح احادیث میں موجود ہے، بلکہ انکے آنے کی وجہ سے جو کوفت ہوئی ہے اس پر اجر ملنے کی امید ہے۔ اسلئے جو وساوس از خود آتے ہیں خواہ کتنے ہی گندے ہوں اس سے مومن کا کوئی نقصان نہیں، نہ یہ کمال کے منافی ہیں، بلکہ امید اجر ہے، جب ہر کانٹا چبھنے پر مومن کو اجر ملتا ہے تو ہجوم وساوس سے جو تکلیف ہوئی اس کا اجر ضرور ملے گا، پس وساوس میں مضرت ہے ہی نہیں، بلکہ منفعت کی امید ہے، تو پھر آدمی کیوں پریشان ہو۔

البتہ خیالات کو خود لانا برا ہے، یہ اختیاری ہے، اس پر مواخذہ ہو سکتا ہے، ایسے ہی خیال آئے تو خود ہی تھے لیکن اس نے مہمانی شروع کردی جس کا مطلب یہ ہے کہ اختیار سے ان کو سوچ کر آگے بڑھانا شروع کردیا، یہ اختیاری معاملہ ہے اس پر گرفت ہو سکتی ہے، خلاصہ یہ کہ غیر اختیاری پر مواخذہ نہیں اختیاری پر مواخذہ ہے، وساوس کا آنا غیر اختیاری ہے، لانا اختیاری ہے، آنے پر مہمانی کرنا بھی اختیاری ہے۔ وساوس کی غیر اختیاری آمد پر بالکل پریشان نہ ہونا چاہئے۔ البتہ اختیاری آورد سے گریز کرنا چاہئے۔

علاج وساوس

وساوس کے علاج مشائخ نے مختلف لکھے ہیں، اصل یہ ہے کہ ہر شخص کا مزاج جدا ہوتا ہے، اس لئے مزاج کے بدلنے سے علاج بھی بدل سکتا ہے، ایسے موقع پر اپنے شیخ کی طرف رجوع کرنا چاہئے، وہ حسب مزاج علاج تجویز کردیں گے۔

لیکن آسان اور عام علاج جو نصوص سے بھی سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی طرف التفات ہی نہ کیا جائے ان کو دفع کرنے کے ارادے سے بھی ان کی طرف التفات نہ کیا جائے، بغرض دفع ان کی طرف التفات کرنا یہ بھی تو ایک التفات ہے، ان کو اہمیت تو دے دی،

حالانکہ یہ اہمیت کے قابل نہ تھے، اور التفات نہ کرنے کی آسان صورت یہ ہے کہ التفات کسی اور طرف پھیر لیا جائے، جب التفات اور طرف ہو جائے گا تو ادھر سے خود ہٹ جائے گا۔
"لان النفس لاتتوجه الی شیئین فی آن واحد" (اشرف التوضیح)

وسوسوں کو برا سمجھنا ایمان کی دلیل ہے

﴿۵۸﴾ وَعَنْهُ قَالَ جَاءَ نَاسٌ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلُوْهُ اِنَّا نَجِدُ فِيْ اَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ اَحَدُنَا اَنْ يَتَكَلَّمَ بِهٖ قَالَ اَوَ قَدْ وَجَدْتُمُوْهُ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ ذَاكَ صَرِيْحُ الْاِيْمَانِ۔ (رواه مسلم)

حواله: مسلم شریف:۷۹/۱، باب بیان الوسوسة، كتاب الايمان، رقم الحديث: ۱۳۲، عالمی حدیث نمبر: ۶۴۔

حل لغات: تعاظم، تفاعل، الامر فلاناً، کسی کے لئے کوئی کام دشوار و سنگین ہونا، صريح، ج صُرَحاءُ، صاف، واضح۔

ترجمه: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند اصحاب بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے، اور انہوں نے عرض کیا کہ ہم اپنے دلوں میں کچھ ایسی باتیں پاتے ہیں، جن کا زبان پر لانا بھی ہم نہایت برا سمجھتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا تم واقعی ایسا سمجھتے ہو؟" حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے عرض کیا جی ہاں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "یہ تو کھلا ہوا ایمان ہے۔"

تشریح: انّا نجد فی انفسنا:[۱] اگر یہ اِنّا نجد ہے تو اس وقت مفعول ہوگا قائلین محذوف کا اور اگر انّا نجد ہے تو پھر یہ مفعول ثانی ہے سالوہ فعل کا۔

پس انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ہم اپنے نفسوں میں ایسی باتوں کو پاتے ہیں جن کو بتلانا اور بیان کرنا ہم میں سے ہر ایک بہت بڑا سمجھتا ہے ہمارے دلوں میں خطرات ووساوس آتے رہتے ہیں اور چونکہ ایمان بھی دل میں ہوتا ہے تو انہیں یہ خدشہ ہوا کہ کہیں یہ خطرات ایمان پر حملہ نہ کردیں۔ ڈاکوؤں سے خطرہ تو اسے ہوتا ہے جس کے پاس روپے پیسے ہوں تجوریاں ہوں اور جس کے پاس کچھ نہ ہو فقیر ہو اس کو ڈاکوؤں سے کیا خطرہ۔

تو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے پاس ایمان کی تجوریاں تھیں تو انہیں خطرہ ہوا کہ کہیں یہ خطرات ایمان پر حملہ نہ کردیں اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس آکر عرض کیا کہ حضرت ہمارے دلوں میں ایسے خطرات آتے ہیں جن کو بیان کرنا ہم میں سے ہر ایک بہت بڑی بات سمجھتا ہے یعنی ہم ان کو زبان پر لانا بھی بھاری سمجھتے ہیں۔

احصل لکم ذلک الوسوسۃ وقد وجدتموہ قبیحا: حضرت نبی کریم صلی اللہ عیہ وسلم نے فرمایا کیا تم نے انہیں پایا ہے کہ خطرات دل میں گذرے ہیں۔

او قد وجدتموہ: میں او حرف استفہام ہے [کہ آیا تم نے انہیں پایا] اور اگر ہمزہ استفہامیہ اور واو عاطفہ ہے تو معطوف محذوف ہوگا اور پوری عبارت "احصلتم و وجدتموہ" ہے [یعنی کیا تم نے ان کو پایا] "احصل لکم ذلک الوسوسہ وقد وجدتموہ قبیحا" کیا تم نے ان وساوس کو پایا، کیا یہ تمہیں حاصل ہوگئے۔

یعنی کیا تم نے اس برے خیال کو حاصل کرلیا اور اس کو مذموم اور بیکار بھی سمجھ لیا تو یہ تو خالص ایمان ہے اس لئے کہ کافر کا دل جو اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے مشابہ قرار دیتا ہے وہ اس پر مصر

---

[۱] یعنی ہمارے دلوں میں ایسی بری چیزوں کا گذر رہتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا یا وہ کیسا ہے کس ہیئت کا ہے اس کی پیدائش کس چیز سے ہوئی ہے وغیرہ۔ (مرقاۃ: ۱۳۵/۱، باب الوسوسۃ)

ہے جما ہوا ہے اور اس کو اچھا بھی سمجھ رہا ہے اور جو اس کو برا سمجھے اور اس کو بیان کرنا بھی بہت بڑا عیب جانتا ہو وہ تو مومن صادق ہے۔

وسوسہ کا آنا یہ ایمان کی نشانی ہے اس لئے کہ چور خالی گھر میں نہیں آیا کرتا اور اسی کو روایت کیا گیا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے "ان الصلوۃ التی لا وسوسۃ فیھا انما ھی صلوۃ الیھود والنصاریٰ" (رواہ مسلم)[یعنی جس نماز میں وسوسہ نہیں آیا وہ تو یہود ونصاریٰ کی نماز ہے](مرقاۃ:۱۳۶/۱، باب الوسوسۃ)

کیونکہ ان چیزوں کے بطلان کا اعتقاد خشیت خداوندی کی بنا پر ہے اور یہی خالص ایمان ہے۔

اس مقام میں وجدتموہ کی ہ ضمیر کے مرجع اور ذاک کے مشار الیہ میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ ضمیر کا مرجع اور ذلک کا مشار الیہ "یتعاظم" یعنی ان وساوس کو گراں سمجھنا ہو، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کیا واقعی تم ان وساوس کو گراں سمجھتے ہو یہ گراں سمجھنا تو صریح ایمان ہے، اس لئے کہ اس گرانی کا منشاء اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شدید محبت ہے، کہ ان کی شان کے خلاف غیر اختیاری وساوس بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ 'ہ' ضمیر کا مرجع اور ذاک کا مشار الیہ وساوس ہوں یعنی کیا واقعی تم کو وساوس آنے لگے ہیں، یہ وساوس کا آنا صریح ایمان ہے اس لئے کہ وساوس شیطان لاتا ہے، اور دشمن وہیں نقب لگاتا ہے جہاں سرمایہ ہو، وساوس آنے سے معلوم ہوا کہ تمہارا دل دولت ایمان سے مالا مال ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کاملین کو بھی وساوس آسکتے ہیں، وساوس کا آنا کسی نقص کی علامت نہیں، بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایسے وساوس آتے تھے، فرماتے ہیں کہ ہم جل کر کوئلہ ہونا تو پسند کر سکتے ہیں، ان وساوس کو زبان پر نہیں لا سکتے۔

اللہ کی پناہ طلب کرو

﴿۵۹﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْتِيْ الشَّيْطَانُ اَحَدَكُمْ فَيَقُوْلُ مَنْ خَلَقَ كَذَا مَنْ خَلَقَ كَذَا حَتّٰى يَقُوْلَ مَنْ خَلَقَ رَبَّكَ فَإِذَا بَلَغَهٗ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَلْيَنْتَهِ۔ (متفق علیه)

حواله: بخاری شریف:۴۶۳/۱،باب صفة ابلیس وجنوده، کتاب بدء الخلق، حدیث نمبر:۳۲۷۶،مسلم شریف:۷۹/۱،باب بیان الوسوسة، کتاب الایمان، رقم الحدیث: ۱۳۲ ، عالمی حدیث نمبر:۶۵۔

حل لغات: بلغ (ن)بلوغاً پہنچنا،فلیستعذ، صیغہ امر،استعاذبه، افتعال سے، پناہ لینا، پناہ چاہنا۔

ترجمه: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”تم میں سے بعض آدمیوں کے پاس شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں چیز کس نے پیدا کی؟ فلاں چیز کس نے پیدا کی؟ یہاں تک کہ وہ کہتا ہے کہ تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا ہے؟ جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے تو اس کو چاہئے کہ اللہ سے پناہ مانگے اور اس سلسلے کو ختم کردے۔“

تشریح: انہیں (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کے پاس شیطان آتا ہے۔

(اور گھٹنے ٹیک کر دل کے پاس بیٹھ جاتا ہے) جب وہ ذکر کرتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب غافل ہوتا ہے تو وہ دل میں وسوسے ڈالنے شروع کردیتا ہے ادھر ادھر کی باتیں یاد

دالتا ہے جو اس کو نیکی سے دور رکھیں، اگر ایسا ہو تو اس کو شیطان سمجھے، چاہے وہ انسانی شکل میں ہو اس کی بات ہرگز مت مانیو۔ ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست

پس بہر دستے نباید داد دست

شیطان انسانی شکل میں بھی آ جاتا ہے چاہے وہ کتنے ہی لمبے لمبے کرتے پہنے ہوئے ہو اس کی بات نہ مانو یہ بڑا اچا لو ہے بڑا سونگھتا پھرتا ہے۔ جہاں اس کا کام چلتا ہے وہیں بیٹھ جاتا ہے اس کا علم اس کی ذات ذریت بہت بڑی ہے سب کو کام میں لگا لیتا ہے اور پھر یہ آ کر باتیں بناتا ہے کہتا ہے:

من خلق کذا:[1] اور تمہید سے بلاغت کے ساتھ بات کرتا ہے۔ کیونکہ اگر اول مرتبہ ہی میں یہ اگلی بات کہتا تو کوئی نہ مانتا اسی لئے یہ پہلے یوں کہتا ہے کہ اس کو کس نے پیدا کیا۔

من خلق کذا و کذا: کذا اسم اشارہ ہے جو مشار الیہ کو چاہتا ہے جس کا مشار الیہ مظاہر قدرت ہیں۔

آسمان کو کس نے پیدا کیا، زمین کو کس نے پیدا کیا، غلوں کو کس نے پیدا کیا، پھلوں کو کس نے پیدا کیا، تجھ کو کس نے پیدا کیا، تیرے باپ کو کس نے پیدا کیا، اور انسان ان سب کے جواب میں کہتا ہے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔

اور جب یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ ہر چیز کے لئے ایک پیدا کرنے والا ہوتا ہے تو اب کہتا ہے کہ اچھا اللہ کو کس نے پیدا کیا۔

جب آدمی اس مقام پر پہنچ جائے، تو وہ سمجھ لے کہ اب اس پر شیطان غالب آ گیا ہے اس کو چاہئے کہ شیطان کے اس زور سے مکا مارے کہ وہ ختم ہو جائے، جیسے اگر کوئی لڑائی میں

---

[1] اس سے شیطان کا مقصد انسان کو کفریہ عقائد میں مبتلا کرنا ہوتا ہے۔ اس طریقہ پر اور بھی بہت سے سوالات کرتا ہے۔(مرقاۃ: ۱/۱۳۶، باب الوسوسۃ)

ماں کا نام لیتا ہے تو ہم کو اس پر غصہ آ جاتا ہے اور جوتا نکال کر اس پر پل پڑتے ہیں کہ اچھا تو ہماری ماں کا نام لیتا ہے۔

جب وہ اللہ کا نام لے تو اعوذ باللہ کا کوڑا ایسی زور سے مارو کہ وہ بھاگ جائے بندہ کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ جائے۔

پس اعوذ باللہ کو ڈھال بنا کر اللہ کی پناہ میں آ جائے جس سے شیطان کا شر اور مکر ختم ہو سکے چونکہ جب اللہ کا لطف اور مہربانی بندہ کے شامل حال ہو تو بندہ نہ تو شیطان سے کمزور ہے اور نہ ہی اس سے ذلیل ہے شیطان مشابہ ہے اس کتے کے جو دروازہ پر کھڑا ہوا ہو اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "ان کید الشیطن کان ضعیفاً" [اللہ تعالیٰ کی طاقت وقوت کی بہ نسبت شیطان کی قوت بہت ہی کمزور ہے] (مرقاۃ: ۱/۱۳۶، باب الوسوسۃ)

بحث کی ممانعت

دیکھو حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحث کرنے کو نہیں فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یوں بھی تو فرما سکتے تھے کہ جب وہ یوں کہے کہ اللہ کو کس نے پیدا کیا تو اس کو جواب میں کہہ دے کہ ھو الخالق لیس له بخالق. کہ اللہ کے لئے کوئی پیدا کرنے والا نہیں۔ خالق کو پیدا کرنیوالا کوئی نہیں ہوتا۔

اور پھر تم دلیل چلاتے کہ اگر ایسا نہ ہو تو خالق کے واسطے دوسرا خالق اور پھر اس کے واسطے تیسرا خالق لازم آئیگا اور یہ تسلسل باطل ہے اور پھر وہ دلیل پیش کرتا تو آپ کو الجھا دیتا کیونکہ وہ بڑا مکار اور بڑا چالاک ہے۔ امام رازیؒ نے بھی سو دلیلیں یاد کر لی تھیں مگر اس نے ایک ایک کر کے سب توڑ ڈالیں۔

اسی طرح جب یہ انسان کے پاس آتا ہے اور اس وقت یہ کہتا ہے کہ اللہ موجود

ولکل موجود موجد. فللّٰہ موجد ، یا"اللہ شیٔ ولکل شیٔ خالق. فللّٰہ خالق،

تو یہ شیطان اس طرح کی حجت بازی کرتا ہےتو اس سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اللہ کی پناہ چاہ لو اس کے بغیر چارہ کار نہیں کسی کام میں بلکہ ذکر اللہ میں مشغول ہو جاؤ اس لئے کہ شیطان جب انسان کو غافل پاتا ہےتب ہی وسوسے ڈالنا شروع کرتا ہے۔

اہل باطل سے مناظرہ

فائدہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ گمراہ اور باطل فرقوں کے ساتھ عامی انسان کو بحث ومباحثہ سے پرہیز کرنا چاہئے، اور جب کوئی بحث ومباحثہ میں الجھانا چاہے آدمی کو چاہئے کہ ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے، مگر یہ حکم عوام کے لئے ہے، حضرات علماء کے لئے نہیں وہ حالات کو زیادہ سمجھتے ہیں وہ اسی کے مطابق عمل کریں گے۔

وسوسے کا علاج

﴿۶۰﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُ النَّاسُ يَتَسَاءَلُونَ حَتّٰى يُقَالَ هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ فَمَنْ وَجَدَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَلْيَقُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ۔ (متفق علیه)

نوٹ: بخاری شریف میں اس سند کے ساتھ یہ روایت موجود نہیں ہے۔البتہ الفاظ کے ذرا بہت تغیر وتبدل کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے، حوالے میں اسی روایت کی نشاندہی کی جارہی ہے۔

حوالہ: بخاری شریف:۲/۱۰۸۳،باب مایکرہ من کثرۃ السوال، کتاب الاعتصام بالکتاب، حدیث نمبر:۷۲۹۶، مسلم شریف:۱/۷۹،باب بیان الوسوسۃ، کتاب الایمان، رقم الحدیث: ۱۳۴، عالمی حدیث نمبر:۶۶۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لوگ برابر ایک دوسرے سے سوال کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ یہ بات کہی جائے گی کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا تو اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا؟ جس شخص کے سامنے یہ بات آئے تو اس کو چاہئے کہ وہ یہ کہے کہ ایمان لایا میں اللہ پر اور اس کے رسولوں پر''۔

تشریح: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ آپس میں ہمیشہ سوال کرتے رہتے ہیں[1] کہ تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا یعنی یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، سب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ اس کے بعد پھر یہ فاسد مقدمہ پیش کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا۔ جب یہ خیال اور سوال دل میں پیدا ہو تو اس وقت دلیل بیان نہ کرو اس وقت دلیلوں سے کام نہیں چلے گا۔ امام رازی عقلی اور منطقی دلیلوں سے کام نہ لے سکے اس لئے بس یہ کہہ دے کہ میں تو بغیر دلیل کے اللہ تعالیٰ کو ایک مانتا ہوں۔ کہ میں اللہ تعالیٰ پر اس کے سب رسولوں اور کتابوں پر ایمان لایا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ کی اور اللہ تعالیٰ سے پہلی بات تو جب بتلاتا جب میں اللہ تعالیٰ سے پہلے پیدا ہوا ہوتا۔

مطلب یہ ہے کہ بحث ومباحثہ میں نہ پڑے اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے۔

---

[1] ممکن ہے اس طرح کا سوال انسان اور شیطان کے درمیان ہو یا نفس اور انسان کے درمیان ہو یا دو لوگوں کے درمیان ہو یعنی اس طرح کے سوالات دونوں کے درمیان ہوتے رہیں گے۔

ھذا خلق اللہ الخلق: کہا گیا ہے کہ ھذا کا مشار الیہ المقول محذوف ہے اور اس کا عطف بیان خلق اللہ الخلق ہے ھذا اپنے عطف بیان کے ساتھ یقال کا نائب فاعل ہے۔(مرقاۃ:۱/۱۳۷، باب الوسوسۃ)

ہر انسان کے ساتھ دو مؤکل ہوتے ہیں

﴿۶۱﴾ وَعَنْ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلیَّ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْکُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلاَّ وَقَدْ وُکِّلَ بِہٖ قَرِیْنُہٗ مِنَ الْجِنِّ وَقَرِیْنُہٗ مِنَ الْمَلَائِکَۃِ قَالُوْا وَاِیَّاکَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ وَاِیَّایَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَعَانَنِیْ عَلَیْہِ فَأَسْلَمَ فَلَا یَأْمُرُنِیْ اِلاَّ بِخَیْرٍ۔ (رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۳۷۶، باب تحریش الشیاطین الخ، کتاب صفات المنافقین، رقم الحدیث: ۲۸۱۴، عالمی حدیث نمبر: ۶۷۔

حل لغات: وُکِّلَ، مجہول، وَکَّلہ، تفعیل سے، اعتماد کی بناء پر کسی کو اپنے کام کا مختار بنانا، مقرر کرنا۔ قَرِیْنٌ، ساتھی، جمع قُرَنَاءَ. اَعَانَنِیْ، اعانہ علی الشی، افعال سے، مدد دینا۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس کے ساتھ ایک ہمزاد جن میں سے اور ایک ہمزاد فرشتوں میں سے مقرر نہ کر دیا گیا ہو“ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے عرض کیا کہ ”اے اللہ کے رسول کیا آپ کے ساتھ بھی؟“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”ہاں میرے ساتھ بھی، البتہ اللہ تعالیٰ نے اس پر مجھے قابو عطا فرمایا ہے، چنانچہ وہ میرا تابع ہو گیا ہے، اب وہ مجھے صرف بھلائی کا مشورہ دیتا ہے۔“

تشریح: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ دو ساتھی مقرر فرما رکھے ہیں، ایک فرشتوں میں سے اور ایک جنات میں سے، جو فرشتوں میں سے ہے وہ بھلائی کا مشورہ دیتا ہے، اور جو جنات میں سے ہے وہ برائی کا حکم کرتا ہے، جو بھلائی کا حکم کرتا ہے

اس کا نام ملہم اور جو برائی کا حکم کرتا ہے اس کا نام وسواس ہے۔

اشکال مع جواب

اشکال اول: یہاں ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ آپ نے استغراق کے ساتھ فرمایا: مامن[1] احد منکم: تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس بھی دو قرین ہوں گے ایک شیطان اور ایک فرشتہ تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ کا ساتھی شیطان ہو[2]۔

جواب: جس طرح بیمار انسان جو کچھ مقوی غذا کھاتا ہے تو اس سے اس کی بیماری بڑھ جاتی ہے لیکن اسی غذا کو اگر کوئی تندرست آدمی کھاتا ہے تو اس کو وہ مفید ہوتی ہے اور اس کی صحت و تندرستی میں اضافہ ہوتا ہے[3]۔

اور چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم روحانی صحت کے اعلی معیار پر تھے اس وجہ سے قرین جن جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا اس سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ بلکہ وہ آپ کا مطیع اور فرمانبردار ہو گیا تھا۔ اور آپ کے پاس خیر کی ہی بات کیا کرتا تھا۔

بعض مشائخ سے منقول ہے جنی ساتھی کبھی خیر کی دعوت دیتا ہے لیکن اس کا ارادہ اس

---

[1] ما نافیہ ہے اور من احد میں من زائدہ ہے جو استغراق یعنی تمام افراد کی نفی اور منکم میں من تبعیضیہ ہے اصل عبارت اس طرح ہے: ما احد منکم۔

[2] قرینۃ من الجن: یعنی جنات میں سے ایک ساتھی ہوتا ہے جو اس کو شر کا حکم کرتا ہے اور اس کا نام وسواس ہے اور یہ ابلیس کا بچہ ہے جس کی ولادت اسی وقت ہوتی ہے جس وقت انسان کے بچہ کی ولادت ہوتی ہے۔ اور ایک ساتھی فرشتوں میں سے ہوتا ہے۔ جو اس کو بھلائی کا حکم کرتا ہے اور اس کا نام ملہم ہے۔

(مرقاۃ: ۱۳۷/۱، باب الوسوسۃ)

[3] فاسلم: کہا گیا ہے یہ اسم تفضیل ہے اور مبتدا محذوف کی خبر ہے اور وہ انا ہے۔ اب اصل عبارت اس طرح ہوگی انا اسلم منکم اور یا مضارع ہے۔

دعوت سے شر کا ہوتا ہے اس طور پر کہ مفضول کی دعوت دیتا ہے اور افضل سے روکدیتا ہے یا اس طور پر خیر کی دعوت دیتا ہے کہ اس کو اس خیر کے ذریعہ کسی بڑے شر میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جیسے غرور، فخر، خود بینی وغیرہ۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے وہ معصیت اور گناہ جس کے بعد آدمی اپنے آپ کو ذلیل وحقیر سمجھنے لگے، بہتر ہے اس طاعت سے جس کے بعد آدمی غرور گھمنڈ اور تکبر میں مبتلا ہو جائے۔ (مرقاۃ:۱۳۸/۱، باب الوسوسة)

اشکال مع جواب

اشکال دوم: لیکن اس جواب پر پھر اشکال ہوتا ہے کہ شیطان ہو اور خیر کی بات کرے یہ کس طرح ممکن ہے یہ تو اجتماع ضدین ہے۔

جواب: اس کا یہ ہے کہ وہ تھا تو شیطان ہی مگر زبان سے خیر کی بات کیا کرتا تھا۔ گو دل میں شر چھپائے رکھتا ہو۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے شیطان ایسے تھے جو زبان سے خیر کی بات کرتے اور مسلمان بنے پھرتے تھے مگر تھے وہ حقیقت میں شیطان ہی آج بھی ایسا ہی حال ہے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے دل میں یہ ارادہ رکھتا ہو کہ میں مدرسہ کو ختم کردوں مگر وہ اس کے باوجود حضرت مہتمم صاحب کے پاس آکر یہی کہے گا کہ حضرت میں نے بھی ایک سیٹھ سے مدرسہ میں کمرہ بنوانے کے واسطے کہا تھا۔ حالانکہ وہ دل میں اس کے برعکس ارادہ رکھتا ہے مگر زبان سے یہی کہتا ہے ایسے ہی یہ قرین جن دل میں تو کفر وشر رکھتا تھا مگر زبان سے خیر کی بات کہتا تھا۔

فاسلم الخ: اس کو اگر اصلی اور حقیقی معنی ہی میں رکھیں کہ وہ مسلمان ہو گیا، حقیقۃ تو بھی کوئی اشکال نہیں، کیونکہ اس صورت میں یہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا معجزہ ہوگا کہ بطور معجزہ وہ مسلمان ہو گیا۔ فلا اشکال۔

شیطان انسان کے خون کے ساتھ دوڑتا ہے

﴿۶۲﴾ وَعَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ[1]۔ (متفق علیه)

حواله: بخاری شریف: ۱/۴۶۴، باب صفة ابلیس وجنوده، کتاب الانبیاء، حدیث نمبر: ۳۲۸۱، مسلم شریف: ۲/۲۱۷، باب بیان انه یستحب لمن رای الخ، کتاب السلام، رقم الحدیث: ۲۴.

حل لغات: جری الفرسُ ونحوه جَرْیاً (ض) دوڑنا۔

ترجمه: حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انسان کے جسم میں شیطان اس طرح دوڑتا رہتا ہے، جس طرح رگوں میں خون گردش کرتا رہتا ہے۔''

تشریح: من الانسان: میں من فی کے معنی میں ہے یعنی انسان کے اندر شیطان گھومتا ہے جیسے خون گھومتا ہے یعنی جس طرح خون کے گھومنے کا انسان کو احساس نہیں

---

[1] مجری الدم: یا تو یہ مصدر میمی ہے۔ یعنی اس کا دوڑنا محسوس نہیں ہوتا جس طرح اعضاء کے اندر خون کے دوڑنے میں احساس نہیں ہوتا ہے۔ گویا کہ شیطان کے مکر اور اس کے وسوسوں کا جاری ہونا انسان کے بدن میں یہ مشابہ ہے خون کے جاری ہونے کے۔
یا اسم ظرف مکان ہے یجری کا اور من الانسان حال ہے اس سے اور اصل عبارت اس طرح ہے: یجری فی الانسان مجری الدم کائنا من الانسان. یا بدل البعض ہے الانسان سے، اصل عبارت یہ ہے: یجری فی الانسان حیث یجری فیه الدم. اور معنی یہ ہوں گے کہ [شیطان انسان سے جدا نہیں ہوتا خون کے گردش کرنے کی طرح اس کی رگوں میں جب تک انسان زندہ ہے۔ (مرقاة: ۱/۱۳۸، باب الوسوسة)
اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دوڑنا حقیقت ہو اسلئے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ (الطیبی: ۱/۲۲۱، باب الوسوسة)

ہوتا اسی طرح شیطان کے گھومنے کا بھی احساس نہیں ہوتا۔

یامن الانسان میں من اپنے معنی ہی میں ہے مگر اس صورت میں ایک کلمہ محذوف ہوگا اور عبارت یوں ہوگی من کل فرد من الانسان.

صبح سے شام تک جو وساوس وخطرات آتے ہیں ان سب کا منشاوہ جریان شیطان ہی ہوتا ہے اور اس حدیث شریف کے بیان کرنے کا مقصد لوگوں کو ہوشیار کرنا ہے تا کہ وہ اس کے دام فریب سے بچنے کی احتیاط کریں۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی کو کہے کہ میاں تمہیں کچھ خبر بھی ہے۔ روزانہ چور تمہارے گھر کے چاروں طرف چکر لگاتے ہیں تو بتلائے اس صورت میں وہ شخص ان سے احتیاط اور حفاظت کریگا کہ نہیں؟

اسی طرح یہ حدیث شریف بھی بطور احتیاط ذکر کی گئی ہے یہ محض قصہ نہیں کہ بیان کردیا اور بس اس کا منشا یہ بتانا ہے کہ میں تمہارا سب سے بڑا خیر خواہ ہوں۔ اور شیطان تمہارا دشمن ہے۔ ہر وقت وہ تمہاری فکر میں ہے اس سے چوکنے رہنا کہ نہ جانے وہ کس وقت حملہ کردے۔ پس اگر ہم چوکنے ہوگئے تو ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر عمل کرلیا ورنہ نہیں۔

پس اس حدیث میں دو احتمال ہیں۔

(۱)...... یہ حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے کہ واقعی شیطان انسان کے اندر رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا ہے اس میں بھی کوئی اشکال نہیں۔

(۲)......دوسرا احتمال یہ ہے کہ حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ یہ غلبہ اور تسلط سے کنایہ ہے، یعنی جس طرح سے خون رگوں میں گردش کرتا ہے، اسی طرح شیطان ہر وقت انسان پر مسلط رہتا ہے، اس لئے اس سے ہر وقت ہوشیار اور چوکنے رہنے کی ضرورت ہے۔

یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:

(۱)...... شیطان مشغول ہے اور تو فارغ ہے۔

(۲)......وہ تجھے دیکھ رہا ہے اور تو اس کو نہیں دیکھ سکتا۔

(۳)......تو شیطان کو بھولا ہوا ہے، اس نے تجھ کو نہیں بھلایا۔

(۴)...... اور تیرا نفس تیرے خلاف شیطان کا معاون بنا ہوا ہے، اور تو بے فکر ہے۔

(الطیبی: ۲۲۱/۱، باب الوسوسۃ)

ولادت کے وقت بچوں کو شیطان تکلیف پہنچاتا ہے

﴿۶۳﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ بَنِیْ آدَمَ مَوْلُوْدٌ اِلَّا یَمَسُّهُ الشَّیْطَانُ حِیْنَ یُوْلَدُ فَیَسْتَهِلُّ صَارِخاً مِنْ مَسِّ الشَّیْطَانِ غَیْرَ مَرْیَمَ وَابْنِهَا۔ (متفق علیه)

حوالہ: بخاری شریف: ۴۸۸/۱، باب قوله تعالیٰ اذکر فی الکتاب مریم، کتاب الانبیاء، حدیث نمبر: ۳۴۳۱، مسلم شریف: ۲/۲۶۵، باب فضائل عیسیٰ، رقم الحدیث: ۲۳۶۶۔ عالمی حدیث: ۶۹۔

حل لغات: یَمَسُّه، مس الشیءَ، (س) مَسّاً چھونا، یستهلُّ مضارع، استهل الصبیء، باب استفعال سے، بچہ کا زور سے رونا چلانا، صارخاً صَرَخَ (ن) صُرَاخاً، زور زور سے رونا چیخنا۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’’انسان کا بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان اس کو ضرور چھوتا ہے جس کی وجہ سے وہ بچہ چیخ اٹھتا ہے، لیکن حضرت مریم علیہا السلام اور ان کے بیٹے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو نہیں چھوا۔‘‘

تشریح: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں ہے کوئی اولادِ آدم میں سے پیدا ہونے والا یعنی ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اس کو چھوتا ہے تو بچہ چلا کر روتا ہے جب شیطان اسے چھوتا ہے تو اسے بہت تکلیف ہوتی ہے اور اس کے پاس رونے کا ہتھیار ہی ہے صرف دو بچے اس سے مستثنیٰ ہیں ایک تو حضرت مریم علیہا السلام دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ ان دو کو شیطان نے نہیں چھوا ان پر اس کا قابو نہیں چلا۔[1]

مس شیطان سے حضرت مریم و عیسیٰ علیہما السلام کے محفوظ ہونے کی وجہ

وجہ یہ ہے کہ جس وقت حضرت مریم علیہا السلام پیٹ میں تھیں تو ان کی والدہ نے نذر مانی تھی کہ جو بچہ میرے پیٹ میں ہے میں اس کو بیت المقدس کی خدمت کے لئے چھوڑ آؤں گی اور گمان یہی تھا کہ بچہ یعنی لڑکا پیدا ہوگا مگر جس وقت پیدائش ہوئی تو دیکھا کہ یہ لڑکا نہیں لڑکی ہے تو اس وقت ان کی والدہ کی تمام تمناؤں پر پانی پھر گیا اور مایوسی کی حالت میں بول اٹھیں: "ربی انی وضعتها انثیٰ" [کہ اللہ یہ تو لڑکی ہوئی ہے] یعنی مجھے تو بڑی بڑی تمنائیں تھیں کہ یوں خدمت کریگا۔ مگر افسوس کہ یہ تو لڑکی پیدا ہوئی ہے۔

---

[1] ما من بنی آدم الا یمسه الشیطان: اسمیں اس بات کا احتمال ہے کہ ما لیس کے معنی میں ہو اور اسکا عمل خبر کے مقدم ہونے کی وجہ سے مبتدا پر باطل ہوگیا ہو اور الا لغو ہوگا اسلئے کہ استثنا مفرغ ہے اور مستثنیٰ حال ہے اس ضمیر سے جو ظرف کے اندر مستتر ہے یعنی ما وجد من بنی آدم مولود۔ (الطیبی: ۲۲۲/۱، باب الوسوسة)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "لیس الذکر کالانثی" [کہ لڑکی جیسا تو کوئی لڑکا نہیں ہو سکتا]
جنس رجل اگر چہ عمدہ ہوتی ہے جنس مرأۃ سے مگر بعض مرأۃ رجل سے اچھی ہوتی ہیں۔
اور نام رکھدیا مریم۔

مریم: عابدہ کو کہتے ہیں۔

اور مایوسی کی حالت میں دعا کی "انی اعیذھا بک وذریتھا من الشیطان الرجیم" [کہ اے اللہ میں اس کو اور اس کی ذریت کو تیری پناہ میں دیتی ہوں]

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور شیطان کا قابو ان کی اولاد پر نہ چل سکا، نہ حضرت مریم علیہا السلام پر چل سکا، نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر چل سکا، اور چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذریت ابھی نہیں ہوئی ہے بلکہ جب وہ قیامت کے قریب آئیں گے تو وہ شادی بھی کریں گے اور ان کے بچے بھی ہوں گے۔

پس جب بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان اس کو چھیڑتا ہے کہ دیکھوں قبضہ میں آئیگا یا نہیں کیونکہ بچہ کو اب تک کسی نے اس طرح چھویا نہیں ہے اس وجہ سے اس کو بڑی تکلیف ہوتی ہے جس طرح اگر کوئی عفیف عورت کو ہاتھ لگاتا ہے اور اسے تکلیف ہوتی ہے، اسی طرح اس بچہ کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور اگلے روز اس سے کم روتا ہے اور اس کے بعد پھر اور بھی کم شیطان جب اس کو چھوتا ہے تو معلوم کر لیتا ہے کہ یہ بچہ کس مزاج کا ہے اگر عقل مند ہوتا ہے تو اس کو عقلمندی سے سمجھاتا ہے اور اگر بیوقوف ہوتا ہے تو بغیر لگام کے اس پر سواری کرنے کو تیار ہوتا ہے۔

اور اس حدیث کو بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دیکھو شیطان تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔

شبہ: اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ شیطان حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ تمام بچوں کو چھوتا ہے تو کیا سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی شیطان نے چھوا ہے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوا ہے تو آنحضرت صلی

اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مفضول ہوئے اور حضرت عیسیٰ ومریم علیہما السلام افضل ہوئے، یعنی ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت ثابت ہوئی، جو واقعہ کے خلاف ہے۔

جواب اول: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام مخلوق پر مجموعی طور سے فضیلت حاصل ہے۔ اس لئے اگر کسی جزئی اعتبار سے کسی دوسرے کی فضیلت ثابت ہوتی ہو تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل نہیں ہوگا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کلی فضیلت حاصل ہے اور اس کو جزئی۔

جواب ثانی: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث پاک میں متکلم ہیں اور متکلم نہ مستثنیٰ میں عود کرتا ہے نہ مستثنیٰ منہ میں تو معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں میں سے کسی میں بھی نہ تھے۔ اس لئے حضرت مریم وعیسیٰ علیہما السلام کی فضیلت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ثابت نہیں ہوئی اور اس حدیث سے اس توجیہ کے اعتبار سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس شیطان سے محفوظ رہے ہیں۔ حتی جو قرین جن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتا تھا اس سے بھی محفوظ رہے۔ کیونکہ وہ مسلمان بنکر اور مطیع ومنقاد ہوکر آپ کے ساتھ رہا کرتا تھا۔

اشکال مع جواب

اس پر ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ مس شیطان تو عصمت کے منافی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ عصمت کے معنی ہیں گناہ سے محفوظ ہونا، پس گناہ تو عصمت کے منافی ہے، تکلیف پہونچنا عصمت کے منافی نہیں، کفار مکہ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کتنی ایذائیں پہونچائیں ان سے عصمت پر کوئی فرق نہیں آتا۔

بچوں کی حفاظت

فائدہ: حدیث پاک سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جب شیطان وقت ولادت سے ہی بچہ کے پیچھے پڑا رہتا ہے، اور اسے بہکانے اور گمراہ کرنے کی ہر تدبیر کرتا ہے، پس والدین کی ذمہ داری ہے کہ اپنے بچوں کی شیطانی فتنوں اور حربوں سے حفاظت کی اور ان کی تعلیم وتربیت کی پوری پوری کوشش کریں۔ فقط

شیطان کچوکا لگاتا ہے

﴿۶۴﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صِيَاحُ الْمَوْلُودِ حِيْنَ يَقَعُ نَزْغَةٌ مِنَ الشَّيْطَانِ۔ (متفق علیه)

حوالہ: مسلم شریف: ۲/۲۶۵، باب فضائل عیسیٰ، کتاب الفضائل، رقم الحدیث: ۲۳۶۷، عالمی حدیث نمبر: ۷۰۔

حل لغات: صِیَاح، صَاحَ (ض) صَیحاً، رونا شور کرنا۔ النزغة، نیزے وغیرہ کا چرکا، کچوکا، نزغ الشیطان، شیطان کا دل میں پیدا کیا ہوا وسوسہ، برا خیال۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ولادت کے وقت بچہ شیطان کے کچوکا لگانے کی وجہ سے روتا ہے۔''

تشریح: اس حدیث پاک کا حاصل اور مقصود بھی گذشتہ حدیث پاک کے مثل ہے۔ فقط

تفرقہ ڈالنا شیطان کا پسندیدہ مشغلہ

﴿۶۵﴾ وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ

صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اِبْلِیْسَ یَضَعُ عَرْشَہٗ عَلَی الْمَاءِ ثُمَّ یَبْعَثُ سَرَایَاہُ یَفْتِنُوْنَ النَّاسَ فَاَدْنَاھُمْ مِنْہُ مَنْزِلَۃً اَعْظَمُھُمْ فِتْنَۃً یَجِیْءُ اَحَدُھُمْ وَیَقُوْلُ فَعَلْتُ کَذَا وَکَذَا فَیَقُوْلُ مَا صَنَعْتَ شَیْئًا قَالَ ثُمَّ یَجِیْءُ اَحَدُھُمْ فَیَقُوْلُ مَا تَرَکْتُہٗ حَتّٰی فَرَّقْتُ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ اِمْرَأَتِہٖ قَالَ فَیُدْنِیْہِ مِنْہُ وَیَقُوْلُ نِعْمَ اَنْتَ قَالَ الْاَعْمَشُ اُرَاہُ قَالَ فَیَلْتَزِمُہٗ۔

(رواہ مسلم)

حوالہ: مسلم شریف:۲/۳۷۶، باب تحریش الشیطان الخ، کتاب صفات المنافقین، رقم الحدیث: ۲۸۱۳، عالمی حدیث نمبر ۱۷۔

حل لغات: یضع، وضع شیئاً، (ف) بچھانا، عرش، تخت شاہی، تخت سلطنت، ج عُرُوش، السریۃُ، فوجی دستہ، فوج کی ایک ٹکڑی، ج سرایا، فَتِنَہٗ بشیءٍ او فیہ کسی چیز سے آزمانا۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ ابلیس اپنا تخت پانی پر رکھتا ہے، پھر وہاں سے اپنی فوجوں کو روانہ کرتا ہے تا کہ وہ لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کریں، اس کی فوجوں میں اس کے نزدیک سب سے زیادہ قابل اکرام وہ ہے جو سب سے بڑا فتنہ پرور ہو، ان میں سے ایک آکر کہتا ہے کہ میں نے فلاں فلاں کام کئے، ابلیس کہتا ہے ''تو نے کچھ نہیں کیا'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ''ان میں سے ایک آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں ایک شخص کے پیچھے لگ گیا اور اس کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی نہ ڈلوادی'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ''ابلیس اس کو قریب بٹھالیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو نے اچھا کام کیا اور تو بہت اچھا ہے'' اعمش کہتے ہیں کہ ''میرا خیال ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ابلیس اس کو چمٹالیتا ہے۔''

تشریح: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ بے شک شیطان اپنے تخت کو پانی پر رکھتا ہے چونکہ یہ شیطان نقالی کرتا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی کہ اللہ تعالیٰ کا تخت پانی پر تھا، "و کانه عرشه علی الماء" تو یہ بھی نقالی کرتا ہے کہ اچھا ہم بھی اپنا تخت پانی پر بچھائیں گے۔ اور پانی پر تخت کا ہونا اور پھر نہ ڈوبنا یہ اس زمانہ میں سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کیونکہ آج تو جہاز پانی پر چلتے ہیں کشتیاں پانی پر چلتی ہیں وہ بھی تو تخت کی ہی ہوتی ہیں اسلئے ممکن ہے کہ اس نے بھی لکڑی کا تخت بنوالیا ہو۔ اور لکڑی کا خاصہ بھیگنے کا ہے بھی نہیں۔

اور تخت پر بیٹھ کر "ثم یبعث سرایاہ" بھیجتا ہے جماعتیں بنا کر۔

سرایا جمع ہے سریۃ کی سری یسری. رات میں چلنا۔

ایک ایک گروہ بھیجتا ہے۔ اور سب آ کر اپنے اپنے اعمال شمار کراتے ہیں۔ اور وہ سب کو داد دیتا ہے کسی کو کہتا ہے کہ تو نے کچھ نہیں کیا۔ تو نے بھی کچھ نہیں کیا اور ایک کو اپنے گلے سے لگالیتا ہے۔

فادناھم اعظمھم فتنۃ: ادنی اسم تفضیل کا صیغہ ہے یعنی سب سے زیادہ قریب اور سب سے زائد مقرب اس کے نزدیک وہ ہے جو فتنہ کے اعتبار سے سب سے زیادہ بڑا اور سب سے زائد فسادی ہو وہ اس کو اپنا مقرب بنالیتا ہے۔

سب آ کر بتاتے ہیں میں نے سر پھڑائی کرادی۔ میں نے گاڑی الٹوادی۔ میں نے یہ فساد کیا اور فلاں جگہ آگ لگوادی۔ لیکن یہ کہتا ہے کہ تم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ کچھ بھی نہیں کیا۔ مگر ایک آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے میاں بیوی کے درمیان لڑائی کرادی۔ عورت سے ذرا نمک زائد ڈلوادیا اور اس نے چکھ کر بھی نہیں دیکھا۔ شوہر آیا اور کہا یہ کیا کیا؟ بیوی غصہ ہوئی کہ صبح سے شام تک تو بچوں میں لگی رہتی ہوں یہ پریشان کرتے رہتے ہیں۔ اور شوہر کہتا ہے کہ میں یوں کام کر کے آیا ہوں یوں کیا اور یوں کیا۔ بس دونوں میں لڑائی ہوتی ہے شوہر غصہ میں ایک دو تین کہتا ہے اور بس معاملہ صاف۔ پھر فتویٰ پوچھتے پھرتے ہیں۔

پس شیطان کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے قریب کر لیتا ہے اور اس کو گلے سے چمٹا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو نے کیا ہے کام تو۔ یہ کام اچھا ہے ایسا کام کرنا چاہئے۔
اس حدیث شریف میں اعمش رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک راوی ہیں وہ کہتے ہیں کہ مجھے خیال ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یوں بھی فرمایا ہے کہ وہ اس چیلے کو گلے سے چمٹا لیتا ہے۔

شیطان کو میاں بیوی کے درمیان تفریق پسند ہونے کی وجہ

چونکہ شیطان کو میاں بیوی کے درمیان تفریق وجدائی بہت زیادہ پسند ہے۔ اور یہ اس وجہ سے کہ طلاق بائن یا مغلظہ ہو جاتی ہے، اگر دونوں میں علیحدگی ہوگئی تو دونوں خاندانوں میں لڑائی جھگڑے تباہی بربادی غیبت چغل خوری کے سلسلے شروع ہو جاتے ہیں، پھر دونوں آپس میں یا دوسروں کے ساتھ حرام کاری میں مبتلا ہوتے ہیں اور حرام کاری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، یا طلاق مغلظہ ہو جانے کے باوجود دونوں آپس میں اسی طرح رہتے ہیں اور حرام کاری ہوتی رہتی ہے، اور زنا کی اولاد کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اور شیطان زنا کو اور اولاد زنا کے غلبہ کو پسند کرتا ہے تاکہ وہ زمین میں فساد مچائیں اور حدودِ شرع کو توڑ ڈالیں اسی وجہ سے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے "لایدخل الجنة ولد زانية" کہ زانیہ کی اولاد جنت میں داخل نہیں ہوگی اسلئے کہ ولد الزنا پر بھلائیوں اور اچھی عادات اور نیکیوں کا حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے اور بری عادتیں اس کیلئے آسان ہوتی ہیں۔ (مرقاۃ: ۱۴۱/۱، باب الوسوسة)
جو شئی اللہ تعالیٰ کے نزدیک جتنی البغض ہے وہ شیطان کے نزدیک اتنی ہی محبوب ہے طلاق ابغض المباحات ہے، مگر شیطان اس کو اتنا ہی پسند کرتا ہے۔

میاں بیوی کا چوکنا رہنا

فائدہ: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کے خطرات اور وساوس سے چوکنا رہنا

چاہئے اور میاں بیوی کو بہت ہی احتیاط سے رہنا چاہئے۔ شیطان گھروں میں گھستا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح میاں بیوی میں بدگمانی پیدا ہو جائے، اور پھر لڑائی ہو کر دونوں میں جدائی ہو جائے اور گناہوں کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

اشکال مع جواب

یہاں اشکال یہ ہوتا ہے کہ اس حدیث کو باب الوسوسۃ میں کیوں لائے؟ بظاہر اس باب سے اس کا کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا، اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان یہاں زوجین کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف وسوسے ڈالتا ہے تا کہ ایک دوسرے سے بدگمانی پیدا ہو جائے اور دونوں میں لڑائی ہو جائے اس طرح اس حدیث کو باب الوسوسہ سے تعلق ہو گیا۔

شیطان مایوس ہو گیا

﴿۲۶﴾ وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ اَيِسَ مِنْ اَنْ يَّعْبُدَهُ الْمُصَلُّوْنَ فِي جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ وَلٰكِنْ فِي التَّحْرِيْشِ بَيْنَهُمْ۔ (رواه مسلم)

حوالہ: مسلم شریف:۲/۳۷۶، باب تحریش الشیطان، کتاب صفات المنافقین الخ، رقم الحدیث: ۲۸۱۲.

حل لغات: اَيِسَ اَيساً من شيءٍ (س) مایوس ہونا، مصلون مصلی کی جمع ہے نمازی، التحریش تفعیل سے فتنہ پر ابھارنا فساد برپا کرنا۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''شیطان اس بات سے تو مایوس ہو گیا کہ مسلمان ''جزیرۃ العرب'' میں

اس کی پرستش کریں گے، لیکن وہ ان کے درمیان فساد پھیلانے سے مایوس نہیں ہوا ہے۔

تشریح: جزیرہ: اس ٹاپو کو کہا جاتا ہے جس کے چاروں طرف پانی ہو۔

جزیرہ نما: اس کو کہا جاتا ہے جس کا کوئی ایک کنارہ پانی سے ملا ہوا ہو۔

عــرب: کے معنی ظہور کے ہیں، چونکہ زمین کا یہ خطہ سب سے پہلے ظاہر ہوا تھا اس لئے غالباً اس کو عرب کہتے ہیں۔ اور یا اس وجہ سے کہ یہ جگہ دنیا میں سب سے اونچی ہے اس لئے اس کو عرب کہتے ہیں یا اس وجہ سے کہ اس کی زبان عربی ہے اور یہ بڑے بڑے مضمون کو دو جملوں میں ادا کردیتے ہیں۔ مثلاً **"ولکم فی القصاص حیوۃ یا اولی الالباب"** یہ جملہ ہے تمام فصحاء کو اکٹھا کیا اور صرف اس پر دو موٹی موٹی جلدیں لکھی گئیں ہیں اور سب کا اتفاق ہے کہ اس جیسا بلیغ کلام کوئی نہیں کہہ سکتا۔ عربی میں حروف کے مخارج علیحدہ صفات علیحدہ ہیں دوسری زبانوں میں ان مخارج وصفات کا نام تک نہیں، تمام منہ کو استعمال کیا۔ حلق کے بھی حصہ کئے ہونٹوں کے بھی اور دانتوں کے بھی اور دوسری زبانوں میں حروف صرف منہ کے درمیان سے نکلتے ہیں اس لئے اس کو عرب کہتے ہیں۔

المصلون[۱] بول کر **المسلمون** کا ارادہ کیا گیا ہے چونکہ صلوۃ مدار اسلام ہے اس لئے صلوۃ بول کر اسلام مراد لیا ہے۔

---

[۱] **قولہ من ان یعبدہ المصلون:** شراح کے کلام میں انحصار کرتے ہوئے قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ شیطان کی عبادت یہ بتوں کی عبادت ہے اس لئے کہ وہ اس کا حکم دیتا ہے اور بتوں کی عبادت ہی کی دعوت ہے باری تعالیٰ کا فرمان ہے۔ **یاابت لا تعبد الشیطان.**

اور مصلین سے مومنین مراد ہیں جیسا کہ فرمانِ نبی علیہ الصلوۃ والسلام میں ہیں۔ **نهیتکم عن قتل المصلین:** یہاں مصلین سے مومنین مراد ہیں اور اسی وصف کو ذکر اسلئے کیا چونکہ نماز تمام اعمال میں اشرف ہے اور ان افعال میں جو ایمان پر دلالت کرتے ہیں سب سے زیادہ اظہر ہے اور حدیث شریف کے معنی یہ ہونگے کہ کوئی مومن اسلام سے پھر کر بتوں کی عبادت میں لگ جائے اور ان کی پرستش کرے اس سے شیطان مایوس ہو چکا ہے۔

(مرقاۃ: ۱/۱۴۱، باب الوسوسۃ)

کہ جزیرۃ العرب میں مسلمان لوگ اس شیطان کو نہیں پوجیں گے۔

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرۂ عرب کی ضمانت دی ہے معلوم ہوا کہ دوسرے ملکوں میں مسلمان شیطان کی عبادت کر سکتے ہیں۔

اور اب شیطان بھی روتا پھرتا ہے عرفات کے اندر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے اختیار ہنسی آ گئی لوگوں نے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ شیطان لوگوں کا اس قدر رجوم دیکھ کر چلاتا ہوا جا رہا ہے سر پر خاک ڈال رہا ہے اور سوکھ کر گرگٹ کی طرح سے ہو گیا ہے اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف جزیرۃ العرب کی ضمانت دی[۱] ہے کہ وہاں مسلمان شیطان کی عبادت نہیں کریں گے۔ دوسرے ملکوں میں کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہندوستان کے اندر کوئی قبروں کو سجدہ کر رہا ہے کوئی کسی مزار پر چڑھاوا چڑھا رہا ہے اور قبروں پر خوب کپڑے وغیرہ ڈال رکھے ہیں حالانکہ محلّہ کے غریبوں کے پاس کپڑے وغیرہ کچھ نہیں ہیں، وہاں تو چراغاں ہو رہا ہے اور غریب پڑوسی کے پاس تیل کے واسطے پیسے بھی نہیں ہیں۔

اہل عرب کی نظر کتاب اللہ پر ہوتی ہے، یا سنت رسول اللہ پر۔ وہ تو شرک کو گھسنے ہی نہیں دیتے۔ وہاں کے سپاہی اگر کسی کے تعویذ بندھا ہوا بھی دیکھ لیں تو اس کو اتار کر پھینک دیتے ہیں اور کہتے ہیں: **افی بیت اللہ شرک باللہ؟** کہ اللہ تعالیٰ کے حرم میں غیر کو شریک کرتے ہو۔

---

[۱] **فی جزیرۃ العرب:** اور اعتراض وارد نہیں کیا جا سکتا مسیلمہ کذاب کے ارتداد اور مانعین زکوۃ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ارتداد کے پھیلنے سے اس لئے کہ انہوں نے بتوں کی عبادت نہیں کی۔

اشکال: شیطان کی دعوت تو عام ہے اقسامِ کفر کی جانب اس کی دعوت بتوں کی عبادت کے ساتھ خاص نہیں ہے؟

جواب: مصلین سے مراد وہ نمازی اور عبادت گذار ہیں جو اللہ اور شیطان کی عبادت کو جمع نہیں کرتے جیسا کہ یہود ونصاریٰ کر چکے ہیں۔ (**مرقاۃ: ۱/۱۴۱، باب الوسوسۃ**)

ایک صاحب مناجات پڑھ رہے ہیں تو اس کو توڑ کر پھینک دیا۔ وہ تو شرک کو جانتے ہی نہیں۔ کسی زمانہ میں وہاں کتنا شرک ہوا کرتا تھا۔ مگر وہ سرزمین اس سے کس طرح پاک ہوئی ہے۔ یہ حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مبارک اور ساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔

قولہ ان یعبدہ المصلون الخ: شراح حدیث نے اس کے تین معنی بیان کئے ہیں۔

(۱)...... دین اسلام سے مرتد ہونا مراد ہے، اس پر اشکال ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات پر بہت سے لوگ مرتد ہو گئے، اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں یہ نہیں کہا گیا کہ لوگ مرتد نہیں ہونگے، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ اسلام کی قوت وشوکت دیکھ کر شیطان ارتداد سے مایوس ہو گیا ہے، کسی وجہ سے کچھ لوگوں کا مرتد ہو جانا اس کی مایوسی کے منافی نہیں۔

(۲)...... اس سے مراد بت پرستی ہے، یعنی جزیرۂ عرب میں بت پرستی سے مایوس ہو گیا ہے، اور واقعۃً اسلام آنے کے بعد جزیرۂ عرب میں بت پرستی کبھی نہیں ہوئی اور آج بھی وہ حضرات عملی طور پر کتنے ہی کمزور ہوں، مگر بت پرستی کی بو سے بھی ان حضرات کو سخت نفرت ہے۔

(۳)...... شیطان کی عبادت سے مراد جاہلیت کا دور دورہ ہے، یعنی شیطان اس سے مایوس ہو چکا ہے کہ یہاں دور جاہلیت کبھی نہیں آئے گا، کہ دور جاہلیت میں گمراہی ہی گمراہی تھی، ہدایت معدوم یا بالکل مغلوب تھی، اب ایسا دور بھی نہیں آئے گا۔

ولکن فی التحریش ای ولکن لم یأس فی التحریش: یعنی [لڑائیوں یا لڑائی کرانے میں نا امید نہیں ہوا]

تحریش: کے معنی اصل میں جانوروں کو لڑانے کے آتے ہیں۔ اور جب انسان لڑتا

ہے تو وہ بھی جانور ہی ہو جاتا ہے بلکہ جانور سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

شیطان اس سے نا امید نہیں ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عرب والے غیر کی عبادت اور غیر کو شریک تو نہیں کر سکتے ہیں مگر لڑائی جھگڑے آپس میں کریں گے۔

اسلئے کہ شیطان لوگوں کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور ہر قوم کے پیچھے پڑا رہتا ہے جو کام اس سے ہو سکتا ہے اسی کے کرنے کو کہتا ہے عرب سے شرک نہیں کروا سکتا۔ البتہ وہ ان کو لڑوا سکتا ہے۔

﴿الفصل الثانی﴾

خالص وسوسہ خطرہ کی علامت نہیں

﴿۶۷﴾ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ اِنِّي اُحَدِّثُ نَفْسِي بِالشَّيْءِ[1] لَاَنْ اَكُوْنَ حُمَمَةً اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اَتَكَلَّمَ بِهِ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ رَدَّ اَمْرَهُ اِلَى الْوَسْوَسَةِ۔ (رواہ ابوداؤد)

حوالہ: ابوداؤد شریف: ۲/۶۹۶، باب فی رد الوسوسۃ، کتاب الادب، رقم الحدیث: ۵۱۱۲.

حل لغات: حُمَمَةٌ وَحُمَمٌ، کوئلہ، راکھ، آگ سے جلی ہوئی ہر شئی، رَدَّ شیئا (ن) روکنا، واپس کرنا۔

---

[1] بالشیٔ: یہ نکرہ کی قوت میں ہے معنی کے اعتبار سے اگرچہ لفظ کے اعتبار سے معرفہ ہے اور اس کا قول لان اکون حممۃ مبتدا ہوگا اور احب الی من ان تکلم بہ اس کی خبر ہوگی اور جملہ اسمیہ ہو کر الشیٔ کی صفت ہو جائیگی۔ (الطیبی: ۱/۲۲۶، باب الوسوسۃ)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک صحابی نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں اپنے اندر ایسے خیالات پاتا ہوں کہ جن کو ذکر کرنے سے بہتر میں جل کر کوئلہ بن جانا سمجھتا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے اس خیال کو وسوسے کی حد تک رکھا"۔

تشریح: لان اکون میں ان مصدریہ ہے تو معنی اس کے ہوئے لکونی حممة [کہ میرا کوئلہ ہو جانا مجھے زیادہ پسند ہے اس سے کہ میں اس بات کو زبان پر لاؤں]

ان پر قبض طاری تھا، ماہر حاذق حکیم نے جب دیکھا تو ایک جملہ میں اس کو صاف کر دیا۔

جیسے ایک صاحب تھے انہیں خیال ہوا کہ میں شیطان ہو گیا ایک شخص سے بیان کیا اس نے کہا "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" اس سے اسے اور تائید ہو گئی، کہ لاحول تو شیطان پر ہی پڑھا جاتا ہے اس لئے میں شیطان ہوں۔ مگر جب وہ حضرت کی خدمت میں آیا اور کہا کہ حضرت میں شیطان ہو گیا ہوں۔ آپ نے فرمایا کب سے اس نے کہا اتنے دنوں سے فرمایا کہ نماز پڑھتے ہو کہ جی ہاں آپ نے فرمایا کہ شیطان نے تو جب سے شیطان ہوا ہے ایک دن بھی نماز نہیں پڑھی یہ کہنا تھا اور قبض فوراً ختم۔

ایسے ہی حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور بیان کیا کہ ایسے ایسے وساوس آتے ہیں جن کو زبان پر لانا پسند نہیں کرتا۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صرف اتنا فرمایا: الحمد للہ[1] اسکا آدھا قبض ٹوٹ گیا "رد امرہ الی الوسوسة" الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ

---

[1] الحمد للہ الذی رد امرہ الی الوسوسة: اس میں احتمال ہے کہ ضمیر شیطان کی طرف راجع ہو اگرچہ اس کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن سیاق وسباق اس پر دلالت کرتا ہے اور احتمال اس بات کا بھی ہے کہ وہ راجع ہو رجل کی جانب اور الامر میں بھی احتمال ہے کہ وہ واو امر کا واحد ہو اور ممکن ہے کہ الامر شان کے معنی میں ہو گویا کہ شیطان اس سے پہلے لوگوں کو کفر کا حکم کرتا تھا لیکن اب اس کو وسوسہ کے سوا کوئی راستہ نہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے اس طور پر کہ وہ برا ہے لیکن اس کا علاج اعوذ باللہ ہے یا معنی یہ ہے الحمد للہ الذی رد شان ھذا الرجل من الکفر الی الوسوسة۔
[یعنی تمام تعریفیں اس اللہ ہی کے لئے ہیں جس نے اس شخص کے معاملہ کو کفر سے ہٹا کر وسوسہ کی جانب پھیر دیا]
(مرقاۃ: ۱/۱۴۲، باب الوسوسة)

نے اس کو وسوسہ کی طرف لوٹا دیا یعنی وہ عمل بھی کرا سکتا تھا۔ پس اسے خیال ہوا کہ وساوس پر مواخذہ نہ ہوگا اس کا قبض ختم ہو گیا۔

فائدہ: اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وساوس آنے سے کچھ نقصان نہیں اور یہ نہ ایمان کے منافی ہے، اور نہ کمال ایمان کے منافی، اور وساوس کاملین کو بھی پیش آتے ہیں، اس لئے ان سے پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ فقط

اچھے برے خیالات اور ان کا حکم

﴿۶۸﴾ وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ لِلشَّيْطَانِ لَمَّةً بِابْنِ آدَمَ وَلِلْمَلَكِ لَمَّةً فَأَمَّا لَمَّةُ الشَّيْطَانِ فَإِيْعَادٌ بِالشَّرِّ وَتَكْذِيْبٌ بِالْحَقِّ وَأَمَّا لَمَّةُ الْمَلَكِ فَإِيْعَادٌ بِالْخَيْرِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْحَقِّ فَمَنْ وَجَدَ ذٰلِكَ فَلْيَعْلَمْ أَنَّهُ مِنَ اللّٰهِ، فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ وَمَنْ وَجَدَ الْأُخْرٰى فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ثُمَّ قَرَأَ "اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ" (رواه الترمذی) وقال "هذا حديث غريب"

حوالہ: ترمذی شریف: ۲/۱۲۸، سورۂ بقرہ، تفسیر القرآن، رقم الحدیث: ۲۹۸۸۔

حل لغات: اللَمَّةُ، اثر، جناتی اثر، شیطانی وسوسہ، ج لمامٌ، ایعاد مصدر، اوعد فلاناً، افعال سے دھمکی دینا۔

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہر انسان پر ایک تصرف شیطان کا ہے اور ایک تصرف فرشتہ کا ہے شیطان کا تصرف تو یہ ہے کہ وہ برائی پر ابھارتا ہے اور حق کو جھٹلاتا ہے، جبکہ فرشتہ کا تصرف یہ

ہے کہ وہ خیر پر ابھارتا ہے، حق بات کی تصدیق کرتا ہے، تو جو شخص یہ کیفیت اپنے اندر پائے تو سمجھ لے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، اور جو شخص دوسری چیز پائے، تو یہ شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے، پھر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: [شیطان تمہیں ڈراتا ہے اور برائی پر ابھارتا ہے] ترمذی نے اس کو روایت کیا ہے، اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: لِـمَّـۃ، لُمَّـۃ، لَمَّـۃ: تینوں حرکتوں کے ساتھ ہے جس کے معنی آتے ہیں اترنے کے۔لمۃ اترنے والا۔

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ انسان پر ایک اتار شیطان کا ہوتا ہے اور ایک فرشتہ کا۔

لمۂ شیطان: تو انسان کو شر سے ڈراتا ہے اور حق کی تکذیب کراتا ہے جیسے امتحان کا اعلان آیا کہ کھانا بند ہو جائیگا مگر وہ تکذیب کراتا ہے کہ کسی کا کھانا وانا بند نہیں ہوتا۔ چھ سات سال سے تو ہم دیکھ رہے ہیں تو یہ حق کی تکذیب کراتا ہے۔

لمۂ ملک: انسان کو حق سے ڈراتا ہے کہ دیکھو پڑھو پڑھنا چاہئے اگر پڑھو گے تو اپنے ساتھیوں سے بڑھ جاؤ گے اور حق کی تصدیق کراتا ہے کہ دیکھو مدرسہ والے اگر چہ اعلان پر عمل نہیں کرتے لیکن اگر عمل کریں گے تو پھر کیا ہوگا۔تو اللہ تعالیٰ کے نظام پر عمل کرتے ہیں۔

جو شخص اپنے نفس میں لمۂ ملک کو پاوے تو وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرے اور جب لمۂ شیطان کو پاوے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگے۔

دیکھو یہاں لف ونشر غیر مرتب ہے چونکہ اس سے جدت پیدا ہو جاتی ہے اور اوقع فی النفس ہوتی ہے یہاں لمۂ شیطان کی ترتیب بدل کر یہ جدت پیدا کردی۔

ومن وجد الاخری: سے لمۂ شیطان کو تعبیر کیا کہ اس کا زبان پر لانا بھی ٹھیک نہیں

ہے اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بطور استشہاد اس آیت کریمہ کو پڑھا "الشیطان یعدکم الفقر ویأمرکم بالفحشاء" [کہ شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور فحش باتوں کا حکم کرتا ہے]

اور جو شخص لمۂ شیطان کو پائے تو وہ "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" پڑھے اور اس کی جانب مخالف کو اختیار کرے اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہے اور شیطان تو صرف ایک مسخر غلام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بوقت افراد انسان پر مسلط ہونے کی قدرت عطا کی ہے جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے "ان عبادی لیس لک علیھم سلطان" [واقعی میرے ان بندوں پر تیرا ذرا بھی بس نہ چلے گا] (بیان القرآن)۔ (مرقاۃ: ۱/۱۴۲، باب الوسوسۃ)

امام غزالی علیہ الرحمہ نے منہاج العابدین میں بیان کیا ہے اور مشائخ کا اس پر اتفاق ہے کہ جس کا رزق حرام ہو وہ وسوسہ اور الہام کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا بلکہ ابو علی دقاق علیہ الرحمہ نے یہاں تک کہا ہے کہ جس کی روزی اس طور پر معلوم و مشہور ہو کہ اس نے اللہ تعالیٰ پر توکل نہیں کیا جیسا کہ توکل کرنا چاہیے تو وہ بھی فرق نہیں کر سکتا۔ (مرقاۃ: ۱/۱۴۲، باب الوسوسۃ)

خیالات مشتبہ ہونے کے اسباب

خیالات کے مشتبہ ہونے کے چار اسباب ہیں اول یقین کا کمزور ہونا دوسرے نفس کی صفات اور اس کے اخلاق کی معرفت میں علم کا کم ہونا تیسرے تقویٰ کی بنیاد کو توڑ کر خواہشات کی پیروی کرنا چوتھے حب جاہ اور حب مال اور لوگوں میں رفعت و مرتبت کی جستجو کرنا۔ جو شخص ان چاروں سے محفوظ رہا وہ لمۂ شیطان اور لمۂ ملک کے درمیان فرق کر لے گا اور جو ان کے اندر ملوث ہو گیا ہو وہ فرق نہیں کر سکے گا۔ (الطیبی: ۱/۲۲۸، باب الوسوسۃ)

لمۂ شیطان کا نام وسوسہ ہے اس کا ورود شیطان کے واسطے سے ہوتا ہے اور لمۂ ملک کا نام الہام ہے اور یہ فرشتے کے واسطے سے ہوتا ہے۔(مرقاۃ:۱/۱۴۲، باب الوسوسۃ)

وعدہ اور وعید میں فرق

افادہ: وعدہ اور وعید دونوں کا مشتق منہ ایک ہے دونوں میں فرق یہ ہے کہ وعدہ کا استعمال خیر کے ساتھ خاص ہے اور وعید کا استعمال شر کے ساتھ خاص ہے۔(الطیبی:۱/۲۲۷، باب الوسوسۃ)

مخلوق کے خالق اللہ تعالیٰ ہیں

﴿۶۹﴾ وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَایَزَالُ النَّاسُ یَتَسَاءَلُوْنَ حَتّٰى یُقَالَ هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ فَاِذَا قَالُوْا ذٰلِكَ فَقُوْلُوْا اللّٰهُ اَحَدٌ اللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ثُمَّ لِیَتْفُلْ عَنْ یَسَارِهٖ ثَلَاثًا وَلْیَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ، رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ، وَسَنَذْكُرُ حَدِیْثَ عَمْرِو بْنِ الْاَحْوَصِ فی باب خطبة یوم النحر ان شاء اللّٰه تعالیٰ۔

حوالہ: ابوداؤدشریف:۲/۶۴۹، باب فی الجهمية، كتاب السنة، رقم الحديث:۴۷۲۲.

حل لغات: لیتفل امر غائب، تَفَلَ، (ن،ض) تفلاً، تھوکنا، یسار، بائیں جانب، ج یُسُرٌ ویُسْرٌ.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’’لوگ ایک دوسرے سے سوال کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ کہا جائیگا کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا، تو اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا؟ جب لوگ اس طرح کی بات کریں تو تم لوگ کہنا کہ [اللہ تعالیٰ ایک ہے، اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، اللہ تعالیٰ نے نہ تو کسی کو جنا ہے، اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے، اور اس کا ہمسر کوئی نہیں ہے] پھر اپنے بائیں جانب تین بار تھوکنا، اور شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنا‘‘ ابوداؤد نے اس حدیث کو نقل کیا ہے، ہم ’’عمرو بن احوص‘‘ کی حدیث خطبۂ یوم النحر کے باب میں نقل کریں گے۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

تشریح: **یتساءلون:** باب تفاعل سے ہے اس کو **یَتَسَاءلون** معروف اور **یُتَساءلون** مجہول دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں۔

لایزال فعل ناقص ہے **الناس** اسکا فاعل یعنی اسم ہے اور **یتساءلون** اس کی خبر ہے۔

تزال میں خود نفی رکھی ہوئی ہوتی ہے اور لا کے ذریعہ اور نفی ہوگئی یعنی نفی کی نفی اور یہ مستلزم ہے اثبات کو پس ترجمہ اس کا یہ ہوا کہ لوگ ہمیشہ سوال کرتے رہیں گے یا سوال کئے جاتے رہیں گے آپس میں یعنی باہم یکدیگر سوالات چلتے رہیں گے کوئی کچھ پوچھے گا کوئی کچھ۔ یہاں تک کہ بے تکے سوالات بھی کرنے لگیں گے۔

ھذا اور **ھذہ** میں ھا برائے تنبیہ یعنی کان صاف کرنے کے لئے آتی ہے۔ ہماری زبان میں اس کا ترجمہ: دیکھو، سنو، ہوتا ہے۔

ذا. اسم اشارہ ہے متکلم اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے کہ میری طرف توجہ کرو اور میری بات کو سنو۔

خلق اللّٰہ الخلق: اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا ٹھیک ہے نا۔ اچھا اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا۔ کیونکہ جتنی چیزیں موجود ہیں سب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور جو شئ

موجود ہوتی ہے اس کے لئے موجد ہوتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کا موجد کون ہے جب یہ سوال کیا جائے یا خیال آئے تو تم کہو کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور بے نیاز کو با نیاز سے تشبیہ نہیں دے سکتے۔ بے نیاز کا کوئی موجد نہیں ہوتا۔ اس سے تسلسل لازم آتا ہے اور یہ ناجائز و باطل ہے اللہ تعالیٰ کی شان "لم یلد ولم یولد" ہے یعنی نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا اور جو ایسی ذات ہو اس کو موجد کی ضرورت نہیں ہے ایسی ذات کو جو ولادت سے پیدا کرنے اور پیدا کئے جانے سے بری ہے اس کو دوسری چیزوں پر قیاس نہیں کر سکتے۔[1]

واجب تعالیٰ کو ممکن پر قیاس کرنا درست نہیں۔ تو جب یہ خیالات آئیں تو تم شیطان کے منہ پر تھوک تھتکار دو، تھوکنے سے اگرچہ اس کو زیادہ چوٹ تو نہیں لگتی۔ مگر تھتکار کر دیکھو ذرا اور شیطان بائیں جانب سے آتا ہے ایک تو اس وجہ سے کہ یہ الٹا ہے۔ اسی لئے وہ اس طرف سے آتا ہے اور یا اس وجہ سے کہ ایمان کی تجوری (دل) بائیں جانب ہے اسی لئے وہ اس کی طرف آتا ہے تاکہ چوری کر لے۔

ثم لیتفل: چاہئے کہ وہ اسے تھتکار دے اور پھر اس کے ڈنڈا رسید کر دے اور ڈنڈا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہے یہ طریق کار ہے کہ اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرو اور یہی معاملہ ان لوگوں کے ساتھ کرو جو شیطان بن گئے ہیں ایسے سوالات کیا کرتے ہیں۔

---

[1] علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں تینوں صفات اس بات پر متنبہ کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق قرار دینا درست نہیں ہوا (احد) تو اس کے معنی یہ ہیں احد وہ ذات ہے جس کا کوئی ثانی اور مثل نہ ہو نہ ذات میں نہ صفات میں اور جب اس کو مخلوق قرار دیا جائے تب وہ واحد ہی نہیں رہے گا مطلقاً، اسلئے اس کا خالق ہونا احدیت کے زیادہ لائق ہے۔

الصمد: وہ آقا جس سے لوگ اپنی ضرورتوں اور معاملوں میں رجوع کرتے ہیں تو خالق ہونے کے زیادہ لائق ہے۔

لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفوا احد: یہ آیتیں حجت ہیں کہ اس کا ہمسر اور اس کی برابری کا کوئی نہیں اور ولد جو اس سے الوہیت میں کم ہو تو وہ بدرجہ اولیٰ اس سے نہیں بڑھ سکے گا کچھ بھی۔ (الطیبی: ۲۲۹/۱، باب الوسوسة)

اللہ تعالیٰ کی ذات میں سوالات؟ اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف خود کی ہے: "**هو الله الذی لا اله الا هو علم الغيب و الشهادة هو الرحمٰن الرحيم. الله لا اله الا هو الحی القيوم لا تأخذه سنة و لا نوم.**"

اور منطقیوں سے اور ان لنگوٹی والوں سے پوچھو کہ **هو واجب الوجود** اور یہ متکلمین بھی تو اس بحث میں پڑ گئے کہ **لا عين ولا غير** اس کی صفات کے بارے میں بھلا ہمارا منہ اور اس کی صفات، ہمیں خود معلوم نہیں کہ ہم کیا ہیں فلاں حافظ ہے ارے یہ حافظ عین ہے یا غیر؟

ہمیں صرف اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ اللہ ہے اس کی تعریف اس کی صفات ایسی ہیں اب ہیں کیا؟ وہ کچھ معلوم نہیں ہے۔

ایک صاحب کے چار بچے ہیں یہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن ان کو اس طرح شمار کریں فلاں لڑکی ایسی سفید ہے اس کے دانت ایسے ہیں اور گال ایسے تو ظاہر ہے کہ اس کے دھول لگے گا کس نے کہا اندر کی بات بیان کرنیکو؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کو اندر سے بیان کرنیکی کیا وجہ ہے ان سب منطقیوں کو کیا ہوا ہے۔

﴿الفصل الثالث﴾

اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا؟

﴿۷۰﴾ وَعَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالىٰ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَنْ يَّبْرَحَ النَّاسُ يَتَسَاءَلُوْنَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا هٰذَا اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ عَزَّوَ جَلَّ۔ (رَوَاهُ الْبُخَارِي) وَلِمُسْلِمٍ قَالَ قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اِنَّ اُمَّتَكَ لَا يَزَالُوْنَ يَقُوْلُوْنَ مَا كَذَا مَا كَذَا حَتّٰى يَقُوْلُوْا هٰذَا اللّٰهُ

خَلَقَ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ۔

حواله: بخاری شریف:۲/۱۸۳،باب مایکره من کثرة السوال، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، حدیث نمبر:۷۲۹٦، مسلم شریف:۱/۷۹،باب بیان الوسوسة في الایمان، کتاب الایمان، رقم الحدیث: ۱۳٦ . عالمی حدیث نمبر:۷۷۔

ترجمه: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگ آپس میں سوال کرتے رہیں گے، حتی کہ لوگ یہ کہیں گے'' اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا فرمایا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کو کس نے پیدا کیا، بخاری نے اس کو روایت کیا، اور مسلم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لوگ یہ کہتے رہیں گے یہ کیا ہے، اور یہ کیسے ہوا ہے؟ پھر کہیں گے ان تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟

تشریح: حدیث بالا کا مضمون یہ بھی ہے۔

لن یبرح: یہ بھی فعل ناقص کا فعل مضارع ہے۔مابرح.

برح کے معنی ہٹ گیا، اور ما برح کے معنی نہیں ہٹا تو اس کے معنی میں نفی رکھی ہوتی ہے اور نفی کی نفی فائدہ دیتی ہے اثبات کا۔

لن یبرح کے معنی ہوئے نہیں ہٹ سکتا یہیں رہے گا لن سے نفی کی گئی ہے لن سے نفی کی مزید تاکید ہوجاتی ہے لن کی طبیعت میں تاکید رکھی ہوتی ہے۔

لن یبرح الناس: ہرگز نہ ہٹیں گے لوگ یعنی وہ ہمیشہ سوالات کرتے رہیں گے یا شیاطین ان سے سوالات کریں گے۔

هذا[1] کا ترجمہ کیجئے صاحب اللہ تعالیٰ نے سب چیزوں کو پیدا کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کو کس

---

[1] هذا الله: مبتدا خبر ہیں اور خلق کل شئی جملہ مستانفہ ہے یا حال ہے اور قد مقدر ہے اور عامل اسم اشارہ کے معنی اشیر ہیں یا هذا مبتدا اور الله عطف بیان اور خلق کل شئی ءہذا کی خبر ہے۔(مرقاة: ۱/۱۴۳، باب الوسوسة)

نے پیدا کیا۔ شیطان اس طرح انسان کے دل میں وسوسے ڈالتا ہے بخاری نے اس کو بیان کیا ہے اور مسلم نے اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا گویا یہ حدیث مسلم کے نزدیک قدسی ہے۔

حدیث قدسی وہ ہوتی ہے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو۔

لا یـزالـون: جمع ہے امت کے افراد کے اعتبار سے یعنی ہمیشہ لوگ سوالات کرتے رہیں گے یہ کیا یہ کیا۔ اسے کس نے پیدا کیا تو وہ یوں کہیں گے کہ سب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا۔ مقصود ان احادیث کا یہ ہے کہ لوگ واقف ہو جائیں کہ ایسے ایسے مراحل آئیں گے تو چاہئے کہ لوگ اس شیطانی وساوس سے ہوشیار رہیں کہ یہ شیطانی خیالات ہیں۔

نماز کے دوران شیطان شبہ ڈالتا ہے

﴿۱۷﴾ وَعَنْ عُثْمَانَ ابْنِ اَبِی الْعَاصِ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُولَ اللّٰہِ اِنَّ الشَّیْطَانَ قَدْ حَالَ بَیْنِی وَبَیْنَ صَلٰوتِی وَبَیْنَ قِرَاْتِی یَلْبِسُھَا عَلَیَّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاکَ شَیْطَانٌ یُقَالُ لَہٗ خِنْزَبٌ فَاِذَا اَحْسَسْتَہٗ فَتَعَوَّذْ بِاللّٰہِ وَاتْفُلْ مِنْہُ عَلٰی یَسَارِکَ ثَلاَثاً، فَفَعَلْتُ ذٰلِکَ فَاَذْھَبَہُ اللّٰہُ عَنِّی۔ (رواہ مسلم)

حـوالـہ: مسلم شریف: ۲/۲۲۴، بـاب التـعـوذ مـن شیـطـان الوسوسۃ فی الصلاۃ، کتاب السلام، رقم الحدیث: ۲۲۰۳.

حل لغات: حالَ، الامر وعلیہ (ن) حولاً، الشیء بین الشیئین حائل

ہونا، رکاوٹ بننا، یُلَبِّسھا، لَبَّسَ الامر علیہ (تفعیل) کسی پر کوئی بات مشتبہ ہو جانا، واضح نہ ہونا۔

ترجمہ: حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ "میرے اور میری نماز وقراءت کے درمیان شیطان حائل ہوتا ہے اور اُنمیں میرے اوپر شبہ ڈالتا ہے" آپ نے فرمایا: "یہ شیطان ہے، جسکو 'خنزب' کہا جاتا ہے، جب تم کو اسکا احساس ہو تو اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو، اور اپنے بائیں جانب تین مرتبہ تھتکار دو" حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ "میں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وسوسے کو دور کر دیا۔"

تشریح: حضرت عثمان ابن ابی العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ شیطان میرے اور میری نماز اور میری قراءت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور وسوسہ ڈالتا ہے۔

میں نماز کی نیت باندھتا ہوں اور یہ آکر وسوسہ ڈالتا ہے اور ایسے ہی قراءت میں حائل ہو جاتا ہے پڑھتا کچھ ہوں اور نکلوا تا کچھ ہے۔

اس میں تشابہ پیدا کر دیتا ہے یلبس[1] اس میں تشابہ پیدا کر دیتا ہے جیسے جب انسان کے دل میں افسردگی اور پراگندگی ہوتی ہے تو وہ بات کہتا کچھ ہے اور اس کی زبان سے نکلتا کچھ ہے تو معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کو قبض تھا اور قابض کے سامنے باسط کلام کیا جاتا ہے اور اگر قابض کے سامنے قبض کی باتیں بیان کریں تو وہ مزید افسردہ ہو جاتا ہے۔ ع

افسردہ دلے افسردہ کند انجمنے را

---

[1] یلبس علیّ تشدید کے ساتھ مبالغہ کے لئے (یعنی باب تفعیل سے) یا (باب ض سے) یعنی وہ میری نماز اور قراءت کو خلط ملط کر دیتا ہے اور مجھ کو ہر ایک کے بارے میں شک میں مبتلا کر دیتا ہے جملہ بیان ہے اس کے قول حال اور جو اس سے متصل ہے اس کا۔ (مرقاۃ: ۱/۱۴۴، باب الوسوسۃ)

آپ گئے کسی کے پاس کہ کچھ دل بہلائیں اور اس نے خود الٹا داستان غم شروع کر دی بتایئے کہ اس بیچارے کا کیا حال ہوگا۔

یہ تو ان مشائخ کا ہی کام ہے کہ ان کے پاس ہزاروں جاتے ہیں اور یہ سب کی تسلی کرتے ہیں اور انکے پاس تو حالت قبض ہی میں جاتے ہیں خوشی میں کون جاتا ہے حالانکہ ان پر خود ہزاروں طرح کا قبض ہوتا ہے مگر اس کو چھپا کر اور خوشی ظاہر کر کے دوسروں کی تسلی کرتے ہیں یہ نہیں کہ خود بھی منہ چڑھا کر بیٹھ جائیں کہ ہمیں خود اپنی ہی پڑی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا ذاک شیطان یقال له خنزب کہ یہ تو شیطان ہے اور اس کو خنزب کہا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شیطان کا نام بتلانے کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر آپ نے بتلا دیا تاکہ وہ جان لیں کہ آپ تو اسکے پورے خاندان سے واقف ہیں اور اس کو تسلی ہو جائے کہ یہ تو سب ہی کے پاس آتا ہے اور وسوسہ ڈالتا ہے تنہا تمہارا ہی یہ کام نہیں ہے۔

ع مرگ انبوہ جشنے دارد

"البلاء اذا عمت خفت" [بلا جب عام ہو جاتی ہے تو آسان ہو جاتی ہے]

اس کا علاج یہ ہے کہ جب تو اسے محسوس کرے تو اپنے دل میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ اور اس کو تھتکار دے بائیں جانب یہ حضرات عمل کرنے والے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس بلا کو مجھ سے دور کر دیا۔

نماز میں وسوسہ کی فکر نہ کرنا چاہیے

﴿۷۲﴾ وَعَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ اِنَّ رَجُلاً سَأَلَهُ فَقَالَ اِنِّی اَهِمُ فِی صَلٰوتِی فَیَکْثُرُ ذٰلِکَ عَلَیَّ فَقَالَ لَهُ امْضِ فِی صَلٰوتِکَ فَاِنَّهُ لَنْ یَذْهَبَ ذٰلِکَ

عَنْكَ حَتّٰى تَنْصَرِفَ وَاَنْتَ تَقُوْلُ مَا اَتْمَمْتُ صَلٰوتِیْ۔ (رواه مالك)

حوالہ: مؤطاامام مالک:۳۵/۱، باب العمل فی السہو، کتاب السہو۔

حل لغات: تنصرف، (انفعال) واحد مذکر حاضر مضارع، پھر جانا۔

ترجمہ: حضرت قاسم بن محمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ مجھے اپنی نماز میں وہم ہوتا رہتا ہے، اور یہ چیز میرے ساتھ بہت پیش آتی ہے انہوں نے فرمایا: ''تم اپنی نماز پوری کرو، اس وجہ سے کہ شیطان تم سے جب ہی دور ہوگا جب تم اپنی نماز پوری کرلو گے'' اور کہو گے کہ ''ہاں میں نے اپنی نماز پوری نہیں کی''۔

تشریح: ایک علاج کے بہت سے نسخے ہوتے ہیں اور صرف ایک نسخہ جان لینے سے حکیم صاحب نہیں بنجاتے۔

تو علاج ایک مرض کے مختلف ہوتے ہیں اس لئے اس حدیث میں بھی شیطانی وسوسہ کا دوسرا نسخہ بتلایا ہے۔

قاسم ابن محمد رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ: انی اھم الخ! اس کی اصل اوھم تھی تعلیل ہوکر اھم ہوگیا۔ اھم کے معنی ہیں اوسوس یعنی مجھے نماز میں وسوسے آتے ہیں اور اگر ایک دو ہوں تو پی جاؤں مگر یہ تو بہت آتے ہیں۔ تو مجھے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِمْضِ فِی صلوتک کہ تو اپنی نماز پوری کرلے یہ شیطان تو ہمیشہ وسوسہ ڈالتا رہیگا۔ یہ وسوسے ختم نہیں ہوں گے یہاں تک کہ تم ختم ہو جاؤ گے۔ تو یوں کہدو ما اتممت صلوتی میں نے تو اپنی نماز کو پڑھا نہیں۔

یہ وسوسہ ڈالتا ہے وضو نہیں کیا۔ کہدو کہ میں تو بغیر وضو کے ہی پڑھوں گا اگر وہ کہے کہ رکوع نہیں کیا تو کہدو کہ میں تو بغیر رکوع کے ہی پڑھوں گا تو ان وساوس کا ایک علاج یہ ہوا۔

تنبیہ: لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جبکہ نمازی کو یقین ہے کہ میں نماز ٹھیک پڑھ رہا ہوں نماز کے ارکان وافعال اور قراءت میں کوئی کوتاہی یا غلطی واقع نہیں ہورہی ہے اور اگر واقعی نماز میں کوتاہی واقع ہورہی ہے اور ارکان کی ادائیگی میں کوتاہی واقع ہورہی ہے اور اس کا احساس بھی ہورہا ہے تو اس غلطی کو دور کرنا اور نماز کی صحت ودرستی کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔(مظاہر حق جدید: ۱۳۱/۱، باب الوسوسۃ)

تـــم

الجزء الثانی بحمد اللّٰہ تعالی

و احسانہ و توفیقہ تعالی و بمنہ و کرمہ

و یلیہ الجزء الثالث اولہ باب الایمان بالقدر

انشاء اللّٰہ تعالی ربنا تقبل منا انک انت السمیع

العلیم و تب علینا انک انت التواب الرحیم بحرمۃ

حبیبک سید المرسلین و صلی اللّٰہ تعالی

علیہ و علی آلہ و اصحابہ اجمعین

الی یوم الدین

محمد فاروق غفرلہ